

نور

انتظار میں



پندرو

ناول

انتظار گریم

سکب میل پ. بی کی کیشنز چوک از ده بازار - لاہور

ضابطہ

۱۹۸۶ —

تمداد — ایک ہزار

پبلشر — نیاز احمد

سنگ سیل ہل کیشنز، لاہور

پرنٹر — آر۔ آر پرنٹرز، لاہور

قیمت —

।

باسم بحثانہ کہ سب تعریفیں اسی کے لئے ہیں کہ جس نے ایک لفظ کو کہہ کر یہ کون و مکاں پیدا کئے اور نہ میں و آسمان بنائے اور کیا خوب بنائے کہ آسمان کے پھیلاؤ میں ستارے بھردیتے؛ زیج میں ان کے چاند سوچ رکھ دیتے؛ اور گود نہیں کی ندیوں ہڑوں مال قمیوں سے بھردی کر فیض سے ان کے باع۔ لغیچے بھولے اور کھیت لہلہاتے۔ باخوں کو رنگ رنگ کے پھلوں سے مال مال کیا کہ انہیں پھلوں میں وہ پھل بھی ہے۔ جسے آم کہتے ہیں اور جس کی ایک قسم صرف ہمارے جدی باع میں پالی جاتی تھی کہ جسے ایک دفعہ جو شخص حکم لیتا ذائقہ اس کا نہ بھوتا آمازمر تو نہ چاٹا رہتا۔ میوه جات مستزاد مثل بادام کشکش اتر و دنیز پستہ جس کی ہوا ٹوٹ سے فرنی کی طشتریوں پر بہار آتی ہے۔ کھیتوں کا دامن سبزی ترکاری سے بھردیا اور گندم موٹھہ مرچ جیسی اجنباس سے۔ انہیں کھیتوں کے زیج ایک ہستا ہوا کھیت زعفران کا کھلا یا کہ بربانی کی جان ہے، قویے کی آن ہے۔ تو ایسا عالم ظاہر کیا اور اس عالم کے زیج بھانست بھانست کا جانو را درنگ رنگ کی مخلوق پیدا کی کہ اسی میں انسان ضعیف البیان بھی ہے۔ بسیان تیری قدرت کہ تو نے اسی بودی بیاد والے جانو کو لشکر المخلوقات پہنچرا دیا۔ اس طیفہ غیبی پر عقل دنگ ہے، زبان دنگ ہے۔ سطف و کرم اس کے

کس زبان سے شکر ادا کیا جائے کہ اس خالق و جاہل مخلوق کی اصلاح کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر صحیح عزیزو، پیغمبر بھی کم صحیح کہ اس دوسری مخلوق کا ظلم زیادہ ہے جبکہ بے اندازہ ہے۔

انہیں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں ہمارے پیارے نبی رحمت اللعالمین خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں کہ آپ اور آپ کی آل اہلہار اور اصحاب کبار پر بعد درود و صلوٰۃ کے بندہ یہ سچدار مشائق علی ولد حکیم چراغ علی غایت اس تذکرے کی بیان کرتا ہے جو یوں ہے کہ ایک شبِ خواب میں آباجانی کو دیکھا کہ سامنے دھرے اور اپنی پریشان کو دیکھ کر پریشان ہیں اور افسوس کے ساتھ فرمایا ہے ہیں کہ بزرگوں نے اپنے وقت میں حق ادا کیا، ہم سے حق ادا نہ ہوا۔ لبکہ اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔ پہلے پریشان ہوا کہ یہ کیسا خواب تھا۔ بعد تماں کے اے حرفاً تمیہ ہے جانا۔ خود کو نظر میں کی کہ اے سگِ دنیا مشائق علی اللہ تعالیٰ تیرے حال پر رحم کرے۔ تو نے عمر بھو و لعب میں، سیر و شکار میں گذار دی۔ ہنوز تو عملائی دنیوی میں مبتلا ہے۔ ہر چند کہ سر تیرا چاندی ہو چکا ہے اور عمارتِ تن کی تیرے ہل چکی ہے پر حرص و طمع تجھے نہیں چھوڑتی۔ اے فافل اب جبکہ تو گور کنائے آن لگا ہے اور پتہ نہیں کہ پیکِ اجل کب پیام لے کر آجائے خوابِ غفلت سے جاگ اور اپنے فریضہ کو پہچان۔ جان لے کہ خواب میں آباجان کا آنا اور اپنی پریشان کو دیکھ کر افسوس کرنا تیرے لئے ایک اشارہ ہے۔

تب میں نے آباجانی کے بکھرے ورقِ کٹھے کئے اور دل پر دھریا کہ اس خاندانی تذکرے میں بعد کے خاندانی حالات اضافہ کر کے دنیز حالاتِ زمانہ قلمبند کر کے پائیہ تکمیل کو پہنچاؤں گا۔ بعد میں اخلاف اس میں اضافے کرتے رہیں گے۔ نیز طے کیا کہ یہ کامِ شتابی سے انجام دیا چاہیئے کہ ایک تو عمر کوتاہ ہے۔ دوسرے زمانہ پر آشوب ہے۔ تجھیزِ بیجا کا نقشہ ہے۔ طرابس میں برادرانِ اسلام پر قیامت گز رکھی۔ ترکی میں خلافت کا تختہ اٹھ گیا۔ امر تسری میں فوجیوں نے اپنی دیسی رعایا کو بجنونِ دالا۔ دم کے دم میں جلیا نوالہ باغِ مقفل بن گیا۔ دیارِ ہند کی خلقتِ تراہ تباہ پکار آئی۔ گاندھی جی نے ایسی سیفیہ گردہ کی کہ نگر نگر میں قیامتِ ائمہ کھڑی ہوئی۔ چوراچوری

میں تو ایسا ہوا کہ خلافتیوں اور کانگریسوں نے تھانے ہی کو پھونک دالا کہ نہ رہے گابانس نہ بجے گی بانسری، قصہ مختصر نہیر آسمان وہ ہوا اور ہو رہا ہے کہ جسم فلک نے کبھی کاہے کو دیکھا ہوگا۔ ابھی آگے دیکھئے کیا کیا ہوتا ہے۔ زمانہ بے اعتبار ہے۔ چرخ کج رفتار ہے۔ مگر ہی گھری رنگ بدلتا ہے۔ سُنگِ حادث سے ایسا تفرقہ پیدا کرتا ہے کہ دوست دشمن بن جاتے ہیں۔ ابھی چاہت میں مرے جا رہے تھے ابھی خون کے پیاسے ہیں۔ علی برادران کو دیکھو کل تک گاندھی جی سے داشت کاٹی روئی تھی تو من شدی میں تو شدم کا مضمون تھا۔ اسے اس مہاتما کی خاطر تو ان مولاناوں نے گوشت کا ناچھوڑ دیا تھا۔ بی اماں گوشت کی ہندیا پکانے سے گئیں۔ دال ترکا۔ یہ گھوٹ کے بیٹوں کو کھلانے لگیں۔ غصب خدا کا مسلمان گھر کا باودچی خانہ گوشت کی ہندیا کی مہک سے محروم ہو جائے۔ مگر اب گاندھی جی سے ان کی صُنی ہے۔ وہ مہاتما مینا ہے۔ یہ بھائی بھر بھر یا ہیں۔ مگر ہی میں رن میں گھری میں بن ہیں۔ کل مہاتما جی پر جان پھر ک رہے تھے۔ اب بے نقطہ نامہ ہے جس، آگ کے انگارے اگل رہے ہیں۔ ادھر ہندو مسلمان کے مرد ہے ہیں۔ ملسان مقتول بن گیا۔ مٹی اس دیار کی خون سے رنگین ہو گئی۔ برادر خورد اشتیاق علی بی اے نے بیان کیا کہ مسیح الملک حکیم اجل خان کو اتف معلوم کرنے کے لئے اس قریبے میں گئے۔ ایک کوچے سے گند ہوا تو کیا دیکھا کہ ایک بوڑھا ایک جدا چینکا پنجرا گود میں لئے جلے لمبہ پہ بیٹھی گری کرتی ہے۔ حکیم صاحب قبلہ نے احوال پوچھا تو اس نے رورو کے دہائی دی کہ ناس پیشلئے نے میرے گھر کو پھونکا سو پھونکا میرے مٹھو کو بھی نہ چھوڑا۔ پھر آگ میں جھونک دیا۔ پھر جلے پنجھرے کو دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر روانی۔ ادھر حکیم صاحب قبلہ بھی آپدیدہ ہو گئے۔

برادر خورد اشتیاق علی جوش جوانی میں تحریک خلافت میں شامل ہو گئے تھے۔ فقر نے انہیں بہت روکا تو کا کہا کیا کہ حاکم وقت سے سرکشی کرنے اور مصلحت نہیں اور جیس تو ان کے مقابل آتالیوں بھی بجلاء نہیں لگتا کہ اب ہمارے خاندان کا شمار ان کے وفاداروں میں

ہوتا ہے۔ آگے جو ہوا سو ہوا پر اب تو ہم برکاتِ ملکتِ انگلیس کے مرح خواں ہیں۔ یہوں نہ ہوں کہ راج میں ان کے شیر بکری ایک گھٹ پانی پیتے ہیں اور دیار و امصار میں ایسا ان چین ہے کہ جیا ہو تو کوچہ و بازار میں چاہو تو جگل دیرانے میں سونا اچھا لئے چلے جاؤ، مجال ہے کہ کوئی پوچھ لے کہ تمہارے صہ میں کتنے دانت ہیں اور ہمارے خاندان کا اقبال تو انہیں کے پیشہ کرم کا سر ہوں منت ہے۔ اس بے مقدرت کو انہوں نے خان بہادری کے خطاب سے نوازا اور آنری مبشریتی کے عہدہ جلیلہ پر فائز کیا کہ دادخواہ روز اس دیورِ محی پر حاضری دیتے ہیں اور انصاف لے کر جاتے ہیں۔ بدخواہ ہمیں بدنام کرتے ہیں کہ وطن عزیز سے غداری کے صلہ میں یہ مرتب کہیں ملے ہیں۔ حاصل تو ہمارے اقبال کو دیکھ مگر آتشِ حسر میں جلتے ہیں اور باتیں بناتے ہیں۔ واقعہ یوں ہے کہ فرنگی حاکموں نے ہمارے خاندان کے جرم بغاوت کو بخشن کر ہمارے دل خسیدہ لئے۔ یہی تواں فیتر نے میان اشتیاقِ علی سے کہا کہ برادرِ عزیز ہمارے ایک بزرگ نے سراٹھا یا متحا تو کتنے دنوں خاندان پر ادبار کی گھٹا چھافی رہی اور خطایک مرتبہ ہی معاف ہوتی ہے۔ روزِ روز تو کوئی بھی حاکم جرم سے چشم پوشی نہیں کرتا۔ مگر برادرِ عزیز کے خون میں گرمی کچھ زیادہ ہی تھی۔ ایک نہ سی۔ خاندان کی روایات نک علائی کو محو کر ماری اور علی برادران کے پچھے لگ لئے۔ مگر پچھے ان کے لگ کر کیا پایا۔ حاکم وقت کی نظر وہ سے بھی گرے اور جس منقصہ کے لئے یہ طور پر اتحا۔ وہ بھی حاصل نہ ہوا۔ جگ ہنسائی کے سوا کیا پایا۔ خلافتِ ہی کاتیا پانچاہو گیا اور خود اپنوں کے ہاتھوں بغازی مصطفیٰ کمال پاشانے اس کا خاتمہ بالخیز کر دیا۔ جب یہ خبر وحشت افسر ہماں پہنچی تو مت پوچھو کر اشتیاق میان پر کیا عالم گزرا۔ دھار میں مار مار کر روتے۔ لگتا تھا کہ خدا نخواستہ ہمارے گھر میں کوئی موت ہو گئی ہے۔ میں نے سمجھایا کہ برادرِ عزیز خلافتِ تواب جسہ بے روح تھی اور گھر میں میت کا زیادہ دیر رکھنا اچھا نہیں ہوتا۔ جنازہ نکل گیا، مناسب ہوا۔

علی برادران خلافت کے قبیلے سے فارغ ہوتے تو نجدیوں کے پچھے لگ لئے۔ ان بھائیوں

کو بھی کوئی نہ کوئی شغل چاہیے۔ جذبات کا ان کے یہاں دفتر ہے۔ ندی ہر دم چڑھی ہی۔ حتیٰ ہے۔ یہ بھائی لوگ ان کے بھترے ہیں آگئے کہ سر زمین عرب پر تھبہورہ عربیہ اسلامیہ قائم ہو گی۔ ان کے بندہ بے دام بن گئے۔ مگر ہوا کیا۔ ادھرا ہنہوں نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا، ادھر یہ بھائی مجیگے بتا شوں کی خرح بیٹھ گئے۔

تو یہ حال ہے مسلمانوں کا اور یہ چال ہے زمانے کی تباہی کے انبار میں۔ قیامت کے آثار میں۔ ایک واقعہ عجیب گزرا۔ سُدو کا بیٹا مدد و رات گئے زمینوں سے واپس آ رہا تھا۔ دردش برگردانِ لادی، ہر سنا یا کہ خان بہادر صاحب ہوا یوں کہ میں بیٹا بیٹا چدا آ رہا تھا کہ پچھے قدموں کی آہٹ ہوتی۔ ایسے لگا جی کہ جیسے کوئی جنابے ڈگ بھرتا ہوا پچھے آ رہا ہے۔ مژکر دیکھنے لگا تھا کہ ایک آدمی مانگیں یہ لمبی لمبی جیسے اوٹٹ کی ہوں، ہاتھ میں لمبا سالٹھ ملے ڈگ بھرتا برابر سے سن گزر گیا اور ادھر گزرا ادھر گزرا ادھر غائب۔ راقم الحروف نے یہ سن کر تماں کیا۔ پھر لوچھا کہ ارے مدد و رات نے اچھی طرح دریکھا بھی تھا۔ بولا، خان بہادر صاحب جی جو جھوٹ بولے سو کافر۔ آنکھوں دیکھی کہتا ہوں اور وہم تو میں نے کبھی کیا ہی نہیں۔ راتیں جنگلوں میں گزاری ہیں۔ کبھی جو وہم کیا ہو۔ میں نے پوچھا۔ وہ آدمی لگتا تھا نا۔ بوا، آدمی لگتا بھی تھا اور نہیں بھی لگتا تھا۔ میں نے کہا کہ ارے کم بخت، یہ تو نے کیا دیکھ دیا۔ کہیں دا بستہ الارض تو نمودار نہیں ہو گیا۔ نشانیاں تو کچھ اسی کی سی ہیں۔

یہ واقعہ سنتے کے بعد مجھے کئی دن تک تشویش رہی۔ مدد و رات کی پیشانی تو میں نے اسی گھر دی غور سے دیکھ لی تھی۔ بعد اس کے دوسروں کی پیشانیاں بھی غور سے دیکھیں۔ جب داغ کسی پیشانی پر دکھائی نہ دیا تو دل کو قدرے قرار آیا۔ پھر یہ سوچ کر اپنے دل کو کھجایا کہ دا بستہ الارض ہوتا تو اتنی دیر کہاں لگنی تھی۔ سب پیشانیاں اب تک داغدار ہوتیں اور دنیا زیر و نذر ہو چکی ہوتی۔ قیامت نامے سے رجوع کیا۔ وہاں سے بھی میرے خیال ان قصص کی تصلیق ہوتی۔ دا بستہ الارض یوں تھوڑا ہی نمودار ہو جائے گا۔ صفا کا پہاڑ حب شق ہو گا۔

تب اس کے بیچ سے برآمد ہو گا۔ سات جانوروں کی اس میں شاہقت ہو گی۔ ٹانکس اونٹ والی گردن پر ایال گھوڑے والے۔ یا تھے میں عصا۔ اس عصا کے ساتھ دروازوں پر دستک دے گا۔ وہ جو گھروں میں بند نیٹھے ہوں گے بدحواس ہو کر گھروں سے نکل پڑیں گے۔ دابتہ الارض ہر پیشافی کو عصا سے چھوئے گا۔ جس پیشافی کو چھوئے گا وہ داغدار نظر آئے گی۔ بعد اس کے قامت کو آیا سمجھو۔

جب تحقیق ہو گی اکر رات کے ہنگام کسی گھر پر دستک نہیں ہوتی ہے اور کسی پیشافی پر داغ نہیں ہے۔ تب یہ کوتاہ اندریش مطمئن ہو بیجا۔ مگر سوچتا ہوں کہ یہ امیناں آخر کب تک۔ قرب قیامت کے آثار ظاہر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ دابتہ الارض آج نہیں توکل نمودار ہو جلتے گا۔ ہماری پیشائیوں کو کسی نہ کسی دن داغدار ہوتا ہے۔ یہ عاصی پر معاصی آنے والے وقت سے ڈرتاہے اور توبہ واستغفار کرتا رہتا ہے کہ اسے پالنے والے پیشافی داغدار ہونے سے پہلے اس گنہگار کو اٹھالے۔

پنڈت گنگادت المخلص بہ مہجور آتے ہیں لواپنی کتحالے بیٹھتے ہیں۔ شری مشائق علی کلگی ہے کلگی۔ میں نے جل کر کہا کہ پنڈت یہ تمہارا کلگی تو ہماری چودھویں صدی سے بھی نیادہ طول پکڑ گیا۔ اس خر کب سے چل رہا ہے۔ یوں کہ جس سے شیش ناگ جی حضرت بلدریوجی کے منہ سے نکل گر سمدر میں اتر گئے اور حضرت سری کرشن ہمارا ج کا طاڑر وح نفس عصری سے پرواز کر گیا اور انہوں نے ماس دری چھوڑ دی بس اسی سے کلگ شروع ہو گیا۔ میں نے کہا کہ پنڈت یہ تمہارا کلگی ہے یا شیطان کی آنت ہے یوں بس شیطان کی آنت کا انت ہونے لگا ہے۔ پنڈت آخرہ انت کب ہو گا۔ مشائق علی جی، بس ایک یار چڑیے گا اور ادھک اتحل بچل ہو گی۔

جنگ عظیم جس میں سب نشت اور نابود ہو جائے گا۔ تباہیگ کا مجی تو ایسے ہی انت اور انعام ہوا تھا۔ کورکشیتر میں لتنا کشت دخون ہوا تھا۔ آخر میں کل ملا کرنو جنے بچے

تھے۔ تین کور و پانچ پانڈو اور ایک ہمارے حضرت کرشن مہاراج علیہ السلام۔ پندرت تباہی مہا بھارت تو جنگ عظیم سے بھی بڑھ گئی۔ واہ مشاق علی جی، جنگ عظیم بھی کوئی جنگ تھی۔ میں پوچھتا ہوں کہ تمہاری جنگ عظیم میں بر بہم بان کس کے پاس تھا۔ شری مشاق علی جی پتہ ہے۔ انت میں کیا ہوا۔ اس دشمن استوتحماں نے اپنا برہم بان نکالا اور ایک گھاس کی پتی میں اسے پھونک کر ارجمند مہاراج کی اور بھینکا۔ فخر شجاعان آریہ ورت ارجمند مہاراج نے بھی اپنا برہم بان جلا دیا۔ تب ویسا جی دشیوں میںوں کو سنگ لے کے ریچ میں آنکھرے ہوتے۔ چلانے کے پترو، بان واپس لے لو، نہیں تو۔ یہ سارا بہ بمانڈ جل کے خاکستر ہو جائے گا۔ مولا ارجمند نے تو ترنٹ بھی حضرت ویسا جی کے چڑن چھوٹے اور بان واپس لے لیا۔ پر دشمن استوتحماں حضرت کا کلام سن کر طرح دے گیا۔ بولا کہ بان واپس لینا میرے بس میں نہیں۔ مان سما اس کی بدل سکتا ہوں۔ اس شقی نے سمت بان کی اس طور بدلت کہ بان پانڈوؤں کی کوکھ پہ جا کے گرا۔ اثر سے اس کے پانڈوؤں کی ازواجِ مطہرات کے گر بجہ گر گئے، بچے پیٹ میں مر گئے۔

میں نے یہ قصہ مولانی سُن کر کہا کہ پندرت کور و پانڈو تو چشم و چراغ ایک ہی خاندان کے تھے کوئی بھوت ان پر سوار تھا کہ ایک دوسرے کا خون بہانے پہنچ لے گئے۔ کوئی انہیں سمجھانے والا نہ تھا۔ مہجور نے ٹھنڈا انس بھرا۔ کہنے لگا کہ یہی سوال جنمی جستے نے حضرت ویسا سے کیا تھا۔ ہواں کہ حضرت گھومتے پھرتے ایک دن دربار میں اس کے آن برا جے۔ جنمی جستے نے حضرت کے پرک پورا جل سے چاندی کے باس میں دھوئے پھر لیوں گویا ہوا کہ رشی مہاراج، میرے دادا پردادا تو بہت برصیمان تھے اور مجھ پر دونوں ہی طرف گئی گیانی برا جتے تھے۔ بڑے اچھے کی بات ہے کہ ان کی بد جمی میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ پڑے گا تو راجہ پر جا کا کتنا ناش ہو گا۔ حضرت افسر دہ ہو کر بولے کہ پُتر ترنے ملیک کہا پرایے سے آتے ہیں۔ برصیمانوں کی بھی مرت ماری جاتی

ہے اور ہونی ہو کر رہتی ہے۔

یہ کلام سُن کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ کہا کہ پنڈت مُحیٰ کہا تمہارے ویاس جی نے۔ آج کل بھی تو سی ہی احوال ہے۔ غور کا مقام ہے کہ مہاتما گاندھی مولانا شوکت علی کو اس نیست سے ہمراہ کوہاٹ لے گئے تھے کہ دونوں مل کر ہندو مسلمانوں کو محنڈا کریں۔ لے کر تو وہاں جا کر خود ہی آگ بگولا ہو گئے۔ دونوں میں بھن گئی۔ مجھے ان چیزکو دل کا انعام اچھا نظر نہیں آتا۔ پنڈت ان بدھیمانوں کو کچھ عقل سکھاؤ۔ کچھ سمجھاؤ۔

پنڈت گنگادت چپ ہو گئے۔ تامل کر کے بولے کہ مشتاق علی جی، حضرت سری کرشن مہاراج اور حضرت بھیشم پتامہ نے فریقین کو کتنا سمجھایا۔ کوئی سمجھا؟ حبیب ان سنتوں کا کہا کسی نے نہ مانا تو ہم تم کس کے محیت کی مولی ہیں۔ مشتاق علی جی، بس چپ ہی ہو رہو۔ یہ زمانہ بولنے کا نہیں ہے۔

المختصر یہی آشوبِ زمانہ دیکھ کر فقیر نے سوچا کہ آباجانی خواب میں بروقت آئے اذبک کہ ہر خیج رفتار ہے اور بے زمانہ بے شبات ہے، اسواں سے پہلے کہ زمانہ آنکھیں پھیرے اور رشتہ تھیات منقطع ہو جائے تو لمتحہ میں خامہ پکڑا اور بعد حمد و نعمت کے اور ساتھ درود و سلام کے جاری ہو۔ حالات خاندان و نیز حالاتِ زمانہ بے کم و کامت قلبپسند کر۔ مگر اختصار کو ملحوظ رکھ کر رسالہ مبانہ ہو جائے اور طبیعت پڑھنے والے کی ملوں نہ ہو۔ جاننا چاہیے کہ کلام میں طوالتِ خص کے نزدیک ایک عجیب ہے اور اہل ذوق کے لئے — باعثِ گرفتاری طبع اور — موجب ملال

— دنیز —

آگے کی عبارت باوجود کوشش کے پڑھی نہ جاسکی۔ کچھ درق بو سیدہ کچھ خطا شکرہ یہ پلندامیاں جان کا مخطوطہ تھا۔ یعنی میرے دادا مرحوم کا جنہیں خاندان میں سب چھوٹے بڑے میاں جان اور باہر لے خان مہادر صاحب کہتے تھے سوائے ان کے یار غار پر

گنگادت مجہور کے جوانہیں کبھی شری مشتاق علی اور کبھی مشتاق علی جی کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ بہر حال یہ حنفی طریقہ برآمد ہو کر میرے نے ایک اپنی خاصی آزمائش بن گیا۔ ایک تو ورق بے ترتیب تھے اور بہت بوسیدہ ہو گئے تھے۔ پھر میاں جان کا جناتی خط اُرد و بھی ایسی لکھی تھی کہ اس کا بھی میرے نے ذرا جنبی تھا۔ بہر حال تھوڑا پڑھنے کے بعد میری اس میں دلپیسی پیدا ہو گئی۔ سوچا کہ جب یہ ورق ہاتھ پڑھی گئے میں تو پڑھ کر دیکھنا تو چاہیے رہا میں لکھا کیا ہے۔ پتہ تو چلے کہ آخر اس خاندان میں ایسی کوئی صفت تھی کہ ہر سال میں کوئی بزرگ قلم دفاتر لے کر بیٹھ جاتا، وہ روایت جو جاتا۔ کس انہاں کے ساتھ خاندانی حالات قلمبند کرتا اور پچھلے تذکرے کے ساتھ شامل کر کے اولاد کے نئے ایک قیمتی شانے کے طور پر چھوڑ جاتا۔ آخر میرے دادا پر وادا مال و متاع چھوڑ کر بھی توجاتے ہیں۔ مگر وصیت ناموں میں صبی تاکید ان پیشہوں کے بارے میں ہے۔ اتنی جا مداد کے بارے میں نہیں ہے۔

مجھے خیال آیا کہ آخر میں بھی انہیں بزرگوں کا خون ہوں، میرے یہاں خاندان کا تذکرہ لکھنے کی خواہش کیوں نہیں پائی جاتی۔ میں نے اپنے والد کے یہاں بھی ایسی کوئی خواہش نہیں دیکھی۔ انہوں نے بس اسی قدر کیا کہ بزرگوں کے لکھنے ہوئے اور اراق کو ضائع نہیں ہونے دیا ویسے انہوں نے اس سلسلہ میں مجھے کوئی بدایت کوئی تاکید نہیں کی تھی۔ بلکہ میرے سامنے کبھی ان اور اراق کا ذکر بھی نہیں کیا۔ وہ تو یہ کہئے کہ نئے مکان میں منتقل کی تیاری میں سماں کا جائزہ لینے ہوئے مجھے خیال آگیا کہ والد مر جوم کے کاغذات کو ذرا کریلیا جائے کہ جو ضروری ہیں انہیں سنگھوا لیا جائے اور جوفا لتوہیں انہیں نہ کانے لگایا جائے۔ بس اس پھان پھٹک میں یہ سودہ نکل آیا جس کے ورق الگ الگ تھے اور بہت خستہ و بوسیدہ تھوڑے دن اور اسی طرح بند پڑے رہتے تو دیکھ کی غذا بن جاتے۔

میرے والد نے اگر تذکرہ نہیں لکھا تو اس کی وجہ تو سمجھدیں آگئی۔ میاں جان کے

بعد وہ جستے ہی کتنے دن۔ باپ کے جیتے جی انہیں یہ فریضہ ادا کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی۔ مگر میرے یہاں پر خواہش کیوں پیدا نہیں ہوتی۔ میں نے اپنے بڑوں کی آنکھیں دیکھیں اور ان کی آنکھ بند ہوتے بھی دیکھی۔ میاں جان کا جنازہ اٹھتے دیکھا۔ پھر والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھتے دیکھا۔ والد صاحب بس یہاں آتے ہی سدھا رکھے۔ جیسے اسی کام کے لئے انہوں نے ان پر آشوب دنوں میں ہجرت کی زحمت اٹھائی ہوا اور جیسے اسی خاطر اس نئی زمین نے انہیں بلا وابحیجا ہوا درہ آئے اور اُدھر گئے اور اُدھر تو والد گئے۔

اُدھر چھپا جان جنہوں نے علی گرمه میں ڈیرا کر لیا تھا مہینوں میں چٹ پٹ ہو گئے۔ اب ان بزرگوں کو گزندے ہوئے پورا ایک زمانہ ہو چکا تھا اور اب خود میں بندگ ہو چلا تھا یا یوں سمجھئے کہ بزرگوں کی موت نے مجھے بزرگ بنادیا تھا۔ مگر اس صورت میں بھی میرے یہاں خاندان کا تذکرہ لکھنے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی، حالانکہ ہجرت کے مل میں اس خاندان کو جیسے دن دیکھنے پڑے تھے ان کی وجہ سے وہ ایک تذکرے کا مستحق تو تھا۔

اگر اجداد کی وضع کے خلاف میرے یہاں خاندانی حالات قلمبند کرنے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی تو میری سمجھ میں اس کی وجہ سی آئی کہ میں ایک اکھڑا بھر ہدمی ہوں۔ وہ اٹھیسان جو میاں جان کو میسر تھا وہ مجھے کب میسر کیا۔ میاں جان کی زندگی میں تو ایک جماد تھا۔ پتھرا پنی جگہ پہ بھاری ہوتا ہے۔ پتھر سے زیادہ میاں جان بھاری تھے کہ کس اٹھیسان اور آسودگی کے ساتھ اپنی تھیک پر جتے بیٹھے رہے۔ شہر سے نکلا تو دور کی بات ہے، ڈیور ہی سے نکلنے کی کہی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ بس دو ایسے موقع آتے تھے جب چراغِ حولی سے قدم نکلتے تھے۔ ایک ساون بھادروں کے دنوں میں جب نوروز منانے کی نیت سے خاندانی تمام جام کے ساتھ باغ میں جا کر ڈیرا لگاتے۔ ایک اس وقت جب انگریز ہلکر ڈویسے پر یہاں آن وارد ہوتا۔ اس موقع

پر بپاکس اہتمام سے تانگہ جوتا۔ کیا چم چم کرتا تانگہ تھا اور کیا چم خم اس گھوڑے کے
تھے یا گھی تو پتہ نہیں کس زمانے سے کھٹ بجڑی گرد آلو د اندر اصطبل میں کھڑی تھی۔
اب تو اس تانگہ ہی کی بہادر تھی کہ حب میاں جان اسیں بیٹھ کر نکلتے تو راہ چلتے لوگ
حٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور اپنی اپنی شیک پر بیٹھے ہوتے دکاندار کھڑے ہو کر سلام
کرتے کہ ایک ایک کو پتہ ہوتا کہ خان بہادر صاحب انگریز بہادر سے ملاقات کے لئے
ڈاک بنگلہ جا رہے ہیں۔

باقی دنوں میں وہی ایک ٹور کہ صحیح مردانے میں بیٹھ کر عدالت لگانا۔
ڈاکنیری محشریت جوتے، روپہر ہوتے ہوتے عدالت ختم کر کے دسترنخوان پر بیٹھنا،
اس کے بعد قیلو لہ کے گرمی کے دن ہوتے تو دھوپ دھلنے تک خس کی ٹیکوں سے لیں
کمرے میں لمبی جھار والے پنکھے تلے آرام کرنا، شام پڑے پھر کاؤس سے شاداب صحن میں
برآمد ہونا اور گاٹی تکھے کے سہارے تخت پر بیٹھنا کہ ان کے آکر بیٹھتے ہی ملاقاتیوں
جی حضور یوں کاتانسا بندھ جاتا اور رات گئے تک بندھا رہتا۔ اسی ایک ٹور پر پودی
زندگی چرانغ حوالی میں گزار دی۔ وہیں پیدا ہوتے، وہیں سے جنازہ نکلا۔ اب ہم
پیدا کیا ہوتے ہیں، مرتے کہاں جا کر ہیں۔ نال کس کو متحری میں گرفتی ہے، جتنا تھا
کس ڈیورڈھی سے نکلتا ہے۔ آدمی اب ڈال سے ٹوٹا پتہ ہے کہ بوا اُسے اڑاتے
اڑاتے پھرتی ہے کہاں سے رولتی ہے کہاں جا کر ڈیورڈھی کرتی ہے۔

میاں جان چرانغ حوالی میں بیٹھے پھر کی مثال بھاری تھے۔ میں لگلی کاروڑا بن گیا۔
یہاں آگر کتنے مکان بد لے، کس کس محلہ میں جا کر رہا۔ ایک وہ لوگ تھے جنہوں نے شہر
میں وارد ہوتے ہی بلائکلف کسی متروکہ مکان کا تالا توڑا اور چم کر بیٹھ گئے۔ پسے پرانے
الائٹ کا پروانہ لے کر آتے، پوسیں کی کمک ساختلاتے مگر وہ اپنی جگہ جتے بیٹھے ہیں
نہ دھمکی دینے والوں سے مروعہ نہ سرکاری نوٹسوں کی پروا۔ لیس جس گھر میں برانج گئے

سورا ج گئے۔ ایک میں تھا کہ آج اس محلہ میں کل اس گلی میں بکتنے برسوں تک میں اس شہر میں گلی گلی رہتا پھرا۔

”بیٹے اخلاق، یہ تم نے ہمیں کہاں جنگل میں لا پھینک کا ہے۔ نگورڈی یاں پر تواذان کی آواز بھی کان میں نہیں پڑتی۔ چپ ہونا اور پھر شروع ہو جانا“ اسے میں تو پہلے بی کہتی تھی کہ کہاں کالے کوسوں جا رہے ہو۔ مگر تیرے باپ نے ایسا تھے اور پر کیا کہ میری خشل پر پتھر پڑ گئے۔ اے لو وہ تو یاں پر آتے ہی مختنڑے مختنڈے چلے گئے جیسے جنگل دیرانے میں چھوڑ گئے۔ یہ نگورڈی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ میں نے تو یاں پر کبھی کسی بجنت مارے پھیری والے کی بھی آواز نہیں سنی۔ لب سویرے سے شام پڑتے تک کوڑ کی کائیں کائیں سنے جاؤ۔ اہے میں تو یاں رہ کے خفتانی ہو جاؤ گی“

لو جان اپنی جگہ سمجھی تھیں۔ وہ نئی نئی چراغ حوالی سے نکل کر آئی تھیں۔ جہاں سویرے سے رات گئے تک اندر بابر کسی جہل پہل رہتی تھی کہ اندر زنانے میں بوجان کے ہاتھ میں سرو طہ مستقل چلتا رہتا اور باہر مردانے میں گلوکیوں کی تحالی مسلسل گردش میں رہتی اور یہاں شام ہوتی اور ہو کا عالم۔ دن میں بھی کونسا شور ہنگامہ ہوتا تھا۔ آخر کس تقریب سے ہوتا۔ آس پاس نہ مکان نہ دکان۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے چند ایک کوٹھیاں غرور تھیں مگر دور سے ہی لگتا تھا کہ چیزے ان میں کوئی رہتا نہیں۔ ان کوٹھیوں سے پرے ایک بو سیدہ سا پھاٹک نظر آتا تھا۔ جس کے سامنے گرمیوں کے دنوں میں صبح ہی صبح چار چھوڑی ٹھیکھے کھڑے نظر آتے اور ان پر لدی ہوئی برف کی سلیں۔ اصل میں یہ کوئی برف کا کارخانہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں

دور یہ ہے رخصت ہو جاتے۔ پھر سڑک سنان یہاں جتنا بھی سور تھا پرندوں کا تھا کہ دہل کھڑے گھنے درختوں پر دن بھر اترتے رہتے، بے چین ہو کر اٹھتے رہتے، سور کرتے رہتے کوئے سب سے بڑھ کر قضا پر چھائے نظر آتے۔ درخت بھی تو اس نواحی میں کافی تھے۔ کوئی توفاصلہ پر کوئی کوئی نظر آتی تھی۔ زیادہ تو درخت بھی نظر آتے تھے اور موسم کے ساتھ کس طرح بدلتے چلے جاتے تھے۔ کبھی ہر سے بھرے کبھی پیلے چھدرے۔ ایک وقت میں اتنے گھنے ہوتے کہ پتہ ہی نہ چلتا کہ ان کی شہنیوں کے نیچے پرنے والی پوری برا اُتری ہوئی ہے۔ پت جبڑ لگنے پر یہی درخت کتنے چھدرے ہوتے چلے جاتے۔ کوئی کوئی تو سارے پتوں سے نبات حاصل کر کے بالکل برسنہ ہو جاتا۔ لگتا کہ خشک ہو گیا۔ مگر بست رُت کے ساتھ جہاں اور درختوں پر نئے پتے آتے ان لند منڈ درختوں کو بھی نئی پوشک مل جاتی۔ پھر ویسے ہی ہر سے بھرے۔ پھر پرندوں کو لپنے چھپنے کے لئے گوشے میسر آجاتے۔ پھر نئے گھونسلوں کی داغیں پڑ جاتی۔ خود اس احاطہ میں جس میں میرا مکان تھا درخت اپنی خاصی تعداد میں تھے۔ ان میں ایک تو مولسری کا پیسیر تھا۔ جس پر جب موسم آتا تو فضای میں ہر وقت ایک ہیکلی مہک بسی رہتی اور ایک پیلی پوہبت پھیلا ہوا تھا۔ میرے لئے تو یہ دو پیشہ ہی بہت تھے۔ اسی لئے میں نے باٹی پیڑوں کو جانے پہنچانے کے لئے زیادہ تر دو نہیں کیا۔

اصل میں یہ میرا مکان ایک متروکہ کوئی ایسکی تھی۔ یہ کوئی اپنی سرخ انسوں والی دیواروں کی وجہ سے لال کوئی کھلانی تھی۔ کوئی پر گون فالبغش پے؟ یہ جانتے کی میں نے کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ وقتاً فوقتاً ایک بھاری پھر کم شخص ادھ میلے لباس میں سائیکل پر سوار نکلتا یا داخل ہوتا نظر آتا۔ تعارف اور غلیک سلیک کا تکلف نہ اس کی طرف سے ہوانہ میری طرف سے تعارف اس نے کرایا بھی تو اس اطلاع کے ساتھ کہ پوری کوئی اس کے نام الاٹ ہو گئی ہے۔ میں نے بات بڑھائے بغیر فوٹا

ہی کرایہ دار کی حیثیت منظور کر لی۔ خوش اسلوبی سے معاملہ طے ہوتے دیکھا ہے تو پھر اُس نے بھی کوئی تقاضا کوئی تحریر نہیں کی۔ مجھے کرایہ دار کی حیثیت میں کھلے دل کے ساتھ قبول کر لیا۔ پھر تمہور دے ہی دنوں بعد اس نے کوئی میں تالا دالا اور مجھے اپنا پتہ بتا کر ملتاں چلا گیا۔ جہاں اسے ایک پن بھلی الٹ ہو گئی تھی۔ اس کے پتہ نوٹ کرانے پر مجھے معلوم ہوا کہ اس کا نام برکت الہی ہے۔ میں برکت الہی کو یہت پابندی کے ساتھ ہمینے کے ہمینے منی آرڈر سے کرایہ بھیجتا رہا۔

شروع میں تو میں بھی یہاں اکھڑا اکھڑا رہا۔ میرے لئے بھی یہ فضلاً اتنی ہی اجنبی تھی۔ جتنا بوجان کے لئے۔ مگر یہاں کے گرد و نواح اپنے درختوں اور پرندوں کے ساتھ دھیرے دھیرے میرے اندر گھر کرتے چلے گئے۔ سویرے منہ اندر ہیرے جب میں میرے کے لئے نکلتا تو اس نواح کا اجزہ ابڑا پن دل کے کسی گوشے کو چھوٹا محسوس ہرتا۔ آثارِ قدیمہ تو اپنی قدامت اور ویرانی کے ساتھ ہم پر کس قسم کا اثر کرتے ہیں۔ جس قسم کا بھی کرتے ہوں۔ بہر حال وہ اثر ہوتا ہے۔ بہت واضح۔ یہاں ایسے اثر آثار نہیں تھے۔ جنہیں آثارِ قدیمہ کے ذیل میں شمار کیا جاسکے۔

ہم پر کس قسم کا اثر کرتے ہیں۔ جس قسم کا بھی کرتے ہوں بہر حال وہ اثر ہوتا ہے۔ بہت واضح۔ یہاں ایسے اثر آثار نہیں تھے۔ جنہیں آثارِ قدیمہ کے ذیل میں شمار کیا جاسکے۔ لے دے کے ایک لمبا چورا نشیب تھا۔ جس میں کہیں کہیں نانک شاہی اینٹ کی بنی کوئی سیڑھی ٹوٹی چھوٹی خاک دھول میں اُن کچھ ظاہر کچھ گم دھاتی پڑتی۔ ایک صبح میں اپنے ایک پن میں مگن اردو گرد پر نظر ڈالتا۔ لُجھے ہوتے منظر کو نظر کے اندر سیڑھا چلا جا رہتا کہ ایک اجنبی نیم کی مسوک کرتا میرے ساتھ لگ لیا۔ عصع کی سیر میں آدمی کے اندر ایک کشادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی بھی آس پاس ٹھلتے ہوتے آدمی سے بے جانے بوجھے پہلے علیک سلیک ہوتی ہے، پھر موسم پر ایکا دکا بات، پھر دنیا جہاں کی باتیں، اور

اتنی گھل مل کر جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ تو اس بجلے ناں نے بھی چلتے چلتے عدیک سلیک کی، تھوڑی دُور ساتھ ساتھ چلا اور پھر جانے کس بہانے بات مژو رع ہوئی اور ایسی مژو رع ہوئی گہر بایس تپوتی، ہی چلی گئیں۔ میں نے لبیں بھی اس احتجاج سوکھے نشیب کے بارے میں پچھے تجھس نظاہر کیا۔ وہ بولا "ایہہ سیتا کندھ بے جی؟"

"آہو جی۔ ایس پاسے سیتا مانی انسان کیا کرتی تھی؟"

"سیتا مانی؟ آپ کا مطلب سیتا جی سے ہے۔ سیتا جی۔ یہاں کہاں سے آگئیں؟"

"ایہی تو گھل ہے۔ ایس شہر کو تو ابی کے پُتر نے بسایا تھا اور جہاں پو تر دہاں

مادر"

اس روایت پر مجھے پوری طرح اعتبار تو نہیں آیا۔ مگر اس سے اس جگہ کے بارے میں تجھس اور بڑھ گیا۔ اب میں نے دل ہی دل میں سنجیدگی سے ٹھیک کیا کہ اس نواح کو ذرا لفظیل سے کھونڈنا چاہئے۔ سوچا کہ اتوار کی صبح فرصت کی صبح ہو گی کہ وہ چھپی ڈکا دن ہوتا ہے۔ لبیں اس روز پر دگر ام رہے گا۔ مگر اتوار کے آنے سے پہلے ہی ایسی بات ہو گئی کہ پھر میری توجہ بٹ گئی اور پھر مہاں سے میرا جی اچھٹ گیا۔ برکت الہی مultan سے اچانک آن د تھکا۔ "ابا جی میں ہمیں رہوں گا"

"اچھا؟"

"ہاں جی۔ یاں انار کلی میں مجھے ایک متروکہ دکان الٹ ہو گئی ہے"

"اوہ جو مultan میں پنچکی آپ کو الٹ ہوئی تھی اس کا کیا بنے گا؟"

"وہ بھی چلتی رہے گی۔ وہاں میں اپنا ایک کارندہ چھوڑ آیا ہوں۔"

"چلتے اچھا ہے آپ آگئے۔ اس کو بھی کی حالت بہت خرست ہو گئی تھی؟"

"لبیں جی اس جگہ کا بھی اب کچھ کرتا ہے۔ اردو گرد نظر دا لئے ہوتے ہوئے کہنے لگا۔"

چھار ڈجھنے کاڑ کھڑا ہے۔ سب صاف کرائے یہاں دکانیں بنوانے لگا ہوں۔ مجھے پتہ چلا
ہے کہ یہ جگہ کمرشیل ایر یا بننے والی ہے۔ اس وقت یہ دکانیں سونا الگینیں گی یہ
”مگر یہ جو درخت کھڑے ہیں“
”اُن سب کو کٹوادوں گا یہ“
”کیا؟۔۔۔ ان درختوں کو آپ کٹوادیں گے؟“ میں حیران و پریشان اس کامنہ
تکنے لگا۔

”ہاں اور کیا۔ جگہ بیکار کیوں پڑی رہے اور اتنی اچھی جگہ؟“
میں بہت گمراہا۔ مجھے قواراؤ ہی مولسری اور پیپل کا خیال آیا جن سے میں اتنا
مانوس ہو گیا تھا۔

”مگر یہ مولسری ہے؟“

”ہاں جی، اس مولسری نے بہت جگہ گھروکھی ہے۔“
میں پھر اس شخص کا منہ تکنے لگا۔

”مگر یہ پیپل تو بہت پرانا ہے۔“

”ہاں جی بہت پرانا ہو گیا ہے۔ اسے تو ویسے بھی کٹوادیا تھا۔ لب کل پرسوں
میں انتہا کرتا ہوں۔ جنگل بننا ہوا ہے۔ اسے سارے کو صاف کرایا دینا ہے۔“
”اتنی صلدی؟“ میں سخت گمراہا۔

”ہاں جی۔ میں جب فیصلہ کر لوں تو پھر دیر نہیں کیا کرتا۔ پر آپ مت گھرائیں
جی۔ ابھی میں عمارت کو ملے تھے نہیں لگا رہا۔ وہ بعد میں سوچوں گا۔ آپ بے فکر ہو
کے رہیں۔ ابھی میں آپ سے اُٹھنے کا لقاضا نہیں کر دیں گا۔“

”رہنیں، آپ کو تعاقبا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتے گی۔“ یہ کہہ کر میں تو چلا
آیا۔ وہ درختوں کا دیر تک جائزہ لیتا رہا۔

”اے بیٹے، یہ تم پر کیا نک سوار ہوئی ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ جہاں آکے بلیٹھ گئے
میں وہاں بلیٹھ رہیں۔ کہاں توا چولھا سر پر اٹھائے اٹھائے بھریں“
بوجان نے رفتہ رفتہ اس فضائے جسے وہ جنگل ویرانہ بتاتی تھیں سمجھوتہ کر لیا
تھا۔ مگر میں اکھڑ پکا تھا۔

”نہیں بوجان، اس گھر میں اب ہم نہیں رہیں گے۔ یہ برکت الہی بہت
بے برکت آدمی ہے“

”بیٹے!“ بوجان نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ برکت تو زمانے ہی سے اٹھ گئی۔ خیر نہیں
اس نحوست مارے سے کیا لینا ہے۔ ہم اپنے کونے میں سرچھپائے بیٹھے ہیں یہ
”بہر حال میں نے گھر کا نظام کر لیا ہے“

”اچھا جدیا تمہاری سمجھتی میں آئے۔ میں تو یہ سوچ کے کہہ رہی تھی کہ تمہیں بھی
بے آرامی ہو گی اور میری بھی ضعیفی ہے۔ سامان کون سمیٹے گا، کون دھونے گا؟“

”سب ہو جائے گا۔ بس آپ صبح اٹھ کر مجھے تباہی جائیں۔ میں سب

کروں گا“

”اے ہے ذرا تودم لیا ہوتا۔ ہبڑا بڑا کام اچھا نہیں ہوتا“

”بوجان، جب یہاں سے اٹھنا پڑ ہی گیا ہے تو دیر کیوں کی جائے؟“

”اے لڑکے تجھ پر کوئی سمجھوت سوار ہے؟“

”بس مجھ پر سمجھوت ہی سوار تھا۔ بوجان کو کیسے سمجھانا کہ سوریے صوریے آدمی
درخت کاٹنے کے لئے آن پہنچپی گے اور میں اس واردات سے پہلے پہلے یہاں سے

نکل جانا چاہتا ہوں۔ میں نے رات مشکل سے کافی۔ کہتی رات تک کروٹیں بدلتا رہا کہیں پہلے پھر میں جا کر آنکھ لگی۔ پھر مرغ کی بانگ کے ساتھ آنکھ کھل گئی۔ ایسے اٹھ کھڑا ہوا۔ جیسے سوراہی نہیں تھا۔ منہ پر پانی کے دو چھپا کے مارے اور آستینیں چڑھا کر پائیںچے اکس کر سامان باندھنا شروع کر دیا۔ سامان تھا ہی کتنا۔ یہ کوئی چراخ حوالی کا کھڑاک تھوڑا ہی تھا۔ کھڑک کا کھڑک گھر کے جنے کے ساتھ پھیلتا جاتا ہے۔ ابھی ہم یہاں آکر جے کہاں تھے۔ ابھی تو بس بنیادی ضرورت کی چیزیں جمع کی تھیں۔ وہ بھی پوری نہیں تھیں۔ بو جان نے کتنی مرتبہ مجھ سے تقاضا کیا تھا کہ بیٹھے اکڑوں بیٹھے کے مجھ سے کام نہیں ہوتا۔ بیٹھ جاتی ہوں تو اُحلاں نہیں جانا۔ مجھے ایک پنیری لا دوار چکلا بیلن کے لئے میں تم سے کب سے کبھی نہیں ہوں۔ وہ تو تمہیں بھنگتی چھٹے کے ساتھ ہی لے آتا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے ابھی تک نہ پنیری لا کر دی تھی اور نہ چکلا بیلن بس اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت ہمارا ٹانڈا ٹانڈا کتنا ہو گا۔ سورج نکلنے تک میں نے سارا سامان باندھ لیا تھا۔

پھر میں نے باہر لکل کر تازہ ہوا میں سانس لیا۔ صبح کی سیر آج موقف تھی۔ دل میں کہا کہ کم از کم اپنے ہمسایوں سے تو مل لو کہ آج ان کے ساتھ تمہاری آخری صبح ہے اور ان کی اپنی بھی آخری صبح ہے۔ ملا۔ میں افسرده تھا۔ ان کے منہ پر تو کوئی ملاں نہیں تھا۔ بلکہ سورج کی پہلی گرن کے چھو جانے سے کچھ مسکراتے بھی نظر آئے تھے۔ سب سے بڑھ کر پیپ اور مولسری دونوں اپنے اسی ہمیشہ کے وقار کے ساتھ کھڑے تھے۔ نہ خوش و خرم نہ آزدہ، بس خاموش تھے۔ خیراں وقت ہوا بھی تو ایسی نہیں چل رہی تھی۔ میں نے مولسری کے ہمکتے سائے میں کھڑے ہو کر ایک گھڑی سانس لیا۔ نہیں نہیں پھولوں کا جو اس سائے تلے اک بستر بچا ہوا تھا اس میں سے چند پھول چھوئے اور واپس اندر آگیا۔

بوجان ناز سے فراغت پا کر ناشتا بنانے میں معروف تھیں۔ جلدی جلدی ناشتا کیا۔

”اے بیٹا رات تم سوئے بھی تھے؟“

”کیوں بوجان نہ سونے کی کیا بات تھی؟“

”اے بیٹا جب میری آنکھ کھلی ہے تو تم سر پڑ کر رہے تھے؟“

”بوجان، آپ کی دیر میں آنکھ کھلی۔ میں مر گئے کی پہلی آواز کے ساتھ اُنھے بیٹھا تھا۔“

”ہاں شاید میری آنکھ آج دیر سے کھلی یا پھر تھوڑا کر“ اے بیٹا سامان تو تم نے

باندھ لیا۔ دھونے کا کیا بند دلپست کیا۔ اس کبار کو کیا سر پر رکھ کر لے جاؤ گے۔

”بوجان ہاں برف خانے کے سامنے دیر شے کھڑے رہتے ہیں۔ میں نے کل دوسرے دھوں

کے لئے بات کر لی ہے۔ برف کی باری بھگتا کر ادھر آئیں گے۔ بس آتے ہوں گے۔

”انگریزیں کہیں سامنے سے پکڑ لوں گا۔“

ناشہ جلدی جلدی کیا۔ پھر یہ سوچ کر دیڑھے والے کہیں بیٹھکتے نہ پھر رہے ہوں۔

میں باہر نکل گیا۔ درخت کاٹنے والے آدمی اپنی کلبہاریوں اور آہوں کے ساتھ آن پہنچے

تھے۔ برکت الہی نہیں مستعدی سے ہدایات دے رہا تھا۔

”دیکھنے برکت الہی صاحب، میں نے کل آپ کو بتا دیا تھا۔“

”کیا جی؟“ وہ میرے درخت اپنے سے تھوڑا اپٹا گیا تھا۔

”میں نے کل آپ سے کہا تھا کہ درخت ہمارے جانے کے بعد کہیں گے۔“

”ہاں جی۔ مگر آج تو آپ چلے جائیں گے۔ آپ نے کل یہی بتایا تھا۔“

”جی ہاں ہم آج ہی جا رہے ہیں اور ابھی جا رہے ہیں۔ مگر جب تک ہم یہاں سے

روختت نہ ہو جائیں کسی درخت پر کلبہارا نہیں چلے گا۔“

”بہت اچھا جی۔“ اور وہ نور انکلبہار سے والوں سے مخاطب ہوا ”اے بھئی دیکھو۔ پہلے

چائے شائے پی لو۔ اخلاق صاحب چلے جائیں۔ پھر کام شروع ہو گا۔“

کلبائڑے والوں نے مجھے تعجب سے دیکھا۔ دیکھتے ہی رہے اور میں جب وہاں سے ہٹ کر کوئی بھٹی کے گیٹ کی طرف جا رہا تھا تو برکتِ الہی کو میں نے دیکھا کہ کلبائڑے والوں سے کچھ دبی زبان میں کہہ رہا ہے۔ لیس مجھے ایک فقرہ سنائی دیا۔ ”یہ بالو کچھ نہ کہے۔“ ریڑھے آگئے تھے۔ ایک تانگہ بھی آن پہنچا تھا۔ ریڑھے والوں کو ساتھ ملا کر میں نے جلدی جلدی سامان ریڑھوں پر لادا۔ تانگہ کی بچھلی نشست پر لو جان کو آن کی پولیسوں اور بیغپر کے ساتھ سمجھا دیا۔ چند چیزوں میں نے ہاتھ میں تھائیں۔ والد صاحب کے کاغذات کا بستہ بغل میں دابا اور اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔

تانگہ چلنے لگا تو کلبائڑے والوں نے کتنے غور سے مجھے دیکھا۔ جب تانگہ کو بھٹی کے گیٹ سے نکل رہا تھا تو دفعتاً کلبائڑا چلنے کی آواز میرے کان میں آئی۔ کچھ گھرا کر ایک دم سے میں نے مڑ کر دیکھا۔ بد بختوں نے بسم اللہ مولسری سے کی بختی۔

مرکان سر منزلہ۔ اُپر سے نیچے تک کمرے ہی کمرے مگر ایسے کہ باشناست سے ناپ لو۔
صحن برائے نام کر اُپر سے دیکھو تو تگے کہ اندر حیرے کنوئیں میں جھانک رہے ہیں۔ بوجان
نے فوراً بوجھ لیا کہ مترو کہ مرکان ہے۔

”ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے گھروں کی لوگوں نے الامنشیں کراٹیں اور کتنے تھے
کہ تمہارے الامنشیوں والا ٹمنشیوں کے الجھیرے ہی میں نہیں پڑے۔ قبضے کر کر کے بیٹھ گئے
مگر ہمارے بیٹے کے دماغ میں تو ایسی رسمی گھسی ہوئی تھی کہ اس نے پرواہی نہیں کی۔
مترو کہ مرکان میں رہنے والا ایسا کو نہ ہے جو کرایہ ادا کرتا ہے۔ لیس ایک ہم ہی دنیا سے
نرالے ہیں؟“

مگر جب بوجان نے اڈوس پڑوس میں یہ نقشہ دیکھا کہ ایک ایک مترو کہ گھر میں تین
تین چار مہا بزرخاندان تھے ہوئے ہیں تو انہیں اس کے مقابلہ میں کرایہ دار بن کر
رہنے ہی میں عافیت نظر آنے لگی۔ لیس پھر انہیں اس مرکان سے ایک ہی شکایت باقی
رہ گئی کہ فارغ ہونے کے لئے انہیں اُپر تیسری منزل پر جانا پڑتا تھا روزہ صبح کو جب وہ
خالی لوٹے کے ساتھ آہستہ آہستہ سیر چیاں اُتر کر نیچے آئیں تو بڑا ایس ”بخت ماروں پر
یہ کیا خدا کی ستوار تھی کہ کھڈیاں آسمان پر جا کے بنائیں؟“ مگر اس مرکان میں اچھے پہلو انہوں نے
اتنے دریافت کر لئے تھے کہ یہ شکایت ان کے نیچے دب کر رہ گئی۔ یہ کیا کم بڑا فائدہ تھا کہ

پانچوں وقت اذان کی آواز گھر میئے سنائی دیتی اور یوں نماز کے وقت کا پہنچ چل جاتا۔ پھر قصائی کی دکان کتنی قریب تھی اور قصائی بھی کتنا اچھا تھا کہ خود ہی اچھی بولی والا گوشت بنائکر گھر پر دے جاتا۔

مگر ایک روز یوں ہوا کہ ایک ٹیکسی دروازے پر آگرہ کی اور ایک ادھیر عمر عورت برس مارٹھی مانتے پہ بندی اس سے اُتر کر ایک بچی کو انگلی پکڑ لئے اندراہی "میا ذرا گھر دیکھنا ہے"۔

بوجان نے ناخوشگواری سے جواب دیا کہ "بی بی تمہیں کسی نے غلط بتایا ہے۔ ہم تو ابھی اس گھر کو ہنسی چھوڑ دے پے"۔

"تمہیں میا، تم جگ جگ اس گھر میں رہو۔ ہمارا اب اس پر کیا ادھیکار ہے۔ میں تو اپنی لالی کو دکھانے لائی تھی۔ بورڈ کھلا تو میری موسیٰ کے پسترنے آکے کہا کہ دیری میں سچ دیکھنے تیرے لہو رجارت ہوں۔ میں نے کہا کہ لالہ مجھے بھی لے چل۔ میں بھی اپنا گھر دیکھ لوں گی۔ لالی کو بھی دکھا لاؤں گی۔ دیکھ تو لے کر میں نے اُسے کہا جنا تھا"۔

بوجان نے جبرت سے اُسے سر سے پیر تک درکھا۔ پھر گھر کا ایک ایک کوڑا سے دکھایا۔ "بی بی، اپنے سے پہلے کی تو میں بات کرتی تھیں۔ مگر جب سے میں آئی ہوں میں نے تمہاں سے گھر کو بہت سنبھال کر رکھا ہے۔ ہر برسات کے بعد صفائی کراتی ہوں۔ ذرا کوئی کونہ جھٹڑ جائے فوراً آدانع مژدور کو بلڈ کے مرمت کراتی ہوں"۔

کنے والی بی بی نے گھر کا تفصیل سے جائزہ لیا اور گھر کی صفائی سخراہی دیکھ کر تسلکر آمیز نظروں سے بوجان کو دیکھا۔ پھر ایک کوٹھری جیسے کرے میں لے جا کر بچی کو گھٹا کر دیا "لالی، یاں پہ تیری نال گڑی ہے"۔ لبس یہ کہتے کہتے اس کی آنکھ بھرا آئی۔ بچی کی انگلی پکڑ پلوسے آنکھ پوچھتی فوراً ہی باہر نکل آئی۔

"بی بی بیسمو۔ چائے پی کے جائیو"

”نامیا۔ اپنا مٹھا دیکھنا تھا وہ دیکھ لیا۔ تم راضی خوشی رہو۔“
یہ جاوہ جا۔

بوجان کئی دن چُپ چپ رہیں۔ بھر لوں۔ ”بیٹے، کوئی اور گھر تلاش کرو؟“
میں نے بوجان کو حیرت سے دیکھا۔ ”کیوں۔ اس گھر میں کیا خرابی پیدا ہو گئی؟“
”خرابی ہو یا نہ ہو۔ میں اب اس گھر میں نہیں رہوں گی۔“
”وجبہ؟“

”مجھے شک آؤے ہے ہا اور اب کے جو گھر کراٹے پہلو وہ متروکہ نہ ہو۔“
”وہ کیوں؟“

”میرے لال میں کچھ سوچ ہی کے کہہ رہی ہوں۔ کسی غریب کی آہ لینی اچھی بات
تو نہیں ہے۔“

بوجان اکھڑیں سوا اکھڑیں۔ مجھے اتنا سکتا یا کہ میں آخر کو نیچ ہو گیا۔ بھاگ دوڑ
کر کے ایک دوسرا مکان کراٹے پہلیا اور متروکہ مکان کو سلام کیا۔

”اس ڈوبے مولوی کو کیا ہو گیا ہے۔ نہ خود سوتا ہے نہ محلے والوں کو سونے
دیتا ہے۔“

بوجان کو آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ مسجد کی ہمسائیگی تباہ کی وجہ سے انہیں یہ
مکان اتنا پسند آیا تھا کیا معنی رکھتی ہے۔ مگر انہیں تعجب اس پر تھا کہ بیتے دنوں میں
تو مسجد کی ہمسائیگی گھر کے لئے رحمت کا سایہ بن جاتی تھی اور اس ہمسائیگی سے ایک
طانیت قلب حاصل ہوتی تھی۔ اب ایسا کیوں نہیں تھا۔ میری سمجھتے میں تویات آتی تھی۔

اس زمانے میں مسجدوں میں وعظ کم اور عبادت زیادہ ہوتی تھی۔ پھر اس زمانے میں لاڈ پسیکر کا بھی تو چلن نہیں تھا۔

”اللہ بنجتے مولوی سجنی ہماری مسجد میں اذان فریا کرتے تھے۔“ بوجان کو چراغ جو بیٹی کی ہمسایہ مسجد میاد آگئی۔ کیسا لمحن تھا ان کی آواز میں۔ جونماز سے پدر کا ہوا۔ وہ بھی ان کی اذان سُن لیتا تو مسجد کی طرف کھنچا چلا آیا اور کتنی اوپری آواز تھی ان کی۔ صبح کی اذان تو آس پاس کے گاؤں تک پہنچتی تھی یہ۔
”بوجان، وہ تو پھر لاڈ پسیکر کا کمال ہو گا۔“

”اے خاک پڑے تمہارے لاڈ پسیکر پ۔ ہماری مسجد میں یہ تمہارا نام جہاں نہیں تھا۔ مولوی سجنی تو اسے شیطانی آل کہتے تھے۔ کسی نے ایک دفعہ اس کا تام ان کے سامنے لے دیا تھا۔ غصے سے کاپنے لگے۔ بولے یہ شیطانی آل مسجد میں آیا تو میں اذان دینی بند کر دوں گا۔“

مگر اس محلے میں تو اس شیطانی آل کو کچھ زیادہ ہی رسوخ حاصل تھا۔ آئے دن یہاں شامیانے تنتہ رہتے۔ آج فلانے کی شادی ہے۔ مکن ڈھماکے کے ختنے ہیں اور شامیانہ اس طرح جتنا کہ گلی بند ہو جاتی۔ شامیانے کے ساتھ لاڈ پسیکر کہ اس زور پر فلمی گاؤں کے روکارڈ اتنا سورگرتے کہ بوجان عشاکی نماز کی خاطر گرے کے دروازے کھڑکیاں سب بند کر لیتیں۔ کس مشکل سے نماز ختم کرتیں۔ کتنی مرتبہ زیسح پھرستے پھیرتے گرڈرا جاتیں۔ جانماٹ پیٹتے ہوئے بڑا بڑا ایس کر کمپنتوں نے نماز پڑھنی دو بھر کر دی۔

بوجان تو بیزارہ تھیں ہی، میں بھی جلدی اس محلے سے بیزارہ ہو گیا۔ یہاں سے بھاگنے کے جتن کرتے لگا۔ اب مکانوں کے کرائے اپنے خاصے بڑھ گئے تھے مگر میں نے دل میں کہا کہ زیادہ کرایہ دینا منظور ہے۔ اس محلے میں رہنا منظور نہیں۔

مگر جو مکان زیادہ کرائے پہ لیا وہ نوئی علی نور تھا۔ جسیں گلی میں یہ مکان تھا اس کا

نقشہ عجب تھا۔ گلی کا گڑ مستقل ابتداء رہتا۔ کتنی دفعہ اس کی صفائی کرائی۔ مگر ہر دفعہ یہی ہوا کہ چار سو چھتے دن درست رہا۔ اس کے بعد پھر اُبلئے رگا۔ کبھی کبھی اتنا ابتداء کہ گلی میں ایک اچھی خاصی تیباں جاتی۔ تعفن اس پر مستزاد۔ ایک تعفن گڑ سے اُبلئے پانی کا، ایک تعفن کوڑے کے اس انبار کا جو پھیلتا بھی جا رہا تھا۔ بلند بھی ہوتا جا رہا تھا۔ کار پورشن کی کوڑا گاڑی ہمارے یہاں وار دیونے سے پہلے کبھی آئی ہو تو آئی ہو، جہادے آنے کے بعد تو وہ یہاں کبھی آتے دیکھی نہیں گئی۔

سوئے پر سہاگہ پڑوسن کے بچے کہ سویرے سویرے اس حال میں کہ آگا بھی کھلا ہے پہچا بھی کھلا ہے۔ گھر سے نکل کر نالی پر قطار بنایا کہ پیٹھ جاتے۔ پھر ایک بچہ اس لیکھائیت سے شاید بور ہو گیا یا شاید الفرادی حیثیت حاصل کرنے کے شوق میں پلٹن سے ٹوٹ کر اس نے ہمارے دروازے کے عین سامنے نالی پر پیٹھنا شروع کر دیا۔ بو جان نے ایک دن دیکھا ضبط کیا۔ دوسرے دن دیکھا ضبط کیا۔ جب دیکھا کر یہ تو روز کا معمول بن گیا تو ضبط کا یا رانہ رہا۔ پڑوسن کو دروازے پر کھڑا دیکھا تو باقی تین شروع کر دیں۔ کوئی یہاں کی بات کوئی وہاں کی بات۔ آخر کسی قدر تامل کے بعد ہرف شکایت زبان پر لائیں مگر اس طرح کراچی خاصی یہاں کوئی بھی کر دی۔ اسے کوئی جان کر تھوڑا ہی کرتے ہیں۔ آخر بچے ہی تو ہیں۔ اس عمر میں آگے پچھے پکا ہوش نہیں ہوتا یہ

پڑوسن نے بھی اپنی ٹرف سے بہت ضبط سے کامیا۔ ہجھ میں اک فرادر ہی پیدا ہوئی۔ بولی ”اے میا میرے بچے ایسے نہیں ہیں کہ تیری میری نالی میں گھٹے ہوتے پھر میں۔ کوئی اور ہو گا۔ محل میں آخر اور بچے بھی تو ہیں“۔

پڑوسن نے اس وقت تو اتنا ہی جواب دیا۔ مگر اسی دن دوپہر کو وہ سامنے کے گھر کی کھڑکی سے جانختی بی بی سے مخاطب تھی اور غصے میں بھری بلند آواز میں

کہہ رہی تھی۔ «بھلا میرے بچوں نے محلہ والوں کا کیا بگارا ہے کہ وہ ہا تھوڑے ہو کے ان کے سچے پڑھتے ہیں۔ مگر کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں غریب ہوں تو کسی سے دب جاؤں گی۔ کسی نے میرے بچوں کو ٹیڑھی آنکھ سے درکھا تو اس آنکھ میں تکلے بھونک دوں گی۔»
ان حالات میں ہمارا اس کوپے میں بسیرا کتنے دن رہ سکتا تھا۔

”ان کمخت گلیوں سے تو چیکار اٹلا“ بوجان نے نہ مگر کے گرد پیش کو دیکھ کر اطمینان کالیسا سانس لیا۔

یہ مکان لب سڑک تھا۔ سو گلیوں والی مصیبتیں یہاں نہیں تھیں۔ پڑوس بچوں بچوں والا نہیں تھا۔ دائیں تو ایک چھوٹی موٹی کوٹھی تھی۔ کم از کم فاصلہ سے تو کوٹھی ہی کا تائش دیتی تھی۔ بائیں ایک درکشاپ تھی۔ جس میں چند روکشاں چند سکوٹر مرمت کے لئے کھڑے ہتے تھے۔ اسی مرمت میں اس مرحلہ بھی آ جاتا کہ مستری رکشا کو آن کر کے چھوڑ دیتا۔ اس وقت کتنا شور ہوتا اور زیع بیچ میں پرانے سے چھوٹتے کبھی کبھی یہ عمل لمبا ہو جاتا۔ لگتا کہ مستری رکشا کو آن کر کے بھول گیا ہے۔ لب اس وقت بوجان تھوڑی پریشان ہوتیں۔ جب رکشار کرنے میں نہ آتی تو بالآخر ترپ اُٹھتیں۔ اُدے اس نجومت مارے مستری سے گھوکر کیوں تو ہمارے کانوں کا دشمن ہو گیا ہے۔ تیرے کان کے پر دے تو بچت گئے۔ مگر ہمارے تو ابھی سلامت ہیں۔

»شروع میں یہاں ایک درکشاپ تھی۔ زیادہ دن نہ گزدے تھے کہ اسی کے بغل میں ایک اور درکشاپ کھل گئی۔ پھر لوں نظر آنے لگا کہ شہر کی ساری کھنگڑی رکشاوں کا آخری ٹھکانا یہی درکشاس ہیں جو بچت کے نیچے کم اور کھلی سڑک

پر زیادہ پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کھڑاک کو یہاں پھیلتے دیکھ کر کسی نے کل پرزوں کی ایک دکان تک حوالی۔ پھر ایک ٹوٹا پھونٹا چائے خانہ کھل گیا جو رکشاڈ رائیوں کا مسٹرلوں کا، آس پاس گھومتے پھرتے نکھنوں کا مریع بن گیا۔

دھواں، ڈینزل کی بو، پختے ہوئے سائلنسرلوں کا سور، چائے خانے میں بجتے ہوئے فلمی ریکارڈوں کا ہنگامہ، کھٹ بگری رکشاڈوں کی قطاریں۔ دیکھتے دیکھتے اس علاقہ کی کسی کا پاکٹپ ہوتی اور سڑک جو شروع میں مجھے کشادہ نظر آتی تھی۔ اب کتنی تنگ دکھاتی پڑتی تھی۔

”بیٹے میں تو جانوں کر لال کوئی والی جگہ ہی اچھی تھی۔ خواہ منواہ وہ جگہ چھوڑی تم نے خود ہی چھوڑی۔ اس بچا رے نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ ارے درخت وہ کاٹ رپا تھا تو کانٹے دیتے۔ آخر وہ اسی کی جگہ تو بھتی اور وہ درخت ہمیں ایسے کونے پر میل دے رہے تھے“

بوجان بولتی رہیں۔ میں سنتا رہا۔ ویسے مجھے بھی اب محسوس ہونے لگا تھا کہ اس جگہ کو چھوڑ کر غلطی کی۔ وہاں سے نکل کر کتنے مکان بدلتے، کس کس گلی میں جا کر رہا۔ شہربیشک نہیں چھوڑا۔ مگر مکان تو بہت بدلتے پڑتے۔ جبب ایک مکان میں پہنچتے پچھلے برس گزد جاتے اور اس کے درود دیوار سے تھوڑی جان پھیان ہو جاتی تو مالک مکان زیادہ کرتے پر امتحانے کا خیال دل میں بازدھ کر سر پر آن کھڑا ہوتا کہ کرو مکان خالی۔ مالک مکان تقاضا نہ کرتا تو مکان کی حالت زارستان انشروع کر دیتی۔ تب خود ہی خیال آتا کہ یہاں سے اٹھ ہی جائیں تو اچھا کریں۔ مکان خستہ نہ ہوتا تو محلہ کی حالت خستہ ہوتی چلی جاتی اور پھر نئے ٹھکانے کی تلاش۔ جو گھر ملا پہلے سے خستہ ملا۔ جس محلہ میں جا کر رہا وہ پچھلے محلہ سے یہ ترثیات ہوا۔ اس کے ساتھ میرا حال بھی بدے بد تر ہوتا چلا گیا یا شاید اس شہر کا نقشہ ہی میری دس بدری کے ساتھ اب تر ہوتا چلا گیا۔

”بیٹے میری رائے تو یہی ہے کہ لال کو بھی والی جگہ ہی کو جا کے دیکھو۔ وہیں کہیں
گھر مل جائے تو اچھا ہے،“

میں نے بھی سوچا کہ واقعی سہنے کے لئے وہی جگہ مناسب تھی۔ میں خواہ مخواہ
جذباتی ہو گیا۔ درخت کٹت ہے تھے تو کہنے دیتا۔ آخر آدم بھی تو اتنا کٹ گیا اور کٹتا
ہی چلا جا رہا ہے۔ میں نے اس پر کب احتیاج کیا۔

تو میں مکان کی تلاش میں ایک مرتبہ پھر اس نواحی میں گیا۔ مگر میں تو دیاں جا
کر گڑ بڑا گیا۔ درود دیوار ہی بد لے ہوئے تھے۔ یہاں سے دیاں تک دکانیں ہی دکانیں
مال و اساباب دکانوں کے اندر بھرا ہوا۔ اندر سے زیادہ باہر چیلہ ہوا۔ سواریوں کی ریلیں پلیں۔ ریڑھے، رکھے
تائنگے، موڑیں۔ یہاں دکانیں زیادہ تر تعمیری سامان کی نظر آرہی تھیں۔ اسی وجہ سے
یہاں ریڑھوں کی بہتات تھی اور ان کی وجہ سے سڑک اتنی تگ ہو گئی تھی کہ سواری
میں سواری بھرٹی نظر آتی تھی۔

تحوڑا آگے بڑھا تو اور بھی بھیڑ بھر کا دکھائی پڑا۔ گوروں کے رد کئے ہوئے
کوٹ پتلون، سوئیٹر، مغلر، اور کوٹ، غرض ہر زنگ، ہر طرز کی اُترن دیڑھیوں پر
لہی ہوئی لوگ اس اُترن پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ خریداروں کی بھیڑ اتنی تھی کہ پچ پچ
کھوئے سے کھوا چکیں رہا تھا۔ کس مشکل سے میں اس بھیڑ کے پیچ سے گزرا۔

میں نے بہت اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ لال کو بھی یہاں کہاں تھی۔ کہیں اس
کے اثر انداز نظر نہ آئے۔ جیسے یہاں نہ کوئی لال کو بھی تھی نہ کوئی درخت نام کی چیز
تھی۔ میں لال کو بھی کے سامنے والی اس خاموش سڑک کو دھیان میں لایا جس پر درخت
دو رویہ درتک قطار باندھے دکھائی دیتے تھے۔ وہ سڑک تو معدوم نہیں ہو سکتی
اسے تو یہیں ہونا چاہیے۔ ضرور ہو گی۔ مگر میں اسے کسی صورت شناخت نہ کر سکا۔

میں حیران، میں کہاں آگیا ہوں، وہ شجر جمر کہاں کھو گئے، وہ شجر جمر، وہ کشادہ رستے
وہ پُروقار درودیوار۔

”بوجان، وہ جگہ تو اب بہت بدل گئی ہے؟“

”اے بیٹے، کتنی بدل گئی ہو گئی۔ جگہیں ایسے تو نہیں بدل کرتیں کہ بالکل ہی بدل
جائیں۔“

”مگر بوجان، وہ جگہ بالکل بدل گئی ہے؟“

”اچھا تم نکتے ہو تو مانے لیتی ہوں۔ دیے آخر تم اتنے دن وہاں رہے۔ کسی جانتے
والے کو پکڑا ہوتا۔ کوئی مکان اس کے واسطے سے مل ہی جاتا۔“

بوجان، میں آپ کو کیا بتاؤں۔ نہ وہ لوگ، نہ وہ درودیوار، نہ وہ درخت، نہ
وہ رستے وہاں تو دنیا ہی بدلتی ہوتی ہے وہ جگہ اب رہنے کے لائق نہیں رہی۔“

”اچھا، بوجان کا ہجھہ بتا رہا تھا کہ انہیں میری بات کا اعتیار نہیں آیا ہے۔ لیں
جیسے یہ سوچ کر کہ اڈیل رٹ کے سے کون بحث کرے چپ ہو گئی تھیں۔

میں نے آنکھوں سے دیکھا نہ ہوتا تو مجھے بھی کہاں اعتیار آتا۔ یہاں سے مجھے احساس
ہوا کہ دنیا تب سے اب تک کتنی بدل گئی ہے اور شہر کیا سے کیا ہو گیا ہے شہر کا وہ
پچھلا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ پت جھڑکی دوپہریں۔ سڑک پر پیلے پتوں کا یستر
بچھا ہوا۔ ہوا کا کوئی تیز جھونکا آتا تو ایک دم سے پیلی ٹہینیوں میں کھلبی محنتی سوکھے
پتے کھڑکھڑاتے، ٹہینیوں سے با جماست بھڑتے اور پکی سڑک پر فٹ پا تھ پر گر کر
پیلے سے گرے ہوئے پتوں کے سامنے رُل بیل جاتے۔ ہوا کا جھونکا گز رجا گا اور پھر

خاموشی پھا جاتی۔ پھر می خاموشی اس وقت لوٹتی جب پھر کوئی تیز جھونکا آتا جب کوئی کار فرائٹ سے اس سمنان راہ سے گزرتی اور سوکھے زرد پتے اس طرح کلبلا نے جیسے بچوں کی بھیڑ تالیاں بجا تی کار کے پیچے دوڑ رہی ہے۔ کار تیزی سے گزرتا جاتی، بچے تھک کر پیچے رہ جاتے، لال حویلی کی سڑک سے لے کر مال روڈ تک اس شہر کی کتنی سڑکیں پت جھڑ کے اس منظر کے ساتھ تصور میں گھوم گئیں۔ موسموں کا اپنا جادو ہوتا ہے۔ موسموں میں سب سے بڑھ کر پت جھڑ کا کہ ایک تو اس کا اپنا جادو، ایک نر و پتوں سے بھیتی ویرانی کا جادو، مخصوص کر دی پھر میں کہ پت جھڑ کی دوپھریں چیڑھ کی ٹیکاٹیک دلپھریوں سے بڑھ کر جادو بھری ہوتی ہیں۔ زمانہ، میں نے سوچا، کتنا بدمل گیا ہے اب اس شہر میں ٹریفیک کے شور اور فلک بوس عمارتوں کے ہجوم میں پھر دل اور موسموں کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ نہ جاتی رُت کی اُداسی کا احساس ہوتا ہے نہ آتی رُت کی آہستہ سناتی دیتی ہے۔ نہ دریواروں چھتوں پر اترتی چڑھتی دھوپ اپنے اترنے پڑھنے کا پتہ دیتی ہے نہ دھلتے دن کی دبے پاؤں بھیتی پھاؤں اپنی خردیتی ہے اور کان نہ اس سے آشنا کہ درخت کیا کلام کرتے ہیں نہ یہ سلنے پر آمادہ کہ پرندے کو نسی بانی سناتے ہیں۔ شہر بدمل گیا۔ شہروالوں کے حواس گند ہو گئے۔

تب رفتہ رفتہ بوجان کی بات نے دل میں گھر کرنا شروع کیا۔ خیر بوجان تو آہستہ سے اتنا کہہ کر چپ ہو جاتی تھیں کہ بیٹھے اس طرح اٹھاؤ چولہا کپٹک بنے پھر ہو گے۔ قدم چمانے کے لئے اور سر چھانے کے لئے اپنا کوئی جھونپڑا ہونا چاہیے مگر جب بیوی نے گھر میں قدم رکھا تو اس نیک قدم نے یہی بات زیادہ بلند آہنگ

سے اور تکرار کے ساتھ ہی۔ یہوی جب نئی نئی ہوتی ہے تو اس کی بات زیادہ انداز کرنے ہے۔

”دیکھتے نہیں ہو، مکانوں کے کراتے کتنے بڑھ گئے ہیں۔ آج مکان بد لیں تو آدمی تنخواہ تو کرائے ہی میں نکل جائے گی“

میں قائل ہو گیا۔ زبیدہ نے بات غلط تو نہیں کہی تھی۔ مکانوں کے کراتے بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ شروع میں یہاں مکان کتنے تصور سے کراتے پر مل جایا کرتے تھے اور کتنی آسانی سے مل جاتے تھے۔ ان شروع کے برسوں میں بچے جو بھی مشکل پیش آئی مکان میں بننے کے بعد پیش آئی۔ مکان بد لئے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ مگر برس جتنے گزرتے گئے، مکان کی تلاش میں اتنی ہی مشکل پیش آئی گئی۔ شہر پیش رہا تھا۔ نئی آبادیاں وجود میں آرہی تھیں۔ نئی تعمیرات کا وہ زور تھا کہ کشاور علاقے گنجان ہوتے چلے جا رہے تھے۔ جو قلعات کب سبے معرف پڑتے تھے وہاں عمارتیں قطار اندر قطار کھڑی ہو چکی تھیں۔ مگر مکان جتنی کثرت سے تعمیر ہونے اتنی ہی ان کی قلت ہوتی چلی گئی۔ جتنی قلت ہوتی گئی اتنے کراتے بڑھتے گئے۔

تو ایک تو کراتے کے مکان کی دقتوں کا احساس۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید بوجان بھیک ہی کہتی ہیں کہ قدم جمائے کے لئے زمین کا اپنا کوئی ٹکڑا ہونا چاہئے۔ شاید میں بھرا ہو آدمی اسی وجہ سے ہوں کہ نجرا ہوں۔ قدم جمانے اور سرچھانے کے لئے کوئی کونہ مل جائے تو شاید اپنی زندگی میں بھی کوئی جماڑ پیدا ہو جائے سو مکان بنانے کا خیال جس سے آگے وحشت ہوا کرتی تھی اب میرا مسئلہ بن گیا۔ اب یہ وقت آیا کہ میں نے دفتر میں ساتھ کام کرنے والوں کے علم روزگار میں حصہ بیانا شروع کر دیا۔ یہ لوگ کب سے اپنی کالوں کی کچھڑی پکار بے تھے۔ اُنھے بیٹھنے سے یہ ایک ذکر کہ ایل ڈی اے سے کیا بات ہوتی۔ کس افسر نے کیا دعہ کیا، کونسی

ہاؤ سنگ سکیم کب بروئے کار آنے والی ہے۔ میں ان باتوں سے کتنا بور ہوتا تھا۔ دفتر میں چائے پینے پتے کوئی رفیق کا ریہ ذکر چیز دیتا تو میں بس بے مزہ ہو جاتا ہیار اس وقت نہیں۔ تمہاری حساب کتاب کی باتوں سے چائے کا لطف غارت ہو جاتا ہے۔ مگر اب اس ذکر فکر میں میری فلپپی بڑھتی چل گئی۔ اور جب کالونی کا منصوبہ ساول کی بھاگ دوڑ کے نتیجہ میں پروان چڑھا تو میں رفتائے کار کی خوشی میں برابر کا شریک تھا۔ قرعہ اندازی ہوئی۔ میرے نام بارہ مرلے کا پلاٹ نکلا۔ میں باغ باغ ہو گیا۔

”لبیٹے دیکھ بھی لیا ہے کہ ذمین کسی ہے؟“

”لو جان اپھی زمین ہے؟“

”پہلے استخارہ کرالیا ہوتا۔ زمین استخواب کے بغیر نہیں لینی چاہیے؟“

”استخارہ؟— اگر استخارہ منع آ جاتا تو پھر میں تو پلاٹ سے گیا تھا؟“

”میرے لال؟“ لو جان نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ زمین کا ساتھ میر بھر کا ہوتا ہے۔

خرد نے سے پہلے بہت سوچنا کیجھنا پڑتا ہے۔

میں دل میں ہنسا۔ لو جان اپنے زمانے کے حساب سے سوچ رہی تھیں۔ جو نہ

انہوں نے دیکھا ہوتا تھا۔ اس میں بے شک یہی طور تھا۔ آدمی مکان زندگی میں ایک مرتبہ

بناتا تھا۔ جہاں تب زمین پہ بنالیا سو بنالیا۔ پھر وہ پشتوں تک چلتا تھا۔ اپنی چراغ حوالی

ہی تھی۔ کس زمانے کی بنی ہوئی تھی۔ کتنی نسلیں اس میں پروان چڑھیں۔ کتنے موسم اس

پر آئے اور گزر گئے۔ ان موسموں کے ساتھ کتنی چڑلوں نے اس کے روشنданوں میں گھوٹے

بنائے، انڈے دیئے، بچے نکالے، بچوں کے پر آنے کے ساتھ گھونسلے چھوڑ کر اڑ گئیں۔ کتنی

انجمنہا بیلوں نے اس کی اونچی دیواروں پر اپنے مٹیا محل تعمیر کئے۔ اپنے سندھ سیاہ نہری

وجود کے ساتھ ان میں رچیں بیسیں بچے دیئے اور پھر ریزہ ریزہ جمع کر کے بنائے ہوئے محل

کو جھوڑ کر کہیں آگے سدھا رکھیں۔ ہماری بڑی بونے کبھی کسی بچے کو ان جنہاری کا گھر تو نہ

پھوڑنے کی اجازت نہیں دی۔ کہا کرتی تھیں کہ جس گھر میں انجینئری کے لغزنا نے کا مطلب تھا ایک نئی پیدائش کی خبر انجینئری کے گھر میں بھی اور اس گھر میں بھی جہاں وہ اپنا گھر بناتی تھی۔ بڑی بوکے اس عقیدے کے کو بوجان نے بھی اپنایا۔ انہوں نے مجھے یا میرے ساتھ کے کسی بچے کو انجینئری کا گھر اجاہ نے کی اجازت نہیں دی۔ مگر وہ ماہ تو چراغِ حولی کے ساتھ گذر گیا۔ اب تو عقلمند دل نے یہ طور پر احتراکہ ہرنئی ہاؤ سنگ سکیم کے شروع ہونے پر بلاد کے لئے عرضی داع دی۔ بلاد مل گیا تو اسے تھوڑے دلوں ڈالے رکھا۔ پھر منافع پر نیچ کر کسی اگلی سکیم میں بلاد کے لئے بھاگ دوڑ کی۔ بلاد ملنے پر مکان بنانے بھی یا تو بھی لازم نہیں کہ اس میں پوری عمر گزاریں۔ نئے زیانے کے تعیر کرنے والے جس شوق سے مکان تعمیر کرتے ہیں۔ اسی شوق بے منافع ملنے کی صورت میں اسے فروخت کر دالتے ہیں۔ تو خیر میں نے بوجان کو سمجھایا کہ نئی ہاؤ سنگ سکیموں میں زمین حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے پر کہ ان سکیموں میں استخارے کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ ان کی بنیاد قرعہ اندازی پر ہے۔ پھر جو بلاد الات ہو گیا صو ہو گیا۔ مگر بوجان کو اس وقت تک اطمینان نہیں ہوا۔

جب تک انہوں نے مولوی غلام رسول کو بلا کر پوچھنہیں لیا۔ مولوی غلام رسول بھی پہنچ ہوئے بزرگ تھے۔ اپنے علم سے زمینوں کا نیک و بد فوراً جان لیتے تھے۔ انہوں نے بوجان کو اطمینان دلایا کہ نہ میں کسی بدد وح کے اثر میں نہیں ہے۔ مگر یہ کہ صدقہ تو ہر زمین مانگتی ہے۔ سو بنیادر کھتے وقت اس کا اہتمام ہو جانا چاہیے۔ وہ ہوا۔ اس مبارک موقع پر بوجان نے انہیں ہی زحمت دی۔ انہوں نے جنتی دیکھ کر بنیادر کرنے کے دن اور ساعت کا تعین کیا۔ نیو رکھے جانے سے پہلے بلاد کے بچوں نیچ کھڑے ہو کر در تک پھر رہا، چار دن سمتون میں منہ کر کے بچوں کا اور پھر کاٹے بکرے کے لگلے پر پھری پھیری اس کے لگلے سے اُلتا ہو اگر مگر مخون بنیادر میں دلا گیا۔

نیو تو دھری گئی اور جب نیو دھری جاتی ہے، ہبی لگتا ہے کہ بس اب مکان بن کر
کھڑا ہوا۔ مگر ایسا کہاں ہوتا ہے۔ میرے پاس الہ دین کا چڑاغ ہوتا تو راتوں رات مکان
بنانے کر کھڑا کر دیتا۔ مگر یہ تو تھکا دینے والا عمل نکلا۔ زمین کے مجھے چھو کے دیکھو مکان کے
مجھے شروع کے دیکھو۔ جنگ اور عشق کے متعلق تو ہم سب ہی جانتے ہیں کہ ان کے آغاز
کا تو پتہ ہوتا ہے، مگر انجام کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ مکان کی تعمیر بھی جنگ اور عشق کی ٹیکر کا
قصہ ہے۔ بوجان سچ ہی کہتی تھیں کہ جن اور راج مزدور ایک دفعہ گھر میں داخل ہو جائیں
تو پھر انہیں خدا ہی نکالے تو نکلتے ہیں۔ تعمیر کا آغاز میں نے کس دلوں سے کیا تھا۔ آنے میں
کتنا تھک گیا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اسی طرح چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ پیسے کو جیسے پیسے لگ
گئے ہوں۔ تعمیر ہوتے مکان کا منکھلا ہوتا ہے۔ رقم انڈیلے چلے جاؤ پتہ ہی نہیں چلتا کہ
کس کنوں میں گئی۔ زبیدہ نے شادی کے دوسرا ہی دن سے گھر کی خستہ حالی اور
گلی کی ابتری دیکھ کر دل پر دھریا تھا کہ اپنا مکان بنانا ہے اور اسی وقت سے اس خاطر
پیسے جوڑنا شروع کر دیا تھا اور حق یہ ہے کہ چند ہی برسوں میں اچھی تھا صی پونجی جوڑی تھی۔
مروہ جمع یونچی تو پہلے ہی ہلہ میں نکل گئی۔ پھر قرضوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ دفتر سے قرضہ۔
ہاؤ سنگ فناں کا دپوریشن سے قرضہ، بیکوں سے قرضہ، ایک بنک سے، دوسرے بنک
سے، پھر تکرم رٹا کے کسی تیسرے بنک سے پھر دوستوں اور ملٹے والوں کی باری آئی۔
پہلے لمبے قرضے پھر جتنا جس سے مل جائے۔ آخر آخر میں تو سو سو دو دو سو بیک کے قرضے
بھی لئے گئے۔ جس نے جتنا دے دیا۔ بھاگتے بھوت کی نگوئی سمجھ کر غنیمت جانا۔ یہ
سوچ کر دل کو سمجھایا کر بوندر بوندر کے ہی تالاب بھرتا ہے۔ مگر عبر تاد کھانی تو دے۔
میں نے جگری دوستوں سے پریشانی بیان کی۔ کامر یڈ نے تو نہ بخندے میری
بات کا جواب دیا۔ "ہو رچو گئے؟" اصل میں کامر یڈ تو سرے سے مکان بنانے ہی کے
خلاف تھا۔ مکان بنانے یہ کیا موقوف تھا۔ میں نے جب ملازمت شروع کی تھی تب

بھی اس کا ردِ عمل خلاف ہی تھا۔ جب میں نے شادی کیا اس پر بھی اس نے بیزاری ہی کا انہصار کیا۔ شادی، گھر بار، ملازمت، اس کے حساب سے یہ سب جھیلے ہیں جو آدمی کو انقلاب سے دور لے جاتے ہیں اور سرمایہ داروں سے سمجھوتہ کرنے اور ضمیر کا سودا کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

ممتاز نے بالستہ دلبوٹی کی مگر عجب انداز سے کہنے لگا "یا کسی باش کرتے ہو۔ تم نے کوئی نیا قرضہ لیا ہے۔ مکان تو ہمیشہ قرضے ہی سے بنتا ہے اور مکان کے لئے قرضے اسی طرح لئے جاتے ہیں" ॥

"لیکن یا ر قرض جہاں جہاں سے مل سکتا تھا وہاں سے لے چکا۔ مکان پھر بھی ادھ بنا ہے۔ آگے گاڑی کیسے چلتے ہیں" ॥

"یہی ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ گاڑی آگے نہیں چل سکتی۔ راجح مزدوروں کو چھپی دو۔ ٹھیکیدار سے محدودت کرو۔ مگر نہ راجح مزدور ٹلتے ہیں نہ ٹھیکیدار پنڈ چھوڑتا ہے۔ بس پھر کسی نہ کسی طرح گاڑی چل پڑتی ہے اور لشمن پشم چلتی رہتی ہے" ॥
"کیسے چلتی رہتی ہے" ॥

"لایسے کہ جب آدمی باہر سے قرضے لے چکتا ہے تو پھر گھر بار کا جائزہ لیتا ہے۔ پہلے بیوی کا زیور گروی رکھا جاتا ہے۔ پھر جہیز میں آئی ہوئی قسمی اشیاء فروختہ ہوئی ہیں۔ سب سے آخر میں گھر کے برتن پکتے ہیں" ॥

"یا ریہ تو تم بہت بھیانک نقشہ پیش کر رہے ہو" ॥
"کوئی بھیانک نقشہ نہیں ہے۔ جب مکان بن جاتا ہے تو مرپ کر قرضے ادا ہو، ہی جاتے ہیں" ॥

جو بات ممتاز نے کہی وہی زبیدہ نے بھی کہی۔ میں نے اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ بولی "تم مکان بن جانے دو۔ قرضوں کا کیا ہے وہ تو ادا ہو ہی جائیں گے۔ بس

یہی ہو گا کہ گھر کے اخراجات کم کرنے پڑیں گے۔ نہیں کھائیں گے تر نوالہ۔ روکھی سوکھی کھا لیں گے۔ گھر تو اپنا ہو گا۔ اپنے گھر میں آدمی روکھی سوکھی کھا کے بھی خوش رہتا ہے؟“
اصل میں ایک چوک مجھ سے بھی ہوتی۔ وہ چوک ناجربہ کاری کی وجہ سے ہوتی۔
خوبی کا تجھیں لگاتے وقت یہ بات تو ملحوظ رہی نہیں۔ کھل گئی کہ رقمیں نند بھی کرنی ہوں گی۔ آخر نقصہ بھی منظور کرانا تھا اور سینٹ کا پرمٹ بھی لیتا تھا اور ایسے ہی چھوٹے چھوٹے سو خرچے تھے۔ پھر یہ کہ تجھیں لگاتے وقت تعمیری سامان کی قیمتیں کچھ تھیں، تعمیر ہوتے کہیں سے کبیں پہنچ گئیں۔

خیر بھی پڑتی ہے سہارنی پڑتی ہے۔ اس صورت حال سے منفر تو نہیں تھا۔
تعمیر ہوتا مکان آدمی کو بھاگنے تو نہیں دیتا۔ تو مکان ششم پشم گزار سے لائق بن ہی گیا۔ بیشک اس میں کھانچے رہ گئے تھے۔ مگر ممتاز نے اچھی بات کہی کہ نیا بنا ہوا مکان مکمل طور پر بنا ہوا کبھی نہیں ہوتا۔ لکیاں رہ ہی جاتی ہیں جو بعد میں پوری ہوتی رہتی ہیں تو میں نے بھی سوچا کہ جو حصے ادھے بنے ہیں انہیں فی الحال نظر انداز کرو اور مکان کو مکمل جانو۔ بس اس میں آباد ہو جاؤ۔ تب میں نے پہلی مرتبہ باہر کھڑے ہو کر مکان پر ایک بھر پور نظر ڈالی۔ ایک حرث اور ہیئت نے مجھے آیا۔
نگ دشت کا ایک پہاڑ سیرے سامنے کھڑا تھا۔ اچھا یہ تعمیر میں نے ایک عجیب تجربہ ہے۔ نیا مکان آدمی کو رجاتا بھی ہے، اڑاتا بھی ہے۔ زبیدہ خوش بھی۔ بو جان بھی خوش تھیں اور میں؟ میں خوش بھی تھا اور اس بھی۔ تنہوڑے دو ماں کا حساس تھوڑا خوف۔ ایک اٹیں ان کے آتر کار اپنا ایک گھر ہو گیا۔ ساتھ میں بے اٹیں انی بھی اور تذبذب۔ بات یہ ہے کہ پتہ تو نہیں ہوتا کہ نے درد دیوار سے ہمارا رشتہ کس رنگ سے قائم ہو گا، ہو بھی کے گایا نہیں۔ کتنے معاملات کیا کیا قصے ہوتے ہیں۔ شادی نمی کے کہتے واقعات گزد تھے ہیں۔ تب کہیں جا کر درد دیوار کے ساتھ

رشتہ قائم ہوتا ہے۔ پھر ہر شادی ہر بھنی کے ساتھ جوان درود دیوار کے بیچ گزرتا ہے۔ رشتہ گمرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس آن مجھے چراغِ حوالی کی یاد آئی۔ اس کے درود دیوار سے رشتے میرے پیدا ہونے سے پہلے قائم ہو چکے تھے۔ میری پیدائش سے پہلے کتنے جنازے اس ڈیورٹھی سے نکل چکے تھے اور کتنے ڈولے اس ڈیورٹھی میں داخل ہو چکے تھے۔ میری پیدائش کے بعد بھی اس ڈیورٹھی سے کئی جنازے نکلے۔ کئی ڈولے اس ڈیورٹھی میں آئے، کئی ڈولے اس ڈیورٹھی سے رخصت ہوئے۔

آخری جنازہ کراس ڈیورٹھی سے نکلا، میاں جان کا تھا کہ اس کے بعد خاندان کا خانہ اس ڈیورٹھی سے نکل گیا۔ خیر میاں جان تو بعد میں گئے۔ بڑی بوآن سے پہلے ہی سدھا گئے۔ کتنے دنوں پنگ پہ پڑی رہیں۔

مانپ والی کو بھری کے برابر والے گمرے میں ان کا پنگ بچا ہوا تھا۔ جانے کب سے بیمار چلی آرہی تھیں۔ تند رست بھی ضرور رہی ہوں گی۔

مگر میں نے ان کی تند رستی کا زمانہ نہیں دیکھا۔ جب سے ہوش منجھا لے اُمیں بستر بیماری پہ پایا۔ دن رات اسی گمرے میں بستر یہ دراز رہتا، مختوڑا تھوڑا کراچتے رہتا۔ کبھی تکلیف کم ہوتی اور پھرے پہ بھالی آجائی تو اُنہوں کو میٹھا جاتیں۔ پھر دور دور کی سو بھتی۔

”اے بیٹے اخلاق، یہ کیا سُلھا رے والا گلی میں بول رہا ہے“

”جی بڑی بو“

”اے بے پوری فصل گزدگئی میں نے تو سُلھا را چکھا ہی نہیں“ گلے میں پڑے بُوے سے اکنی نکلتے ہوتے یہ لے ذری اکنی کے سُلھاڑے میرے لئے لادے۔ چکھے کے تو دیکھوں۔

”ابھی لا یا“

دم کے دم میں سنگھارے حاضر۔

بوجان کا آکر دیکھنا اور لوگنا۔ بڑی بو، یہ آپ کیا بد پر ہیزی کر رہی ہیں۔ خدا خدا
گئے تو طبیعت فرائیں جملی ہے۔ سخت چیزیں کھائیں گی تو پھر طبیعت بگڑ جائے گی؛
”نہیں ہو، سخت نہیں ہیں۔ کھا کے دیکھو۔ بالکل چھوٹ ہیں۔“

”پھر بھی۔ ہیں تو آنر سنگھارے ہی۔“

”بہو جاتی فصل کا میوہ ہے اور ہم بھی اب چلنے ہار ہیں۔ اگلی فصل کس نے دیکھی
ہے۔ چنی گئی تو یہ تمہارے انگھارے سنگھارے کھانے کے نئے واپس تو نہیں آؤں گی۔“
”نہیں بڑی بو، شیطان کے کان بھر سے۔ ایسی بد شگنی کا حکمہ کیوں منہ سے نکالتی
ہیں۔ اب تو ماشاء اللہ آپ کے چہرے پر رونق ہے۔ آپ کے بیٹے تو واقعی ڈر گئے
تھے۔ مگر اللہ نے بڑا کرم کیا۔“

اس دن بڑی بو کے چہرے پر واقعی رونق تھی۔ مگر رات ہوتے ہوئے طبیعت بگرنی
و دپڑائش کا آنر میں سنبھالا تھا۔ بس پھر ایک دم سے گل ہو گیا۔ چہرے پر آئی ہوئی رونق
اسی طرح رہ گئی۔

دوسرے دن جب بوجان کے دل کو تھوڑا قرار آیا تو انہوں نے پر سادینے والیوں
کے سامنے ذکر کرتے ہوئے بار بار یہی کہا ”بی بی کیا بتاؤں، چہرے پر کتنا سکون تھا۔
لگتا ہی نہیں تھا کہ مر گئی ہیں۔ بس ایسا لگتا تھا کہ سور ہی ہیں۔ جیسے باتیں کرتے کرتے
آنکھ لگ گئی ہو۔“ پھر جنازے پر تبصرہ ”کیا بتاؤں جنانے پر کیسی رونق تھی۔ وہ جنازہ
تحوڑا بھی لگ رہا تھا۔ یہ لگتا تھا کہ برات نکل رہی ہے۔“

بڑی بو کے کرے میں چالیس دن تک پابندی کے ساتھ چراغ جلا اور اگر بی سلگی۔
چالیس کے بعد ایک دن بوجان کہنے لگیں ”بی بی چالیس دن تک اس کرے میں کسی
رونق رہی ہے۔ اگر بی تو میں ستام کو سلگاتی تھی۔ مگر کرہ پوچھیوں گئے مہکتا رہتا

تھا اور خوشبو بھی عجب طرح کی تھی۔ اے بی بی چالیسوں نہ تے ہی کرے میں کیسا سنا پھالیا
ہے۔ جیسے آئے مہمان چلے گئے ہوں ”

چالیسوں پر عزیز زشتہ دار دودھ دوڑ کے شہر سے چل کر آئے۔ تب مجھے اندازہ
ہوا اور حیرافی بھی کر رہا خاندان کتنا بڑا ہے اور کہاں کہاں پھیلا ہوا ہے۔ کتنے دو پرے
کے تالیوں، چیاؤں کو پھوپھیوں، پھوپھاؤں کو، بہنوں بہنوں کو میں نے پہلی بار دیکھا۔
شیرس کو بھی جیسے پہلی سی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ زمانہ جب ہم ساتھ ساتھ کھلے تھے، بھول
بسر پکھا تھا۔ اب تو شیر کا طور ایسا تھا۔ جیسے وہ مجھے جانتی ہی نہیں۔ مجھ پر کیا موقف
تھا، چراغِ خویلی کی کسی بڑی لڑکے سے بات کرنا، ہی اسے گوارا نہیں تھا۔ الگ الگ
دہتی تھی۔ کتنا بڑا ہیں آگیا تھا۔ اس میں چھی جان جس طرح بیسوں کے زیج بیٹھ کر اس کی
تعریف کرتی تھیں۔ اس سے وہ اور اُترانے لگی تھی۔ چھی جان نے سب کے زیج بیٹھ کر کس
غمز سے اعلان کیا تھا کہ ہماری شیریں اب کانچ میں پہنچ گئی ہے۔ ما شاء اللہ سے اتنی ذہین
ہے کہ اپنے باپ سے انگریزی میں بتایا کرتی ہے۔

سب اس خبر پر ششد رہ گئے۔ اصل میں ہمارے خاندان کی تاریخ میں یہ پہلا
واقعہ تھا کہ ایک بڑی تھنی اور حل کی منزلوں سے آگے نکل کر کانچ میں پہنچ گئی تھی اور انگریزی
لکھ پڑھ رہی تھی۔ تھی تو ابھی وہ فرست ایٹر ہی میں۔ لیکن مجھے اس نے اپنے مشورے دیئے
جیسے وہ کانچ کی زندگی کا لبا تجربہ رکھتی ہے۔ مشوروں کی منزل بعد میں آئی۔ شروع میں تو
وہ الگ الگ اوندو رو دوڑ رہتی تھی۔ بس ایسا لگتا تھا کہ میرے اور اس کے زیج میلوں کا
فاصلہ ہے۔ مگر کیا ہوا کہ بوجان نے ایک دن مجھے ٹھوکا کر دیئے، شیر میں آئی ہوئی ہے۔
اس سے تم کیوں نہیں پوچھ دیتے کہ کانچ میں داخلہ کے لئے تمہیں کیا کرنا ہے اور شیر میں یہ
مُن کر کر میں بھی کانچ میں قدم سکھنے لگا ہوں ایک دم سے مجھے پہ مہرباں ہو گئی۔ بس چھوٹے
ہی وہ بڑی بن گئی اور مجھے اپنا چھوٹا سمجھ کر کانچ کی زندگی کے نشیب و فراز سمجھانے لگی۔

پھر اس قسم کے مشودے کہ مجھے کون کو نے مضمون یعنی چاہیں اور انگریزی میں مہارت پیدا کرنے کے لئے کیا کیا پڑھنا چاہیے۔

کانج کی حد تک میں نے بھی اسے بڑا مان لیا اور دہان کی زندگی کے متعلق جی بھر کر معلومات حاصل کیں۔ میں یہ بھول ہی گیا کہ ابھی شیریں کو کانج میں گئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ خیراس کے بعد میں بڑا بن گیا یہ اس وقت ہوا جب اسے جویلی کے پر اسرار گوشوں کے متعلق کریم ہوئی اور میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کرنا شروع کیا۔ سانپوں والی کو محترمی کے متعلق جو میں نے بڑی بوئے اور بوجان سے ساختا۔ سب اُسے سنا دالا۔ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ ”وہ کا الہ ہے۔“

”پاکل کالا بھینگ۔“ اور یہ لمبا اور یہ موٹا جیسے اٹ دھا ہو۔“

اور اسی سانس میں میں نے اسے جعفر کی موت کا قصہ سنا دالا۔ جعفر سانپ کو مارنے میں بہت مہارت رکھتا تھا۔ محل میں بلکہ پوری بستی میں جس گھر میں بھی سانپ نکلا دہی مارنے کے لئے بلوایا جاتا تھا۔ مگر پھر اسے مجھی بالآخر سانپ ہی نے ڈسا۔

”پتہ ہے اسے سانپ نے کیوں ڈسا تھا؟“

”کیوں ڈسا تھا؟“

”وہ سانپ کی آنکھیں کچلانا بھول گیا تھا۔“

”تو پھر؟“

”واہ شیریں تمہیں اتنا بھی پتہ نہیں ہے۔ سانپ کو جب کوئی مارتا ہے تو اس کی آنکھوں میں مارنے والے کی تصویر اُتر آتی ہے۔ سانپن آکر اس کی آنکھوں کو دیکھتی ہے۔ پھر جس آدمی کی شکل اس کی آنکھوں میں نظر آتی ہے اس کے پیچے پڑ جاتی ہے۔ پھر اُسے چھوڑتی نہیں۔“

شیریں پہلے ہی حیران ہو رہی تھی۔ اب بالکل حیرت نہ دہ ہو گئی اور جیسے دل ہی دل

میں دُر رہی ہو۔ آستین سے مجھے پکڑا۔ ”چلو یاں سے چلیں“ اور ہم دونوں سانپوں کی کوٹھری کے پاس سے چل کر دالان میں آتے، دالان سے صحن میں دہائی سے مردانے میں جپاں اُپنے من والان کنوں تھا اور جس پرہ بیر نیم کی چھاؤں رہتی تھی۔ لب سہم کنوں میں کے من پر آ کر بیٹھ گئے۔ سب سے الگ شہدگ۔ ادھر دالان میں بو جان پچھی جان، تائی آماں غرض سب ہی مسٹی باتیں کر رہی تھیں۔ سکونے شکایتیں۔ تعریف و تنتیع۔

ہونے والی اور ہو کر ٹوٹ جانے والی منگلینیوں کے تذکرے، ہو جانے والی شادیوں پر تبصرے اور ادھر ہم دونوں حیرت کے عالم میں گم نہیں۔ لب اسی طرح حولی کے اندر دو دنیا میں آباد تھیں۔ ایک تو یہی معمولات کی دنیا، روزمرہ کی باتیں، دیکھنے بھائے لوگ اور ایک غیر معمول کی دنیا، انہوںی باتیں، ان دیکھی ان جانی مخلوق کے اچانک کسی آن کسی گھری لس ایک جملک نظر آتی، ایک اڑتا ساسای، یا محض آہٹ اور حولی کی معمولات کی دنیا میں ایک حیرت اور خوف کی لہر دوڑ جاتی۔ لب یوں حولی میں ہوں اور انہوںی کی دم بھر کے لئے آنکھیں چار ہوتیں۔ اس سے ایک نزلہ سا آتا۔ پھر یہ اپنی راہ، وہ اپنی راہ۔

برڈی بوجبی تک زندہ رہیں۔ اس لقین کے ساتھ فردہ رہیں کہ اوپر والے کرے میں کوئی رہتا ہے۔ ایک دفعہ تو انہوں نے کچھ دیکھا بھی تھا۔ جمعرات کی شام تھی کہ انہیں یہ لگا کہ جیسے کوئی سفید براق پرڑوں میں ہے اور اندر کمرے میں گیا ہے۔ مگر جب وہ کرے میں گئیں تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ لب کمرہ خوبصورت سے بھرا ہوا تھا۔

”برڈی بوجبی“ بو جان نے ایک دفعہ ان کے سامنے تجویز پیش کی تھی۔ ”پھر کسی عامل کو بلا کے یہاں عمل کرایا جائے یہ۔“

”ناہیو، وہ تو کوئی بزرگ روح ہیں۔ حولی کی حفاظت پر مامور ہیں۔ ہمارے جو قسر تھے وہ پہنچے ہوئے بندگ تھے۔ میں تو جانوں انہیں نے کسی کو تعینات کیا ہے؟“ اور سانپ کی کوٹھری والے کو تو انہوں نے ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ دیکھا تھا۔ ”اللہ

ہی جانے کب سے یہاں رہتا ہے۔ بہت پرانی روح ہے۔ مگر انصاف کی کہنی چاہئے، اس نے کبھی کسی کو ستایا نہیں۔ ہم نے تو کبھی اس کی چنکار بھی نہیں سنی۔ میں نے ایک مرتبہ بہو تمہارے خسرے ذکر کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ ہم سے کچھ نہیں کہتا۔ ہم بھی اس سے کچھ نہیں کہتے۔ بس اُسے چھپر نامت۔“

وہاں گھروں میں سانپ کچھ زیادہ ہی نکلتے تھے۔ مسلمان کے گھر میں سانپ نکلنا تو جعفر کو ملبوایا جاتا کہ وہ اس مہارت سے اُسے گھیرتا کہ ہار کر وہ اس کی لائشی کی زد میں آتا اور مار جاتا۔ ہندو کے گھر میں نکلنا تو جعیر کو ملبوایا جاتا کہ وہ سانپ کو بازتا نہیں تھا پکڑ لیتا تھا۔ کس کمال سے دم کو چیلکی میں دبا کر ایک بجھکا دیتا کہ اس کی کرٹوٹ جاتی، اور پھر وہ اسی طرح اسے دم سے چیلکی میں پکڑے ہوئے ناوہ قائمہ بناتے ہوئے بستی سے باہر جاتا اور پکانی اعلیٰ تلے کے اس کنوئیں میں جوز مانہ ہوا نشک ہو چکا تھا اُسے پھینک آتا۔

کنوئیں وہاں بہت تھے۔ مگر سوکھا کنوں تو بس یہی ایک تھا۔ جو ہندوؤں کے گھروں میں نکلنے والے سانپوں کا بندی خانہ بننا ہوا تھا۔ مگر کیسا بندی خانہ، سانپ گرنے پر پہلے تو تہہ میں پڑے ہوئے کوڈے گرکٹ کے زیچ گھری بھر کے لئے تردیتا، پھر کونوں کھدوں میں غائب ہو جاتا۔ تو سوکھا کنوں تو یہی ایک تھا۔ باقی سب کنوئیں شاداب تھے۔ ہاں ایک اور کنوں تھا۔ دوسرے کنوں سے مختلف۔ یہ کھاہی کنوں تھا۔ اس کا پانی تو بس نالیوں کو دھونے ہی کے مصرف میں آتا تھا۔ باقی تھنڈے میٹھے کنوئیں تھے کران کا پانی صراحیوں اور بچے گھزوں میں بھرے جانے کے بعد میٹھی سوندھی مہک بھی پکڑ لیتا تھا۔ سب سے تھنڈا میٹھا پانی ہماری حولی کے کنوئیں کا تھا اور میال جان رمضان کے دلوں میں ایک اہتمام اور گرتے تھے۔ کیوڑے کی بوتلیں کی بوتلیں اس میں اندر لیل دیتے تھے۔ بس پھر رمضان بھر ہم کیوڑے سے مہکتا پانی پیتے تھے۔

بوجان اس حوصلی کی یاد کے ساتھ کرائے کے مکانوں میں کیسے گذارہ کر رہی تھیں؟
 یہ میں محسوس تو کر سکتا تھا، مگر میرے لئے اس کے سوا چارہ کیا تھا۔ دیسے بوجان لپنے
 دکھو کا ذکر نہیں کرتی تھیں۔ بس جب میں کرائے پر نیا مکان یستاتب وہ اس عکان
 کا جائزہ لیتیں اور حوصلی کو یاد کر کے لمبا تھنڈا سانس لیتیں اور چپ ہو جاتیں۔ ہاں کبھی
 کبھی سمجھاتیں کہ آدمی کے لئے اپنی چیخت اور اپنا کونہ کتنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ تو میری
 شادی کے بعد ہوا کہ انہوں نے بہو کی لگ پا کر مکان بنانے کی ضرورت پر ضرورت
 سے زیادہ زور دینا شروع کر دیا اور جب میں نے مکان بنایا تو زبده کتنی خوش تھی
 اور بوجان کتنی معلق تھیں۔ مگر میں افسردہ تھا۔ اینٹ پتھر کا ایک پہاڑ خود میرا کھڑا
 کیا ہوا میرے سامنے کھڑا تھا اور مجھے ایک تذبذب نے گھیر کھا تھا کہ اس کے ساتھ
 میری رفتاقت کیا صورت اختیار کرے گی۔ سو جب میں اس گھر میں داخل ہو رہا تھا
 تو تعلقات کے نئے امکانات کے رو برو تھا، ایک نئے رشتے کی دلیز پر۔

۳

ہر زمین ہر آدمی کو داس نہیں آتی۔ بعض زمینیں اکل کفری ہوتی ہیں کہ اپنے کسی باسی کو بستے نہیں دیکھ سکتیں، اپنے اجارہ پن میں خوش رہتی ہیں۔ بعض زمینیں زود حس ہوتی ہیں کہ بننے والوں سے طبیعت میل کھا جائے تو ان پر کشا دہ ہو کر انہیں نہال کر دتی ہیں۔ طبیعت میل نہ کھائے تو ان پر تنگ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ مگر یہ آنکا ہی تو بعد کی بات ہے ان دنوں مجھے ان یا توں کا شعور کہاں تھا۔ میں تو کبھی زمینوں کا مزاج داں نہیں رہا۔ میرے تو تصور میں بھی کبھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ زمین بھی محبت اور نفرت کر سکتی ہے۔ ہمیشہ یہی سمجھا کہ محبت اور نفرت آدمی کے مشغله ہیں۔ ان جنہیں لوں سے زمین نا آشنا ہے زمین آدمی سے محبت نہیں کرتے۔ آدمی زمین سے محبت کرتا ہے اور کبھی کبھی تو اس طرح ٹوٹ کر کرتا ہے۔ جیسے زمین بھی عورت ہو، بلکہ عورت سے بڑھ کر خورت۔ تو میں نے اس طرح سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے تو قریب میں نکلنے والے پلاٹ کو اس زادی سے دیکھا تھا کہ وہ کونے کا پلاٹ ہے یا کہیں زیع میں بچپنا ہوا ہے اور یہ کہ میں روڈ سے قریب رہے گا یا وہ سبڑے گا۔ زمین کے بھی جذبات ہونے ہیں، وہ بھی خوش اور ناخوش ہوتی ہے یہ بوجان کا عرفان تھا۔ نے مگر میں آکر پھر انہوں نے اپنے حساب سے تجویزیں پیش کیں۔

”اے دلبن، نئے گھر میں آکے اس طرح تو نہیں بیٹھ جایا کرتے کہ نہ اللہ کا نام نہ رسول مکالمہ۔ اپے گھر میں فرشتے قدم نہیں لکھتے“

”بھر بوجان، میخائی منگلا کے نیاز دلاتے دیتے ہیں؟“

”اے سہے دہن، خالی نیاز دلا کے بیٹھ جاؤ گی۔ برادری کنیہ والے، ملنے جلنے والے کیا کہیں گے؟“

”بھر؟“

”بھر کیا؟ میلاد کرو کر نہیں جمع ہوں۔ پچھا اللہ رسول مکالمہ کا ذکر ہو، پچھو بچوں بڑوں کی چہل بیل ہو۔ ہنسی خوشی کی آواز میں گنجیں۔ گھر میں اسی طرح خوشی رستی ہے۔“
بھر بوجان نے چراغِ حولی کے کب کب کے قسم سناڑا لے کر کس موقع پر کونسی خوشی کی تعریف ہوئی تھی اور اس میں کیا دھوکہ دھمکا ہوا تھا۔ کتنے دنوں کے بعد بوجان کی زبان کھلی تھی ورنہ چراغِ حولی سے نکل کر تو انہیں چپ لگ گئی تھی۔ وہاں وہ کتنا چیختی بولتی رہتی تھیں۔ یہاں آکر ساری چکب مہک رخصت ہو گئی تھی۔ بس نئے مکان میں قدم رکھا اور زبان کھل گئی۔ شاید اپنے مکان میں بیٹھ کر ان میں حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ گیا ہوا اعتماد بحال ہو گیا۔ کتنی رات تک چرکتی رہیں۔ چراغِ حولی اچانک ان کے تصور میں جی اُنھی تھی۔

”میاں جان سنایا کرتے تھے کہ جب چراغِ حولی بنی تھی تو جانشی کی مشتریوں میں بالوشانہیں بیٹھیں۔ برادری کے برجمنے کو ایک ایک چاندی کی طشتی میں دود دو بالوشانہیں بیٹھی گئی تھی اور دبی بی دبی دبی دبی میں نوبت رکھی گئی تھی۔ چالیس دن تک نوبت بھی۔ نوبت بجانے والے کو جانشی کے انگر کھے کے ساتھ پورا جوڑا دیا تھا۔“

”بوجان، چراغِ حولی کب بنی تھی؟“

”بیٹھے، یہ تو مجھے پتہ نہیں۔ میرے تو اس گھر میں آنے سے پہلے کی بات ہے۔ تمہارے

لکڑ دادا کے وقت میں کسی وقت بھی نہیں۔ جو ٹیکی منڈیروں کے کوؤں نے اللہ کے پانچ پشتیں پرداں چڑھتے دیکھی تھیں۔ بیٹے تم پانچوں پشت میں ہو۔“

”بوجان، اس میں کوؤں کی کیا تخصیص ہے؟“

”بیٹے، کوئے کی عمر لمبی ہو سے ہے۔ سو برس ہیں اس کا ایک پُر سعید ہو دے ہے ویسے تو خدا آنہا را مجدداً کرے زمین والابھی جو سانپ والی کو محشری میں رہوے تھا۔ سو برس سے زیادہ کی عمر کا تھا۔“

”کمال ہے بوجان آتی عمر“

”اے بیٹے اس زمانے میں تو آدمیوں کی عمر بھی بہت ہوا کرے تھیں۔ اللہ بنخشنے تھا دی پردادی جو تھیں۔ خدر کے قصے تو ایسے ساوے تھیں جیسے کل کی بات ہو۔ انگریز جرم کی لڑائی دیکھ کے آنکھیں مومندی ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلواتے پوری صدی دیکھی تھی اور ماشے اللہ چلتی پھرتی دنیا سے گئیں۔ آخر وقت تک دانت سلامت رہتے۔ لیں ایک دفعہ شکایت کی تھی کہ دانت جواب دے رہے ہیں۔ بھٹے کے دانے مجھ سے چھپتے نہیں۔ لیں بوجان اپنی رو میں چرانغ حوتی کے الگ کچھ پچھلے قصے ساتھ چل گئیں۔ پہلی رات تو انہیں باتوں میں کٹ گئی۔ اچھا خاصار تھا گا ہو گیا۔ کہیں پہلی رات کو سوئے ہیں اور صبح سوریے اٹھے بیٹھے۔ کم از کم میری آنکھ تو تڑ کے ہی کھل گئی۔ نے گھر کی صبح بھی نٹی نٹی لگ رہی تھی اور آسمان کتنا آزاد نظر آ رہا تھا۔ نکلتا سورج یوں دکھائی دیا جیسے آج ہی پیدا ہوا ہے۔ میں نے پورے گھر میں گھوم پھر کر اپر نیچے چڑھا کر جائے لیا کہ سورج اس گھر میں کس طرف سے نکلتا ہے اور پہلی کرن ہماری کونسی منڈیر پر تھی تھی ہے۔ گھر میں یہ دیکھتا ہے ضروری ہوتا ہے۔ آخر سورج سے بھی توبناہ کرتا ہوتا ہے۔ نے گھر میں قدم رکھنے کے ساتھ چاند سورج ستارے آسمان ہوا، بارش، سب بھی سے نئے سرے سے افہام و تفہیم کرنی ہوتی ہے۔ دھوپ چھاؤں کا نقشہ کھینا ہوتا ہے۔ دیکھنا ہوتا ہے کہ دھوپ کس رنگ سے

اُتری چڑھتی ہے اور چھاؤں کس طور پر چھٹی سمنٹی ہے۔

اس ایک صبح پر موقوف نہیں ان دنوں روزہ ہی صبح منہ اندر ہیرے میری آنکھ کھل جاتی۔ آنکھ کھلتی کہ فوراً ہی ساری نیند آنکھوں سے غائب ہو جاتی۔

زبیدہ کی خواہش تھی کہ ہمارے اس گھر کا کوئی نام بھی ہونا چاہیے۔ کتنے نام تجویز ہوئے اور رد ہوئے۔ میں نے کہہ دیا تھا میں گھر کے نام کے ساتھ اپنا نام نہیں نہیں کروں گا۔ آخر ایک سیوے سے نام پر آفاق رائے ہو گیا۔ آشیانہ اور اب میں اس گھر میں صبح ایسے کرتا جیسے پرندے آشیانے میں صبح کرتے ہیں۔ ترکے آنکھ کھلاتی۔ بس میں پھر ریلے کے قوراً چھت پر پہنچتا چھلتے آجائے اور نکلتے سورج کے عمل کا جائزہ لینے لگتا۔ وہ صبحیں کتنی نئی اور اجملی لگتی تھیں اور فضا میں کتنی شادابی ہوتی تھی۔ بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ دنیا نئی نئی پیدا ہوئی ہے یا میری نئے سرے سے پیدائش ہوئی ہے یا کہہ لیجئے کہ جیسے میری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ شادی کے بعد کروں میں، برآمدوں میں صحن میں، بس پورے گھر میں ایک نئی مہک، نئی حرارت سرسری محسوس ہوتی ہے۔ حبیب آدمی اپنا نیا مکان بناتا ہے اس وقت بھی کچھ بھی کیفیت ہوتی ہے۔ کم از کم میں تو یہی محسوس کر رہا تھا کہ میری زمین سے نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ زمین کے ایک خوبصورت قطعہ سے درود ایواز کے بیچ ایک نئی حرارت۔ کتنے زمانے کے بعد مجھے زمین سے وصل حاصل ہوا تھا اور آسمان سے شرف باریابی۔ وہ جو اس گھر میں قدم رکھتے ہوئے مجھے اُواسی نے آیا تھا اور ایک تندریب نے اس کے اپ کوئی اثر آثار باقی نہیں تھے۔

اب میری سمجھ میں آرہا تھا کہ لوگ گھیوں سے نکل کر نئی آبادیوں، نئی ہاؤسنگ سکیوں کی طرف کیوں دور رہے ہیں۔ پہلے تو میں اُسے نو دلتے پن کا مظاہرہ جانتا تھا۔ اب پتہ چلا کہ وہ گلیوں سے کیوں بیزار ہیں آگے لوگوں نے کچھ کھل آسمان سے کچھ دشت کی پہنائیوں سے ڈر کر نکر آباد کئے، نگر میں پتلی پتلی گلیاں بنائیں، ان گلیوں میں مکان

اس طور بنائے کہ ایک دوسرے میں پیوسٹ، منزل کے اوپر منزل یوں انہوں نے اپنی
دائست میں بے اماں اسماں سے اماں حاصل کر لی اور ذمین کی بے پناہ وسعتوں سے
پناہ لے لی۔ مگر جب زمین دا آسمان سے چھپ کر انہوں نے بہت دن گزار لئے تو پھر انہیں
رفتہ رفتہ تنگ گلکیوں اور اونچے مکانوں سے خفغان ہونے لگا۔ کیا مشکل ہے کہ نہ یوں
چیز ہے نہ ووں چیز ہے۔ آدمی زمین کی وسعت اور آسمان کی لاحدہ ودیت سے خوفزدہ
ہوتا ہے۔ گلکیوں گھروں کی تنگی سے اسے خفغان ہوتا ہے۔ تو وسعت کے خوف کی منزل
سے گزر گراب ہم تنگی سے خفغان کی منزل میں ہیں۔ گلکیوں سے کھلے علاقوں کی طرف پیک
رہے ہیں اور کشادہ مکان بنانے میں مصروف ہیں۔ شاید اسی قسم کا کوئی خفغان پوایا
کر لئے کے مکانوں سے جوبے ٹھکانا ہونے کا احساس پیدا ہو گیا تھا، اس سے نجات پانے
کی خواہش، یا محض ماں اور بیوی کا دباؤ ہو، بہر حال وجہ کچھ بھی ہو میں نے مکان بنایا اور
ایسے علاقہ میں بنایا جو کھلا کھلا تھا۔ مجھے یہاں کشادگی محسوس کر کے خوشی ہو رہی تھی۔ ماں
اور بیوی کویر سوچ کر خوشی ہو رہی تھی کہ اپنا مکان کھڑا ہو گیا اور جامدادیں جنمیں۔ کتنی خوش
تجھیں دونوں کہ جامدہ میں پھولی نہیں سماتی تھیں۔ کس دھوم سے انہوں نے میلاد کا اہتمام کیا
اور بالوشہ میں باشیں۔ کھانہ دانہ الگ۔ اس روز خوب دیگ کھنکی اور کتنی چہل پیل رہی۔
بچوں نے تو وہ چشم دھارا۔ مچائی کر میں تو پناہ مانگ گیا۔ پتہ نہیں رات کس وقت تک
جاگ بگ دی۔ میں تو سو گیا تھا۔

”لو جان“ آج ہمارے بچوں اڑے پھانسیاں لگیں گی۔

”اے دہن، صبح ہی صبح کیسا منہوس کلمہ منہ سے نکال رہی ہو۔“

میں نے آدھے سوتے آدھے جاگتے یہ گشتگوئی۔ بات کا آگاہ پچھا سمجھ میں نہیں آیا۔
پھانیاں۔ کسی پھانیاں۔ باہر نظر دالی۔ اچھی خاصی دھوپ نکل آئی تھی۔ بس فوراً بھی
اٹھ بیٹھا۔ یوں تو جب سے میں اس گھر میں آیا تھا۔ سورے منہ اندر ہرے آنکھ کھل جاتی تھی
مگر آج دیر سے آنکھ کھلی۔ شاید اس وجہ سے کہ رات دیر سے سویا تھا۔

منہ ما تھد دھو کر جب ناشستہ کی میز پر پہنچا تو زبیدہ نے ناشستہ چنتے چنتے خبر سنائی۔
”اخلاق تم نے سنا۔ آج ہمارے پھوڑے پھانیاں لگ رہی ہیں یہ“

اب میں چوتکا۔ زبیدہ کو غور سے دیکھا ”پھانیاں ہے کسی پھانیاں؟“

”جیسی پھانیاں ہوتی ہیں یہ“

”ہوش میں تو ہو“

”میں نے اپنے مفر سے اُتمار کے توبات نہیں کی ہے۔ سارے محلے میں شور پڑا
ہوا ہے۔ سُنا ہے کہ تختے تیار ہو رہے ہیں یہ“

بس اسی گھری پڑوس سے نصیبن بوادا نخل ہوش۔ الجما بھرے ہجھے میں بولیں۔

”بیگم صاحب جی، ذرا پھانی کے تختے دیکھ لوں؛“

”نصیبن بو، پھانی کے تختے ہمارے گھر میں تو نہیں لگے ہیں یہ“

”اے خداوند کرے کہ تمہارے گھر میں لگیں۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ تمہاری جو بھلی دلوار
ہے اس کے پرے تختے لگے ہے ہیں۔ کہو تو فدا ادھروں جا کے جانک کے دیکھ لوں؛“

نصیبن بو کے اس بیان سے زبیدہ پر انکشاف ہوا کہ پھانی کے تختوں میں نظارہ تو
اپنے گھرے کیا جا سکتا ہے۔ اس ذرا پچھلے حصہ میں جا کر دلوار سے جانکنے کی ضرورت ہے اور
اچانک اس نیک بخت کو اتنا شوق ہوا یا کہہ یجھے کہ تجسس ہوا کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ
نصیبن بو کو ساتھ لے پکھلے گوشے کی طرف چل دی۔

تحوڑی دیر میں واپس آئی، آنکھوں میں لذتِ دیر لئے ہوئے یعنی بن بو انھیک ہی

تو کہہ رہی تھیں۔ اسے یہ تو ہمارا بالکل سچپوارہ ہے۔ دیوار سے ذرا جھانگو تو سامنے ہی تختے نظر آ رہے ہیں۔ دو لوگ گئے ہیں۔ تیسرا لگ رہا ہے۔ ذرا دیکھو تو ہی جا کر دیکن میرا دہلی زبیدہ کے دہلی سے بالکل مختلف تھا۔ زبیدہ نے پھانسی کے تنخون کے بارے میں جتنی گرم جوشی دکھائی اتنا ہی میں سرد ہوتا گیا۔ دیے تو میں پچھلے دن کے اخبار یہ میں یہ خبر پڑھ کتا تھا کہ تین پھانسیاں سر عالم گئی جانے والی ہیں تو اس اطلاع پر مجھے چونکنا تو نہیں چاہیے تھا۔ شاید میں اس اطلاع پر نہیں چونکا تھا۔ جس اطلاع نے مجھے چونکا یا اور پھر سرد کیا وہ یہ اطلاع تھی کہ یہ پھانسیاں میرے گھر کے بالکل قریب دی جانے والی تھیں۔ میں نے اخبار میں خبر پڑھتے ہوئے اس پر دھیان ہی نہیں دیا کہ پھانسیوں کی جانے وقوع کوئی ہے۔ خبر میں یہ تفصیل تو دی ہوئی تھی کہ پھانسیاں جیل کے باہر سرٹک دی جائیں گے۔ اس سے مجھے کجھ لینا چاہیے تھا کہ یہ واقعہ میرے گھر کے نواحی میں گزردے گا۔ مگر میں نے ابھی تک اس بات پر بھی دھیان کب دیا تھا کہ میرا یہ گھر جیل کے نوع میں واقع ہے۔ روز میں اس سرٹک سے آتا جانا تھا۔ جو جیل کے عقب کی فصیل کے برابر برابر جملی گئی ہے۔ مگر مجھے یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ یہ سرٹک میرے مکان کے عقب میں ہے کہ اپنی پچھلی دیوار سے جھانگوں تو یہ سرٹک اور اس سے پرے جیل کی عقبی دیوار صاف نظر آئے گی میں لیکن اگر یہ بات میرے دھیان میں ہوتی بھی تو میں خبر پڑھ کر یہ کیسے لٹے کر سکتا تھا کہ پھانسی کے تختے اسی عقبی دیوار کے سامنے تلے میرے گھر کے رُخ پر نصب کئے جائیں گے اور اخبار میں تو سب ہی طرح کی خبریں آتی ہیں۔ قتل کی خبریں، غواہ کی خبریں، بم پھٹنے کی خبریں۔ مگر اخبار پڑھتے ہوئے ایک احساس یہ رہتا ہے کہ یہ سب واقعات ہم سے دور کہیں گزردے ہے جیسے کہ آج کی سب سے سنسنی خیز خبر کی جائے دار دامت عین ہمارے آشیانے کا سچپوارہ ہو گا، یہ تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

بہرحال میں اس سارے قصے پر کچھ ایسا بے مزہ ہوا کہ زبیدہ کے اصرار کے باوجود میں

اس طرف جانے اور دیوار سے جھانکتے پورا ضامن نہ ہوا۔ بلکہ زیدہ نے جتنا اصرار کیا تھا
ہی میں اس تجویز سے بیزار ہوتا گیا۔

”اے بے دلیکھ تو لو کہ تمہارے گھر کی دیوار کے اس طرف ہو گیا رہا ہے؟“

”ابس بیگم تم ہی دیکھو۔ مجھے دفتر جانتے میں پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔“ اور میں ناشرہ
کی میز سے اٹھا ایک بے تعلقی کے ساتھ دفتر جانتے کی تیاری کرنے لگا۔

ایسے سننی خیز واقعہ سے میری بے تعلقی کی وجہ ایک اور بھی تھی۔ میں جس محلہ میں رہا
محلہ والوں کی سرگرمیوں اور دلپسیوں سے میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ الگ ہی رکھا۔ لگلی محلہ
کے لوگوں کا کیا ہے، ذرا کوئی بات ہوا ان میں ایک گرمی آجاتی ہے۔ خوشگوار واقعہ ہو یا
ناخوشگوار، دونوں صورتوں میں ان کے یہاں ایک زبردست تجسس پیدا ہو جاتا ہے اور
چہ میگوئیاں ہونے لگتی ہیں۔ جس محلہ میں بھی رہا میں نے یہی دیکھا اور ہمیشہ یہ طور پر تا
کہ کبھی ان کے اس قسم کے ذوق و شوق میں ان کا شرکیں نہیں بنایا۔ جیسے میں ایسی باتوں سے
بہت بالا ہوں۔

دفتر پہنیا تو دیکھا کہ میز میز وہی ایک موضوع گفتگو ہے۔ دفتر کا کام کم ہوا پھانسیوں
پر گستاخہ ہوتا ہے۔ ہر کلرک، ہر چپری بیتاب نظر آتا تھا کہ کسی خرچ دفتر ختم ہوا وہ وہ اڑ
کر جائے دار دامت پر پہنچ جائے۔ ایسے بھی تھے کہ اٹھا سیدھا بہانہ کر کے دفتر کے ختم ہونے
سے پہلے ہی کھک لئے۔ ایسے بھی تھے: جن کا خیال تھا کہ دفتر میں آج ہاف ڈی ہوتا چاہیئے۔

”بھائی وہ کس خوشی میں؟“

”پھانسیاں دیکھنے جانا ہے جی۔ اگر پھانسیوں کے بعد ہم پہنچے تو پھر وہاں جانے
کا فائدہ کیا ہو گا۔“

کن مشکلوں سے لوگوں نے دفتر کا وقت گذارا۔ اور جب دفتر ختم ہوا تو کتنی بیتاں
سے دفتر سے دوڑ لگائی ہے۔ لگتا تھا کہ سارا دفتر اسی طرف ڈھلن جائے گا۔

گھر واپس جانے کے لئے مجھے اپنا راستہ بدلتا پڑا۔ جیل والی سڑک تو اتنی بھر چکی کہ ادھر سے مکوڑ پر گزدنا مجھے سخت دشوار نظر آیا۔ سواریوں کا ایک سیلا بامندا ہوا تھا۔ سڑک کے سپاہی اپنی اچھی خاصی نفری کے باوجود ٹریفک کو گزدروں کرتے ہیں پار ہے تھے۔ ایک تو ٹریفک کا شور، پھر ٹریفک والوں کی سیلیوں کا شور، ایک طوفان اُنہا ہوا تھا۔ کتنے اڑتے ترچھے راستوں سے گھوم پھر کر میں اپنے گھر ہبھا۔ مگر اپنی لگنی میں مبھی آج گاڑیوں کی ایک قطار لگی ہوئی تھی۔ گھر میں قدم رکھتا تو دیکھا کہ زبیدہ خواتین خاتمہ ہے۔

”زبیدہ پھانسیاں جنہیں لگ رہی ہیں انہیں لگ رہی ہیں، تمہیں کیا ہوا؟“

”لوگوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔“

”وگیوں؟“

”کہتے ہیں کہ بھت پہ جانے دو۔ دہائی سے بھانسیاں دیکھیں گے۔“

”انہیں چھت پر کوئی نہیں چڑھے گا۔“

”میں نے تو بہت منع کیا مگر کمیخت بعض تو ایسے دھیٹ نکال کر میں چلاتی رہ گئی۔ انہوں نے ایک نہ سنی۔ بھت پر ہڑھ گئے۔“

”میں نے ڈانٹ پھٹکا کر انہیں یچے آتا را اور گھر سے نکلا۔“

”ادھر کتنے پچھے دیوار پر ہڑھے ہیں۔ میری تو سنتے نہیں۔ ان سے بھی تم ہی نہیوں۔“

اور میں نے ادھر جا کر بھوول کے کان امشٹ۔ ڈانٹ پچھ کر کے انہیں بھنگایا۔

پھر محلہ کے باہر کے لوگوں سے جو لوگاتار چلے آرہے تھے نبیا۔ پتہ نہیں شہر کے کس کونے کھڑے سے لوگ نکلنکھل کر آرہے تھے۔ ان کا تانبا تو ساری نہیں تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دروازے پر جانا نو ولدگی الیا اور ڈکاسا جواب دے دیتا کہ نہیں صاحب یہ گھر ہے تماشاگاہ نہیں ہے۔

یک دفعہ پھر دروازے کی گھنٹی بجی اور ساتھ میں کسی نے دھرڈھرڈ دروازہ پینا شروع کر دیا۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ جبکی کو دیکھا۔ روکھے پن سے پوچھا۔ فرمائیے۔
نجا جبت سے بولا۔ ”اگر آپ تھوڑی مہربانی کریں اور اک فرما جازت دیں تو
میں آپ کی چھت ۰۰۰۔“

میں نے بے صیری سے اس کی بات کافی۔ آپ کو پتہ ہونا چاہئے کریے گھر ہے۔ یہاں
شریعت لوگ رہتے ہیں۔ آپ لوگوں نے اس گھر کو کیا سمجھا ہے؟“
”ویکھئے، آپ بُرا مان گئے۔ قصہ یہ ہے کہ میں بہت دور سے آ رہا ہوں۔“

”بہت دور سے؟ کہاں سے؟“

”فیصل آباد سے۔“

”اسی کام کے لئے آئے ہیں؟“

”جی ہاں۔ یہی سوچا تھا کہ ذرا آونٹگ ہو جائے گی۔ پھانیاں بھی دیکھ لیں گے۔
یہاں آ کر دیکھا تو یہاں سے دیاں تک آدمی ہی آدمی ہے۔ کہیں قدم لکانے کو جگر نہیں
مل رہی۔ میں نے سوچا کہ آپ سے اپیل کر دیکھوں کہ آپ اپنی چھت سے مجھے دیکھنے کی
اجازت دے دیں۔ نہیں تو میرا فیصل آباد سے آنا بیکار جائے گا۔ جانے کتنے ضروری کام
چھوڑ کاپا ہوں۔“

”جی نہیں۔“ میں نے قطعی جواب دیا اور دروازہ بند کر لیا۔ مگر ابھی دروازہ بند کیا
ہی تھا کہ پھر گھنٹی بج گئی۔ بس پھر تو میرا پارہ بالکل چڑھ گیا۔ بھنا کر دروازہ کھولا جیسے
چھوٹتھے ہی آنے والے پر جیپٹ پڑوں گا۔ مگر سامنے اپنا کام رید کھڑا ہتا۔ میں چران رہ
گیا۔ ”کامرید، تم بھی؟“

”ہاں یا رہ، میں نے سوچا کہ تماشہ ہی سہی۔“

میں نے اسے انہوں بلاتے ہوئے اطلاع دی کہ میں نے کسی کو چھت پر چڑھنے نہیں دیا۔

نہ دیوار سے بھانکنے کی اجازت دی ہے۔

”کون بھڑوا تمہارے گھونسلہ کو گھونڈنے اور دیوار کو پھاندنے آیا ہے؟“ کامریڈ نے
ہمارے آشیانے کو گھونسلہ کہنا شروع کر دیا تھا۔

”مگر بھر تم پھانسیوں کا تماشہ کیسے دیکھو گے؟“

”کامریڈ، تماشہ تو میں دیکھتا ہوا آ رہا ہوں۔ لوگ پھانسیوں کا تماشادیکھنے کے لئے
اپنے عمل رہے ہیں۔ میں پھانسیاں دیکھنے والوں کا تماشادیکھتا ہیاں چلا آیا۔ کامریڈ
بہت خلقت امندھی ہوئی ہے۔“

میں نے جمل کر کہا ”کامریڈ، یہ سب سالے تمہارے عوام ہیں۔ جن کا تم اٹھتے بیٹھتے
قیصیدہ پڑھتے ہوئے۔“

کامریڈ نے میری بات کو سنی ان سنی کر دیا۔ کہنے لگا یہ میں کہتا تھا تو تمہیں لقین نہیں
آتا تھا۔ اب تو تم اندازہ کر سکتے ہو کہ کوڑے لگنے کے موقعہ پر تماشادیکھنے کے لئے کتنے لوگ
جس ہوتے ہوں گے۔“

”کمال لوگ ہیں۔“

”اس شہر کے لوگ۔ کہتے ہیں کہ جب نادر شاہ نے دلی میں قتل عام کا حکم دیا اور یہ
خبر یہاں پہنچی تو ایک زندہ دل نے دوسرے سے کہا کہ چلو چلنے۔ چل کے دلی میں قتلام کا
تماشہ دیکھیں۔“

اکی گھری زبیدہ گھرانی ہوئی آئی۔ اب کیا تم نے گیٹ کھول دیا ہے۔“

”نہیں تو۔“

”چھت پر تو لوگ چڑھتے بیٹھتے ہیں۔ کبھیت چھت ہی کونہ لے بلیں جاؤ اور دیوار
پہ بچے لدے ہوئے ہیں۔ دیوار آج غرور بیٹھ جائے گی۔“

”میں اٹھنے لگا تھا کہ کامریڈ نے لوگ دیا یہ بیٹھ جاؤ کامریڈ۔“

”نہیں یا ر، ان لوگوں کا کچھ انتظام کرنا پڑے گا۔“

”ان لوگوں کا اس وقت کوئی انتظام نہیں ہو سکتا“

”کیوں نہیں ہو سکتا؟“

”اس وقت لوگوں کا ریلا آیا ہوا ہے۔ جب لوگوں کا ریلا آتا ہے تو پھر تم جیسے بورڈ والوگ آئے نہیں رک سکتے۔“

میں نے کامریڈ کو طنزی نظروں سے دیکھا۔

”ہاں ہاں میں سمجھ گیا۔ تم کیا کہتا چاہتے ہو۔ آج ریلا غلط آیا ہے۔ کل کو صحیح آئے گا۔“ کامریڈ نے فوراً ٹکڑا لگایا۔

”میں بے ساختہ ہنس پڑا۔“ تم لوگ خیال پلا فرپکانے میں جواب نہیں رکھتے۔“

گھنٹی پھر زجھی۔ میں نے جا کر گیٹ کھولا تو ایک بوڑھیا ایک ننھے بچے کا ماں تھا پڑتے کھڑی تھی۔ بڑی بڑی بی کیا بات ہے؟“

”پیتر مجھے تو دیکھنے دکھانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ مگر یہ میرا پوتا بہت ضد کر رہا ہے۔“

ہے کہ چھانسیں دیکھوں گا۔ تو پیتر ذرا ایس بچے کو دکھاتا ہے۔“

بڑی بی نے اتنی بیاجت سے بات کہی کہ میرا دل واقعی پسیج گیا۔“ جاؤ بڑی بی۔

تم بھی تماشہ دیکھو، اپنے پوتے کو بھی دکھاف۔“

بڑی بی نے مجھے بہت دعا میں دیں اور پوتے کا ماں تھا پھر ٹے پکڑے پچھوادٹے کی دیوار کی طرف چلی گئیں۔ اور نصیبن بوانے تو صبح ہی اپنا حتی منوا یا تھا۔ اب انہیں مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت تھی۔ وہ بے تکلف آئیں اور زبیدہ کو ٹھہوکا۔ اے سیکم صاب پچھانیسوں کا ولیا ہو رہا ہے۔ یہ کام کا کوئی سادقت ہے۔ زبیدہ پہلے ہی عجلت میں تھی۔ نصیبن بوانے کے فقرے نے اس پر قبھی کام کیا۔ لیک جیک چائے ٹرستے ہیں سجا میرے سامنے رکھ دی۔ ”آپ چائے پئیں۔ میں ذرا پچانیساں دیکھ آؤں۔“ اور یہ جاوہ جا۔

زبیدہ کے جانے کے ساتھ ہی میں نے پچانیسوں کی طرف سے سمجھ لیجئے کہ ذہنی

فراغت پالی۔ یار کامریڈ، چھوڑ واس قصے کو پھانیاں تو لگتی رہیں گی۔ اُوہم اپنی باتیں کریں ॥

اشارے کی دیر تھی۔ بس کامریڈ والی ہو گیا۔

ایک دم سے کتنی بائیں کر دالیں۔ رُکا ہوا بھی تو کتنے دنوں کا تھا۔ ایک زمانے میں روز ملتا تھا اور کتنا بولتا تھا۔ اس پر کیا موقع تھا سب ہی دوست روز اکٹھے ہوتے تھے فاروق، ظہور، ممتاز اور ہم سب دوست اپنے کامریڈ کے حساب سے بورڈ والی رجعت پسند اور نوالی پسند اور نہ جانے کیا کیا تھے۔ کامریڈ کرتا ہو گا کسی زمانے میں پارٹی ورک۔ مگر نہ اب پارٹی تھی اور نہ وہ ورگر تھا۔ بس ہمارے درمیان بچنا ہوا تھا۔ بائیں کرتا تھا اور مستقل لیکر دیتا تھا کہ بائیں کرنے اور کتابیں پڑھنے میں کچھ نہیں رکھا۔ ایکشن ہونا چاہتے ہم اس کے آنے سے پہلے ظہور کو انقلابی سمجھا کرتے تھے کہ وہ اُنھیں بیختنے مارکس کا حوالہ دیتا تھا اور ہمیں موقع پرست ثابت کیا کرتا تھا۔ مگر کامریڈ نے آگئے بھی بیختنے مارکس کا حوالہ دیتا تھا اور ہمیں موقع پرست ثابت کیا کرتا تھا۔

”یار کامریڈ، ظہور کے بارے میں تو تم یہ نہیں کہہ سکتے۔ وہ تو تمہاری آئیڈیا لوچی کا مانتے والا ہے“

”مانے سے کیا ہوتا ہے۔ اصلی چیز ایکشن ہے۔ ایکشن۔ بجائی سے مارکیڈ پر بائیں کروالو۔ ایکشن کے نام صفر ہے“

بس اسی رنگ میں بولتا چلا جاتا۔ ایک ایک دوست کا احتساب کرتا۔ دوستوں کی مندرجی بھری تو وہ بھی نظروں سے اوچھل ہو گیا۔ خیروہ مہینے پندرہ روائی میں صورت ضرور دکھا جانا تھا۔ دوسرے تو بالکل ہی نظروں سے اوچھل ہو گئے۔ لیں تتر بتر ہو گئے۔ کوئی دور کے دیسوں میں نکل گیا۔ کوئی ملک ہی میں رہ کر عزم رونگار کی غذا بن گیا۔

”میں نے پوچھا۔“ یار کامریڈ، کچھ ممتاز کا بھی اتا پڑتے ہے۔ کہاں ہے آج کل؟“

”اسی شہر میں“

”اچھا؟ — آگیا واپس؟ عجیب آدمی ہے۔ اگر بتایا بھی نہیں“

”اب وہ اوپنی ہواؤں میں ہے“

”اچھا؟“

”ہاں۔ خیر میں نے تو اس کے مزاج درست کر دیتے۔ پہلے تو وہ نیڑتے ہی نہیں لگنے دے رہا تھا۔ جب میں نے بات کی یہی کہتا کہ یار میں ابھی چنسا ہوا ہوں۔ دفتر قائم کرلو۔ پھر بات ہو گی۔ میں نے دل میں کہا کہ کامریڈ، یہاں سیدھی انگلیوں سے لٹھی نہیں نکلے گا۔ تو بس ایک دن میں نے اُسے دھر لیا کہ پیارے شیوخ کے بوٹوں کے تسلیے باندھ باندھ کے تو بھی فل بوٹ بن گیا ہے۔ اس حرام کی کمائی میں سے کچھ زکوٰۃ و کات نکال دے۔ لب سیدھا ہو گیا۔ میں نے اس سے تھوڑا بہت اینٹھہ رسی لیا۔ بھاگتے بھوت کی نگولی؛“

کامریڈ جاری تھا کہ زبیدہ آن پسنجی۔ آتے ہی اطلاع دی ”لگ گئی پھانسی؟“

”لگ گئی؟“ کامریڈ اپنی باشی بھول کر زبیدہ کی طرف متوجہ ہو گیا ”تینوں کو؟“

”ہاں تینوں کو۔ ابھی تک لٹکے ہوئے ہیں یہ“

”اچھا۔ چلو ہٹنا مک گیا“

باہر کم دم سے رٹینک کا شور ہوا۔ جیسے سینما ٹوٹا ہو۔ بحث پر چڑھتے ہوئے لوگ اور دیوار پر لرے ہوئے بچے بھی اتر اتر کے جانے لگے۔ بوڑھیا بھی پوتے کو اپنی انگلی پکڑا ہے واپس ہوتی نظر آئی۔ ”ہائے بد نعیب جوان جہاں دنیا سے گئے؟“ اور افسوس کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔

”اچھا میں چلا ہے کامریڈ کہ بولتے چیز ہو گیا تھا ایک دم سے اُندھ کھڑا ہوا۔

”کیوں؟“

”بس، کھیل ختم پیسہ سہضم۔ پھر میں گے۔“

اب شام ہونے لگی تھی۔ باہر پنگ کا شور دھما پڑیا تھا۔ ادھر جمیت پہ بھی اب کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ دیوار پہ بھی کوئی بچہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ زبیدہ نے ایک مرتبہ پھر دیوار کا رُخ کیا۔ بوجان نے ٹوکا۔ ”دلہن دونوں وقت مل رہے ہیں۔ اب اس طرف مت جاؤ۔“

”بس بوجان ابھی آئی۔“

اور واقعی زبیدہ جلدی ہی واپس آگئی۔ والپس اگر اطلاع دی یہ ابھی تک لکھ ہوئے ہیں۔“

”ہوں۔“ میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اس پر اپنے ردِ عمل کا کیسے اظہار کروں۔ ”اب جا کے دیکھ لو۔ اب تو سب لوگ چلے گئے ہیں۔ ہماری دیوار سے سب کچھ نظر آتا ہے۔“

”اس میں دیکھنے کی کوئی بات ہے۔“ میں نے اک ذرا اپنی بے تعلقی ظاہر کرتے ہوئے لہا اور اندر کمرے میں چلا گیا۔ وہاں دیکھا کہ بوجان جانماز پہ بیٹھی ہیں اور دعا کے لئے انہوں نے دونوں ہاتھوں سے روپے کا پورا آنچھل پیسلا رکھا ہے۔

نیند تو آنہیں رہی تھی۔ میں نے سوچا لاڈ میاں جان کے کاغذات بی لگے ہاتھوں ترتیب دے لیں۔ اس روز کے بعد میں نے اس مسودے کو ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا۔ خیرے کر تو بیٹھ گیا اور بہت دیر تک اٹ پٹ کرتا رہا مگر دماغ اس وقت حاضر نہیں تھا۔ رکھ دیا کہ کل پرسوں اطمینان کے ساتھ اسے پڑھوں گا۔

کرسی سے اٹھ کر پنگ کی طرف بڑھا۔ کہیں برآمدے سے باہر صحن میں نظر جا پڑی دیکھا کہ بوجان کھڑی ہیں۔ میں حیران کر اس وقت صحن میں کھڑی کیا کر رہی ہیں۔ غوم سے دیکھا تو مترہ ہی مترہ میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔ جب پڑھ جکیں اور اندر آتے لگیں تو میں نے پوچھا۔ ”بوجان، کیا پڑھ رہی تھیں؟“

”بیسے حصہ اگھنے پڑھی۔ العدایں گھر کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔“

میں اب سونے کے موڑ میں تھا۔ خیسہ جا تو لیٹا مگر نیند نہیں آئی۔ جیسکی آئی بھی تو دوسرے آئی ایک آواز نے اسے منتشر کر دیا۔ میں نے باہر برآمدے میں نکل کر پچھلی دیوار سے پرے نظر دو دیا۔ آواز اسی طرف سے آرہی تھی۔ میں نے اب سے پہلے کبھی اس طرف کا دھیان سے جائزہ ہی نہیں لیا تھا۔ جیل کے احاطہ کے زیچ ایک اونچی برجی جس میں پہریدار ایک باتھی میں لاٹیں دوسرے باتھی میں موٹا سالٹھی لئے گھرا تھا۔ بار بار لاٹیں اونچی کر کے ہلاتا، لہو فرش پر پھانا اور آواز لگاتا۔ ”خبردار۔ ہوشیار۔“ اس آواز نے مجھ پر عجیب اثر لگایا۔ دل جیسے بیخود رہا ہو۔ تھوڑا تھوڑا در۔

میں واپس آکر آن لیٹا۔ لیکن کھٹ پٹ سے زبیدہ کی آنکھ کھل گئی۔ ”اخلاق آن

تم سو نہیں ہے؟“

”نیند نہیں آرہی تھا اور ذرا تأمل کے بعد آہستے

“زبیدہ؟“

”ہاں۔ کیا بات ہے؟“

”زبیدہ گھر ہم نے بنایا تھا مگر...“

”زبیدہ نے چکرا کر مجھے دیکھا۔“ پھر؟

”پھر میں یہ سوچ رہا تھا۔“ میں نے رُکتے رُکتے آخر کہہ ہی دُلا۔ یہ گھر تو باکل جیل کے سامنے میں ہے؟“

”زبیدہ نے غور سے مجھے دیکھا۔“ کوئی خواب دیکھا ہے؟

”خواب؟... نہیں۔ میں ایوں ہی خیال آگیا۔“

”کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ بہت رات ہو گئی ہے۔ سوچاؤ؟“

میں چپ ہو گیا۔ آنکھیں موندر کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ زبیدہ نے کروٹلی۔ اور خڑائے لینے شروع کر دیئے۔

صاحبوہم فلک کے ستائے ہوئے ہیں، زمانے کے راندے ہوئے ہیں۔ ارے ہم تو
 اسی روز آسمان سے زمین پہ آپڑے ملتے جس روز گردشِ دوراں نے سماں جہاں آباد
 سے ڈھکیل کر بُرَن کے ویرانے میں جہاں بارہ بارہ کوس پر چرانٹ جلتا تھا لا پھینکا تھا۔
 واں پہ ہمارے اجداد عرش میں تھوڑتے تھے۔ طبِ گھر کی وونڈی تھی۔ خاک ان کی چیخی
 میں آگر اکسرین جاتی تھی۔ قریبِ دور سے مایوس العلاج مریض آتے تھے اور کامل شنا
 پا کر جلتے تھے۔ دوبارے پرانا تعلق چلا آتا تھا۔ یہ دستورِ ٹھہرا تھا کہ جو خاندانی مندرجہ بیٹھتا
 وہ شاہی طبیب بھی قرار دیا جاتا۔ مندرجہ پہ بیٹھنے والا ان مخطوطوں کا بھی وارث ہوتا
 جو ہمارے جدراً علیٰ حکیم علی شیری سیhan قریب دین سے بخل میں داب کر لائے تھے۔ ان مخطوطوں
 میں ایسا انسخہِ دلخواہ کہ آخری دموں میں مریض کو پلا دیا جائے تو اسی دم اُنھوں کھڑا ہو۔
 جدراً علیٰ حکیم علی شیری سیhan کے بعد سب سے بڑھے پڑھے حکیم ہمارے پردادا حکیم
 گلستان علی تھے کہ مسحِ دوراں کا مرتبہ رکھتے تھے۔ گوشہ بھی طبیب تھے مگر جہاں آباد
 کی ساری خلقت ان سے فیض پاتی تھی۔ دور پرے کے شہروں سے بھی جیسے سے مایوس
 مریض ان کے مطب میں پہنچے تھے اور عمر خشر کی ضمانت لے کر جاتے تھے۔ خلقت ان کے

نام کا کلمہ پڑھتی تھی۔ قلعہ معلیٰ کے شہزادے شہزادیاں الگ ان کی گرویدہ تھیں۔ اسے جانو
 ان کی شہرت توجیات تک میں پہنچی ہوئی تھی۔ یہ بات میں پہنچے مفرز سے آثار کرنہیں کہتا
 آس جانی کی بھی دہرا ماؤں۔ ایک دن میں نے اس اجمال کی تفصیل پوچھی تو اماں جانی نے
 یوں بیان کیا کہ بیٹے ایسا ہوا کہ ایک روز شام پڑے ایک اجنبی مطب میں آیا اور گھر گذا کر
 کہنے لگا کہ مریض آخری دموں پر ہے۔ اپنی مسیحائی سے اسے بچا لیجئے۔ تمہارے پردادا
 کے دل پر اس کے گڑگڑانے کا بہت اثر ہوا۔ جیسے بیٹھے تھے دیے ہی اُس کھڑے ہوئے
 اور اجنبی کی لائی ہوئی سکھپال میں جا بیٹھے۔ تھوڑی دور چلے ہوں گے کہ اسے لویر تو گھنی
 بنی آگئی۔ رات کا ستائنا۔ دور دور تک آدمی تر آدم زاد، شیروں کی دہاڑ، ہاتھیوں کی
 چنگھاڑ، تمہارے پردادا نے تشویش سے باہر نظر دور ہانی۔ اجنبی سے کہا کہ میرے عزیز
 تم ہمیں کہاں کالے کوسوں لے آئے ہنزل کتنی دور ہے۔ اجنبی نے مردگر نظر ڈالی تو
 تمہارے پردادا نے کیا دیکھا کہ اس کی صورت تو بکرے والی ہے۔ بہت حریان ہوئے
 کہ وہ آدمی کون تھا، یہ جن اور کون ہے۔ یہ سوچتے تھے کہ سکھپال ایک بڑے سے بھائیک
 میں داخل ہو گئی۔ سکھپال سے اُترتے۔ دیوان خانے میں گئے۔ مریض پچھپر کھٹ پہ
 چادر تانے لیٹا تھا۔ چادر اُنہی تو حقیقی رہ گئے۔ چہرہ مور کا، ٹانگیں ہرن کی سمجھ گئے
 کہ یہ غیر مخلوق ہے۔ اصل میں وہ جنوں کا شہزادہ تھا۔ تمہارے پردادا نے سکون کے
 ساتھ اس کی نہنگ دیکھی، پیشانی کو چھوڑا۔ تیمار داروں سے کہا کہ شیر ببر کے لگلے پنجہ کا
 تاخن مہما ہو جائے تو مریض شاید بچ جائے ورنہ رات رات کا ہماں ہے۔ ایک لمبا
 تڑنگا جن اُسما اور غائب۔ پھر دم کے دم میں حاضر۔ شیر کا تاخن لا کر بیش کر دیا۔ تازہ
 تازہ خون رکا ہوا جیسے ابھی زندہ شیر کے پنجے سے کھینچا ہو۔ تمہارے پردادا نے تاخن
 کو پھر پہنچا، شہد میں گھولہ اور مریض کو چڑا دیا۔ اے لو مریض نے آنکھیں کھول دیں۔
 ادھر مریض پریشان گھروں کے حریان کے حکیم صاحب کہا گئے۔ اے لو جو تھے دن

ہش اش بشاس پھلے آئی ہے میں سا تھے میں گدھوں پہ لدی ہوئی ملکیاں۔ ہر ملکی اش رفیوں سے
لبالب بھری ہوتی۔ ادھر ملکیاں آتا ری گئیں ادھر گردھے غائب۔ پھر تو بیسے جنون کو ساوائی
پڑ گئی۔ جس کی طبیعت خراب ہوتی آکر نبض دکھاتا، دوا لیتا اور سونے کی دلی نذر کر جاتا
ارے جبھی تو تمہارے پردادا کے گھر میں الغاروں پریسہ تھا۔ ایسی حوالی بنائی تھی کہ کیا
راجوں ہمارا جوں کے محل ہوں گے۔ محل تو تھا ہی۔ گلستان محل پسج پنج گلستان محل تھا۔ مگر
سب کچھ قدر میں غارت ہو گیا۔

غزیزوہ غدر میں غارت ہونے کی صورت یہ ہوئی کہ آباجانی کے تایا حضور مولوی
پٹھاں علی نے کہ اپنے وقت کے صاحب ضمیر عالم دین تھے۔ فرنگوں کے خلاف جاری
ہونے والے جہاد کے فتوے پر دستخط کر دیئے تھے۔ جب رہائی کا پانسہ پٹا تو شریفوں روشن
ضمیروں کی شامیت آئی۔ برٹے تایا حضور پچانی پر پڑھ گئے۔ دادا جانی حکیم گل زبان
علی خاندان کو سمیٹ رات کے پردے میں اس آفت زدہ شہرے نکل گئے۔

دادا جانی اہل خاندان سمیٹ خاک بربے گھر بے در پھرتے پھرے۔ مگر بڑن کے
غلائقے گزرتے گزرتے پکڑے گئے۔ اس احصار قریئے نے جواب ہمارا مسکن ہے:
داوا جانی کے قدم پکڑ لئے۔ بس وہیں دیئے دال دیئے۔ آباجانی بیان کیا کرتے تھے
کہ ان دنوں یہ بستی احصار ویران تھی۔ مسٹھی بھراہی ہنود۔ جہاں تھاں مسلمانوں کے گھر
باقی اشجار بے شمار تھے۔ مگر ان میں کوئی قریئہ نہیں تھا۔ زلا جنگل تھا۔ نہ امر شیاں نہ کوئی
پھولتا ہبکتا باغ۔ ایں بھڑ بیری کے بیر پسیروں کے حساب سے سمیٹ لو۔ آم بھی تھے
مگر کاشھا آم۔ قلمی آم کہ تراش کر سلیقہ سے کھایا جا سکے ناپید تھا۔ بازار میں گڑ کی بھیلیاں
بہت دکھانی دیتی تھیں۔ قندوں بیات کی شیرینی سے یہ قریئہ نہ آشتا تھا۔ قند غائب شکر قند
بہت، سواری کے نام نہ نالکی نہ پالکی نہ ذولی۔ چکڑے چلتے تھے۔ کبھی کوئی دھر دکھانی
دے جاتا تو عورتیں گھروں کی دلیوڑ جی پر آکر تعجب سے دیکھتیں کہ دختر جا رہا ہے۔ ہاتھی

پوری بستی میں ایک تھا کسی ہندو سا ہو کار کا جب پوکھر پہنچانے کے نئے نکلا تو بستی کے پھوٹوں کی عید ہو جاتی۔

دادا جانی نے یہ سارا نقشہ دریکھا لیکن ذرا جو بے دامغ ہوئے ہوں۔ ڈیرا ایک دفعہ دُل لیا تو بس دُل لیا۔ پھر وہ اس دیار میں جم کر بیٹھے۔ مسحی میں بستر تھا۔ پا تھا میں شفا تھی۔ مرسین جنم جنم کے روگ لے کر آتے تھے اور شفا کی سند لے کر جاتے تھے۔ ان کی میحانی کی خبر دو رونز دیک ایسے بھیلی جیسے خوشبو پھیلتی ہے۔ بس اسی کے ساتھ اُسے بستی کا نقشہ بھی پہلنے لگا۔ دادا جانی کی بھی آئی تو بستی میں گویا ایک انقلاب آیا۔ یہ سواری یہاں کی خلقت نے پہلے بھدا کا بے کو دیکھی تھی۔ سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جانتا چاہئیے کہ جب کسی بستی میں کوئی نئی سواری آتی ہے تو اس کے ساتھ ہی بستی کا طور بدل جاتا ہے۔ تو بس ہمارے دادا جانی کی بھی کے ساتھ اس دیار کی کایا پلٹ ہو گئی۔

برن کے پورے علاقہ میں چڑھاتا کہ اس نواحی میں ایک میجانفس طبیب آیا ہوا ہے۔ ہوتے ہوتے یہ خبر حاکم ضلع کی سیم صاحب تک پہنچی۔ سیم صاحب کا حال بہت پُلا تھا۔ حمل محہر تھا تھا مگر ساتویں مہینے کے آتے آتے صنائع ہو جاتا تھا۔ ڈاکروں سے بہت ملاج کر رہا۔ مگر اس بی بی کے مقدار میں تو شفا کہیں اور لکھی تھی۔ دادا جانی کو طلب کیا گیا۔ دادا جانی میں مہینے تک سیم صاحب کو غیرے معجونیں چھاتے رہے۔ بعد اس کے گزارش کی کہ سیم صاحب اب آپ بعد شوق کلکر ٹھہار دام اقبال کے پاس جائیں۔ حمل محہر ناشرد ہے۔ گرجانے تو میرا ذمہ بیٹک ہرنی کی طرح کو دنی چھاندنی پھر شیئے۔ اندر والے کے نئے کوئی جو کھوں نہیں ہے۔

دادا جانی نے جیسا فرمایا تھا دیسا ہی ہوا۔ گلگو تھا سالال پیدا ہوا۔ سیم صاحب بہت مسرور ہوئیں پوچھا ویل حکیم شاپ کیا نیس مانگتا ہے۔ دادا جانی نے بعد ادب عرض کیا کہ فرت مدد بنت آپ کو مبارک ہو۔ یہ ما جز صرف نظر کرم چاہتا ہے۔ پھر حوال

خاندان کے عتاب میں آئے کا گوش گزار کیا۔ سیم صاحب نے شوہر نامدار کے کان میں بات ڈالی۔ کلکٹر بہادر دام اقبال نے اپنے حاکم و فرنگیاں اثر و رسوخ کو استعمال میں لایا کہ معافی تلقی کر دیتی۔ ادھر عکھ کی طرف بھی عام معافی کا اعلان ہو گیا جملہ کو ملکہ کے ٹھف و گرم نے بوٹ لیا۔ دادا جانی اس نیک ہنر ملکہ کے اخلاقِ حمیدہ سے اتنے متاثر ہوئے کہ درج میں اس جواب کے ایک قصیدہ رقم کیا اور کلکٹر بہادر کی خدمت یا برکت میں بھجوایا۔ اس جانب سے توقع سے بڑھ کر قدر دلائی ہوئی اور انعام و اکرام کی بارش ہوئی۔ حاذق الملک کا خطاب عطا ہوا۔ المختصر ادباء کے دن ٹھل گئے، عتاب کے بادل چھٹ گئے۔ ہمارا خاندان سلطنت انگلیسیہ کی نظر میں سرخ رو ہوا۔ پھر خوش حالی کے دن آگئے۔ دادا جانی اب اس دیا میں درج بس گئے جویلی کی تعمیر کی۔ جب جویلی بن کر کھڑی ہوئی اور نام اور تاریخ تعمیر کا ستر لگانے کا وقت آیا تو ابا جانی کو بلکہ فرمایا کہ فرزند، ہمارا زمانہ جہاں آباد تک تھا۔ اب تھہارا زمانہ ہے۔

نگر تعمیر تھا اسے نام دئے گا۔ یوں جویلی کا نام چراغ جویلی رکھا گیا۔

دادا جانی چراغ جویلی کھڑی کر کے خود ڈھینتے چلے گئے۔ دنیا کے قصوں بکھر دوں سے منہ مور ڈکر خانہ نہیں ہو گئے۔ جتنے دن چھٹے گستاخ محل کو یاد کر کے گریہ کرتے رہے۔

خطب کو بھی سلام کر لیا۔ عذلانج معا الجہ سے منہ مور لیا۔ ہر دم ہاتھ میں تیسیخ، یادِ خداوندی اب خاندانی منہ پر ابا جانی حکیم چراغ علی رونق افروز رکھتے۔ کیا دبدبہ تھا۔ ان کے پیشاپ پر چراغ جلتا۔ تشیص کی دھوم دور دور تھی۔ ہاتھ میں کچھ تاثیر تھی کہ خاک کی چشک بھی مرفق کو دے دیتے تو ہفتے پندرہ دارے میں بجلما چنگا ہو جاتا۔ ڈاکٹروں نے بہت زور مارا مگر ابا جانی کے مقابلہ میں ڈاکٹری کا چراغ نہیں جلا۔

روایت کی این حالت نے عبداللہ عمر و بن عاصی سے کہ جب دے دنیا عدم سے وجود میں آئی ہے۔ تب سے آغاز ہیں ہر صدی کے فتنہ کوئی نہ کوئی ضرور بپا ہوا ہے۔

اس پیچ پیچ میں مشاق علی یہ بولنے کی جارت کرتا ہے کہ پھر تو بسم اللہ ہی عذله ہو گئی

آغاز ایسا ہے تو ان جام کیا ہو گا۔ دور کیوں جاؤ یتی صدی کے دم آخر کی مثال سامنے ہے۔ جب فیقر نے ہوش کی آنکھ کھولی تو صدی دم توڑ رہی تھی اور فتنے دم میں آہ ہے تھے۔ ایک فتنہ دہریت کا، ایک فتنہ نیپریت کا۔ پھر آگے چل کر ایک ڈھونگ دخونی بیوت کا، ایک شگوفہ مہدی موعود کا۔ کوئی فتنہ احاطہ پنجاب سے اٹھا، کوئی شگوفہ دیارِ علی گڑھ سے بچوں والوں دینا فتنوں سے بھری ہوئی تھی اور اسلام خطرے میں تھا۔ ابا جانی نے برا در خور داشتیاق علی اور اس زیع مدان کو یہ خیال کر کے علی گڑھ کا لج بھجوادیا تھا کہ جب فرنگوں کے راجح میں رہنا ہے تو ان کی گٹ پٹ کو عین سیکھیا جائے۔ انہوں نے اپنے طور پر نیکی کی تھی کہ کسی فور اولاد کی دنیا سنبھل جائے۔ یہ کب گمان تھا کہ اشتیاق میاں دنیا کے پیچے دین کی دولت گنوانے پہل جائیں گے۔ علی گڑھ جا کر ان میاں کے پر نکل آتے۔ اونچا اُرنے لگے۔ واپس اس رنگ سے آئے کہ درد حنپھر رطب اللسان تھے۔ اماں جانی ہرنی کا معجزہ بیان کر رہی تھیں کہ وہ میاں زیع میں ٹر سے بوئے کہ یہ قادر تو خلاف نیچر ہے۔ اماں جانی نورِ نظر کا یہ کلام سن کر دم بخود رہ گئیں۔ خیر انہوں نے تو اپنی طرف سے پردہ ڈانے کی بہت کوشش کی۔ مگر عشق اور مشک کی طرح فتنہ کی بات بھی چھپی نہیں رہتی۔ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ ہونٹوں نکلی کوئھوں پڑھی۔ دوسرے دن ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر تھا کہ حکیم چرانی علی کا بیٹا نیچری ہو گیا۔ اماں جانی نے لاچا رہا جانی کے گوش گذار کیا کہ لاڈے میاں نیچری ہو گئے ہیں، برا دری میں تھری تھری ہو رہی ہے، جو سنتا ہے دانتوں میں انگلی دباتا ہے۔ ابا جانی نے تامل کیا اور فوراً ہی میاں کو کان سے اٹھوا یا۔ ان میاں نے بہت زاری کی مگر ابا جانی نے دلوں کے فرمایا کہ فرنگ، تمہیں نیچری بنائے ہیں اپنی عاقبت خراب کرنی منظو نہیں ہے۔

مگر بڑے خالو نجم الہدی خود امور دین سے بے نیاز تھے۔ رنگ فرنگ میں غرق

تھے۔ فرزند کے بارے میں خبریں نہیں۔ ہر خبر کو ایک کان سنا، دوسرے کان اٹھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمہاری علی گڑھ سے نبے دہریہ بن کر نکلے۔ ہماری چھوٹی بچوچی سے ان کی نسبت محہری ہوئی تھی۔ اب جوان کی دہریت کی خبر بدآباجانی کے کانوں تک پہنچی تو انہیں فکر لاتھی ہوئی کہ ہمیشہ عزیزہ کا یا تھا لیکہ دہریت کے یا تھے میں کیسے پکڑا دیں۔ اخراں امیر بڑے خالوصاحب کو بطریق شاستہ کہلا بھیکریہ دیتا دوں کا گھر ایسا ہے، دہریہ داماد کا متھل نہیں ہو سکتا۔

پھر شادی ہماری چھوٹی بچوچی کی لکھنوں کے ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ سے ہوئی کہ اسم گرامی ان کا قبر حسن تھا کہ اب مرحوم و مغفور ہیں۔ طبیعت شاستر طینت پاکنہ پائی تھی۔ تھے بھی تو ماشا اللہ خانم کے تربیت یافتہ خانم نے بھی ان کی خاندانی شرافت و نجابت کو مخونظر کھتے ہوئے اور ان کے والد گرامی فخر الواقفین مولانا شبر حسن سے زمانہ شباہ کے تعلقی خاص کو حافظہ میں لاتے ہوئے ان پر توجہ خاص کی تھی۔ مجلسی آداب سکھا تے پاکنہ کا سبق پڑھا یا۔ خانم کی بیٹیاں واہ واہ سبحان اللہ۔ ایک آفتاب تو دوسرا میہماں پاکنہ کے چھوچھا عضور اس بالاخانے پر پہنچے تھے تو دونوں بھنی کھیاں تھیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے شلگفتہ ہوئیں۔ میک ان کی چار سو گئی۔ جھونزے اڑکر دور دور سے آئے۔ مگر دور ہی دور منڈلا تھے۔ خانم نے کسی کو قریب نہیں پہنچنے دیا۔ کیا ہٹھا تھا خانم کا پیشہ اس کے چراغے جلتا تھا۔ محفل کا کیا رکھا تھا کہ ہمہ شما کا کیا مذکور۔ نوابوں کا بھی وہاں گزر مشکل سے ہوتا تھا۔ مولانا شبر حسن تو زمانہ شباہ میں اہل علم کے گھرانے سے نسبت رکھنے کے باعث بار پاگئے تھے۔ مگر بس ذاتِ اللہ پہنچا اور محفل سے دامن جھانڈ کر اٹھنے پھر ان کا ذہن ہی بدل گیا۔ اس محفل سے اٹھنے محفل و خط میں جاتی تھی۔ پھر اسے اس محفل کے ہوئے کہ خود اس راہ پر چلنے کے اور فخر الواقفین کہلانے۔ مگر خانم نے دفعہ دار کو آندر دقت تک نبھایا۔ ہمارے پھوپھا قبر حسن ابھی کمن تھے کہ انہیں اپنے سایہ عالمت

میں لے لیا۔ تو اس جناب نے اس بلند بام بالاخانے سے تہذیب سکھی۔ دہیں تیسروں پارے
ان کچی کلیوں کے ساتھ بیٹھ کر ختم کئے۔ عروض سکھا۔ مُسوں کی تعلیم لی۔ چند برسوں ہی میں
دخل میخدگے۔ خام گئے تھے، ترش کر آئے۔ طبیعت حسن پرست، باطن مثل آئینہ صاف
کن رس، شعرت اس سوزخوانی کرتے ہوتے کجھی سر سے باہر نہیں ہونے اور رحیم کی دائیگی
میں کبھی خط انہیں کی۔ فقیر آج کے سوزخوانوں کو دیکھتا ہے تو خون کے آنسو روتا ہے۔
ایسے میاں سوزخوانی ذاکری بنا شد۔ اچھا اچھا خون تھوک جاتا ہے۔ سعیر فقیر یہ کہتا ہے
کہ راگ رانگیوں میں درک نہیں تو اس فِن شریف میں قدم رکھنا کیا ضرور ہے۔ ثواب
کہا تا مقصود ہے تو وہ تو وعظ دے کر محی کمایا جاسکتا ہے۔

پیر ذکر تو یہ تھا کہ ایسے تھے ہمارے پھوپھا حضور۔ ہم سب پھوپھی کو پھوپھو
پھوپھی ہی کہتے۔ پھوپھا حضور نے بطریق شائستہ ہمیں لوگا کہ ایسا کہنا خلاف ادب ہے۔
تب ہم پھوپھی پھوپھی کو پھوپھی حضرت اور جتوئے پھوپھا کو پھوپھا حضور کہنے لگے۔ وضع
ہو کہ ہمارے پھوپھا حضور کے خاندان عالی شان میں زبان و بیان پر بہت زور دیا جاتا
تھا۔ روز مرہ اور محاورے سے انحراف کو ظلم خطیم تصور کیا جاتا تھا۔ مولانا شبیر حسن سے
کے متعلق یہ روایت مشہور تھی کہ محض زبان کے سوال پر انہوں نے بیٹھی کار شتر دا پس کر دیا
تھا۔ سوال ڈال دیا کہ ہم صاحزادے کو فرنڈی میں لینے سے پہلے ان کا امتحان لیں
گے۔ امتحان اس طور پا کر مشنوی سخرا بیان کھول کر سامنے رکھ دی کہ میاں ذرا پڑھ
کر تو سناو۔ چار شحر سے اور کہا کہ میں کرو۔ کہلا بھیجا کہ صاحزادے اضافت کھاتے
ہیں۔ ہماری بیبا کا ان کے ساتھ گذاہ کیسے ہو گا۔ ویسے ہماری پھوپھی کا بھی استغان
لیا گیا تھا۔ لکھنؤ سے چل کر ایک بی مغلانی آئیں۔ مشنوی سخرا بیان پڑھوا کر سنی ،
لب و لب پر دیکھا، تذکرہ تائیث کے استعمال کو پر کھا۔ ہماری پھوپھی بھی چاروں کھونٹ
پکی تھیں۔ بی مغلانی اپنا سامنہ لے کر چلی گئیں۔

بچو پھا حضور اثنا عشری تھے۔ بچو بھی حضرت بھی اس گھر میں جا کر اسی رنگ میں
رنگی گئی۔ محرم کے چاند کے ساتھ چوریاں توڑ دیں۔ کنگھی چونٹی موقوف، سرمہ میں
معطل۔ دس دنوں تک سیاہ پوشک پہننا، الٹی چارپائی پہ سونا۔ ہمارے خاندان میں بڑے
بچو بچا صاحب پیر مغیث الدین کے توسط سے کہ پہنچنے ہوئے بزرگ تھے تفضیلیت
تو پہلے ہی راہ پا گئی تھی۔ اب بچو بچا حضور کی راہ تھوڑا تسلیم بھی در آیا۔ نیر میاں شمس الہدی
کی دہربت سے تو بچ گئے۔ لس خدا ہی نے بچایا۔ بروقت پستہ چل گیا۔ وہ میاں تو زے
جنسلمیں بن گئے۔ لندن گئے تو وہاں ایک میم سے نکاح بطرز فرنگ پڑھوا لیا۔ پھر شکری
ولاد پیدا کی۔ بیٹی بیٹے آدمی گورے آدمی کالے۔ قدرے مسلمان، زیادہ گرستان
آدھا تیر آدھا بیسر خاندان۔

مدعا کہنے کا یہ ہے کہ ایسے کافر زمانے میں اس عاصی پر معاصی نے شعور کی آنکھوں
کھوئی، مگر محمد اللہ کرہ اپنے عقیدے کے شیشے پر بال نہیں آنے دیا۔ ایمان کی کشی کو دہربت
کے گرداب سے اور نیچر بت کے تھیسٹرول سے بچا کر صاف نکال لے گیا۔ اس پاک پر وعدگا
کا شکر بجا لاتا ہوں۔ جس نے اس بیچ پوچھ میں یہ استغفارستہ پیدا کی کہ ایسے دشمن ایمان
نہ مانتے میں ایمان کو متزلزل نہیں ہونے دیا۔

امرے نیچر بت اور دہربت ایک طرف، اس گنہگار نے تو ناقوس کی آوازوں کے
ساتھ میں ہوش سنبھالا ہے۔ مندرجہ چراغِ حریقی کے کتنی دور تھی۔ یہی کوئی فرلانگ دیڑھ
فرلانگ کے فاصلہ پر۔ پنڈت گنگا دत مہجور کی صحبت اس پر مستزاد کرتے ہی سے ان کے
ساتھ دانت کاٹی روئی چلی آتی ہے۔ یاٹے پنڈت کیا ہیرا آدمی ہے۔ ایک دفعہ ہلمہ پڑھ
لے تو سیدھا جنت میں جائے۔ اُف خدا یا، کیسا کیسا غاصب ظالم جا بہے ایمان دغا باز
چور اپکا قراقہ بٹ مار ممحض اس زور پر کہ اُمت مرحومہ میں شامل ہے۔ جنت پر اپنا
حق جتا ہے۔ ادھر ہمایے پنڈت مہجور کا دامن نیکیوں سے بھرا ہے۔ مگر کہہ گونہ ہونے

کے سبب مقدمہ ان کا کھائی میں پڑ گیا ہے۔

میں نے ایک دن کہا کہ ”پنڈت بس ایک دفعہ کلمہ پڑھ لے اور پھر مر جا۔“

”اس سے کیا ہو گا؟“

”پھر تو سیدھا جنت میں جائے گا۔“

پنڈت ہنسا۔ کہنے لگا کہ ”شری مشاق علی، تمہیکے یہاں توجنت میں جانے کا بہت آسان نسخہ ہے۔ زبان سے ایک دفعہ کلمہ پڑھ لیا اور بے کھٹکے سیدھے جنت میں پہنچ گئے۔ ہمارے یاں پس ورگ کی راہ بہت کثیر ہے۔ ارجمن بھیم نکل سہدوکیسا کیا گئی گیا۔ دستے ہی میں ڈھے گیا۔ انت میں ایک کٹارہ گیا کہ یہ شری ماہراج کے سنگ سورگ کی چوکھٹ میک پہنچا۔“

میں نے شکر اللہ کیا۔ ”سبحان اللہ۔ حضرت انسان اشرف المخلوقات بنے پھرتے تھے، وہ تو وہ گئے یک سورگ تک پہنچ گیا۔“

پنڈت بولا۔ ”آدمی کا گھنڈ اُسے لے بیٹھا ہے۔ سہریو کو بدھیمان ہونے کا گھنڈ تھا۔ تکل کو اپنی سندتا کا گھنڈ تھا۔ بھیم کو اپنے کس بل کا گھنڈ تھا۔ ارجمن کو اپنی دھنش اور بان کامان تھا۔“

”اوہ درد پدھی؟“

”ہاں درد پدھی سے بھی اک چوک ہوتی۔ اس نے پانچوں سے برابر کا پریم نہیں کیا۔ ارجمن پس زیادہ ریجھ گئی۔“

اب میرے ہنسنے کی باری تھی۔ ”واہ پنڈت واہ۔ اشرف المخلوق کو کس کس بہانے سے کٹا ہے۔ پوری بندی نوع انسان کو قلندر کے سورگ کا مقابلہ ایک سترے کے نام لکھ دیا۔“ پنڈت نے بہت تاثانت سے کہا۔ ”شری مشاق علی پشو بخچی۔ زنواری دھنی نہ صحنی سب رام رحیم کی مخلوق ہیں۔ اس سنوار میں نہ کوئی چھوٹا ہے نہ کوئی بڑا ہے۔ نہ کوئی“

اوپنی ذات نہ کوئی نیج ذات ہے۔

ظالم نے مجھے لا جواب کر دیا۔ خیر آدم بر سر مطلب فقیر یہ عرض کر رہا تھا کہ ایسے پڑا شوب زمانے میں جب چار سو دہریت کی آندھیاں چل رہی تھیں اور نہ صرف یہ نہیں بلکہ طوفان بول کھا تھا اس حیر فقیر نے اپنے ایمان پر آنچ نہیں آنے دی۔ یہ سب آباجانی اور والدہ ماجدہ کی تربیت کی کرامت ہے اور بھوپھا پیر مغیث الدین کا فیض صحبت۔

ہمارے بھوپھا صاحب اپنے وقت میں مرجعِ خاص و عام تھے۔ درمادوں دکھیاروں

کے ہمدرد۔ حاجت مندوں کے حاجت روانا۔ نا مراد خدمت با برکت میں آتے تھے اور با مراد واپس جاتے تھے۔ ایک روز یہ فقیر خدمت میں حاضر تھا کہ ایک مرد مفلس آکر ملتھی ہوا کہ گھر میں تین دن سے فاقہ ہے۔ بھوپھا صاحب نے تامل کیا۔ بھر کر صندل سے ایک نقش لکھ کر دیا اس ہدایت کے ساتھ کہ اسے سرخانے پائے تملے دبا دیجیو۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اثر سے اس کے روز صبح کو چاندی کا ایک روپیہ ملکہ کو دوڑیہ کی صورت والا تکٹے کے نیچے سے برآمد ہوتا دیز چاندی کی ایک دلی۔ دنوں میں دل در اس کے درد ہو گئے۔

ایک اور داقعہ نقل کرتا ہوں کہ کیونکہ ایک عاشق کو وصالِ حُنْم میسر آیا۔

خدا کو حاضر و ناظر جان کر آنکھوں دیکھی سنا آتا ہوں۔ ایک دل زدہ اس حال میں حاضر خدمت ہوا کہ آنکھیں اس کی گنگا جنابی ہوئی تھیں۔ پوچھا، یہ حال کیا بنایا ہے۔ کہا، قسمت نے یہ دن دکھایا ہے۔

پوچھا، گھر یہ کیوں کرتا ہے۔ بولا، یار عزیز یہ یاد آتا ہے۔ پوچھا، کیا چاہتا ہے۔ بولا وصال یا۔ پہلے سمجھایا بچھایا، عشق کی تباہ کاریوں سے بخردار کیا جب دیکھا کہ دل کے ہاتھوں لا چاہ رہے تو ترس کھا کر کہا کہ لکڑی انار کی در کار

ہے۔ وہ ڈھونڈہ کر انار کی لکڑی لایا۔ آپ نے اس لکڑی کا قلم بنایا اور نقش ایک لکھ کر دیا کہ مینڈک کے منہ میں اسے رکھے اور مینڈک کو ندی کے کنارے دا ب۔ اس نے اسی کیا۔ چالیس دن جب گزد رے تو اس نے آکر پس پکڑ لئے۔ حال پوچھا۔ کہا کہ پچھڑا یا رمل گیا۔ دل کی مراد برآئی۔

دوسراؤاقعہ اس طرح ہے اور یہ بھی ان گنہگار آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے۔ ایک عاشق باحال تباہ حاضر خدمت ہوا۔ فریاد کی کہ رقبہ نے میری راہ تک کانے بوٹے ہیں۔ یار کے کان میری طرف سے بھرے ہیں۔ اب وہ مجھ سے بد کا ہوا ہے پٹھے پڑ پا تک نہیں لے سکھنے دیتا ہے۔ آپ نے کہا کہ چوتیس پتے آکھ کے لے کر آ۔ وہ بھاگ کا بھاگ کا جنگل گیا اور ججٹ پٹ چوتیس پتے آہمہ کے توڑ لایا۔ آپ نے ان پتوں پر بول کے کانے سے ایک نقش گودا۔ ہدایت کی کہ ٹیکا ایک دوپہری میں تندور گرم کراور یہ پتے اس میں جھونک دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ پندرہ رواڑہ نہ گزرا تھا کہ رقبہ روپیا ہوا۔ روٹھا یا رمن گیا۔

ایسے بہت سے واقعات ہیں، کہاں تک بیان کروں۔ اس درس سے کبھی کسی حاجتمند کو نامراد والپس جاتے نہ دیکھا۔ نوع بہ نوع کے نسخے، عملیات، لٹکے ان کے ناخنوں میں تھے۔ مشتے نمونہ از خرد رائے اکاد کا ٹوٹکا اور کوئی گولی حکمت کی بات جو ذہن میں اُنگی رہ گئی ہے نقل کرتا ہوں۔

د فیضہ کیوں کر نظر آوے

سیاہ تیتر پکڑ کر تین شب دروزا سے بھوکار کھے چوتھے دن چوپن کھول کر پارہ بھردے۔ پھر وہ پارہ نکال کر گائے کے دو دھم میں پکائے اور تیتر کو کھلا لے جب وہ بیٹ کرے تب اس بیٹ کو اٹے میں ملا کر گولی بناتے اور منہ میں

رکھ لے۔ دفینہ اگر سات پر دوں میں ہو گا تو بھی نظر آجائے گا۔

الیضاً

کڑک ناتھ مرغے کی چربی حاصل کرے۔ واضح ہو کر کڑک ناتھ مرغنا با مکل سیاہ ہوتا ہے۔ اس کا گوشت بھی سیاہ ہوتا ہے۔ اس کی چربی حاصل کر کے آنکھوں میں لگائے۔ جہاں خزانہ دبا ہو گا نظر آجائے گا۔

الیضاً

شبھ گھر ٹی میں کالی گائے کا دودھ اور لمحن ملا کر کڑک ناتھ مرغے کی زبان پر نکال لے۔ پھر وہ شخص جو اس اپیدا ہوا ہواپنی آنکھوں میں لگائے۔ مال جہاں بھی گزرا ہو رکاے دکھانی دینے لگے گا۔

جیب خالی نہ ہونے کی ترکیب

اسارہ کے مہینے میں سیخڑ کے دن تالاب کے کنارے جا کر ایک جوڑا مینڈک کا جب وہ جستی کھا رہا ہو چکا ہے۔ نر کے منہ میں وپسیہ رکھ کے تالاب کے ایک کنارے پورب کی سمت اور مادہ کے منہ میں ایک رکھ کے تالاب کے دوسرا کنارے پھرم کی سمت گاڑ دے۔ یہ کام برہنہ توکر کرے بعد آٹھ دن کے کھود کر دیجئے۔ اگر وپسیہ اور کراٹشی کے پاس پہنچے تو روپے کو فریض کرے اور ایکنی کو پاس رکھ لے۔ اگر ایکنی اڑ کر روپے کے پاس پہنچے تو ایکنی کو فریض کرے اور روپے کو گردہ اس باندھ کر رکھ۔ انشاء اللہ جیب بھی خالی نہ ہو گی۔

طریقہ عمر کے معلوم کرنے کا

طریقہ عمر کے معلوم کرنے کا یہ ہے کہ اس گھری جب سورج نکل رہا ہو جنگل میں جائے۔ سورج کے رُخ آنکھیں موند کر سیدھا کھڑا رہے اور اپنی پرچھائیں کا خیال دل میں لائے۔ پھر آنکھیں کھول کر اپنی پرچھائیں کو دیکھے۔ اگر پودی ہے تو عمر دراز ہوگی۔ اگر سرغاٹ نظر آئے تو برس پورا نہ ہو گا کہ گزر جائے گا۔

پسح پھر کنے اعضاٰ جسمانی کے

وہ گفام خوش انداز زیر بحث نہیں جن کی بوٹی بوٹی پھر کتی ہے۔ ان سے فقط نظر ہر آدمی کے اختیار قوتیاً پھر دیتے ہیں۔ کسی عضو کا پھر کنا اچھا ہوتا ہے۔ کسی کا برا۔ اگر ناک سیدھی طرف سے پھر کے تو حاکم کی ناک کا باں بنے، ذرومال ملے۔ لب اگر اور پکا پھر کے محبوب کا بوسہ ملے۔ اگر گلا پھر کے غذاۓ لذیذ کھلنے کو ملے و نیز فنِ موسیقی میں کمال حاصل کرے۔ اگر بغل سیدھی پھر کے تو یار چلا جاتے بغل خالی ہو جائے۔ اگر الٹی پھر کے تو پھر ادوست بغل میں آئے۔ شاد کام ہو جائے۔ اگر ناف پھر کے مرض میں مبتلا ہو۔ اگر زیر ناف پھر کے تو دوست کی طرف سے صدر مہ اٹھائے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ہمارے پھوپھا صاحب اپنے وقت کے بڑے عامل تھے۔ دعائیں اثر تھیں۔ تعویز تیر بہدف ہوتا تھا اور تعویز کی چاروں اقسام خاکی، آبی، بادی، آتشی ان کے دائرہ اختیار میں تھیں۔ موکل قبضہ میں تھے۔ اور موکل بھی ایسے دیے دیے نہیں۔ ہماری پھوپٹی اماں بیان کرتی تھیں کہ ان کے موکلوں میں زعفر جن کا پڑا تو تباہی تھا۔ میں نے ایک روز پھوپٹی اماں کو اس باب میں کریدا تو یوں بیان فرمایا کہ جیسے تہلے پھوپھا صاحب کا یہ طور بندھا ہوا تھا کہ برس کے برس عاشورہ کے دن سیدانی بی کے

امام بارٹے میں جا کے روضہ خوانی میں شریک ہوتے تھے۔ اس برس بھی ایسا ہی ہوا۔ روضہ خوانی ہو رہی تھی کہ اچانک لوگوں کی نظرؤں نے کیا دیکھا کہ قریب ہی ایک ناگ بل کھاتا ہے اور زمین پر چپن پڑتا ہے۔ دیکھنے والے دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے۔ تمہارے پھوپھو
صاحب نے دیکھا تو قبر بھری نظرؤں سے اسے گھورا اور دُانسَا کہ تو یہاں کیا کر رہا ہے
ڈائٹ پرستی تھی کہ ناگ غائب پھر جو دیکھا تو ایک لمبا تر نگاہ دی سر جبکاٹے ہاتھ
باندھے کھڑا ہے۔ تمہارے پھوپھا صاحب نے ترش روئی سے پوچھا اپہاں کیا لینے آیا
ہے۔ عاجزی سے بولاً ثواب لینے۔ کہا اپنا حسب نسب بتا۔ بولا، زعفر جن کا پڑ پوتا
ہوں۔ اب زعفر کہلا آہوں۔ عشیٰ حسین ورنے میں ملا ہے۔ یہ سن کر تمہارے پھوپھا
صاحب نرم پڑ گئے۔ بولے، پھر زہریے کیوں بتے پھرتے ہو۔ زہر تھوکو، آدمی نبو
اور ہمارے ساتھ رہو۔ اے لووہ تو پچھے آدمی کی جوں میں آگیا اور تمہارے پھوپھا
صاحب کی خدمت میں رہنے لگا۔ پتلی کنجے کی طرح چمکتی تھی۔ مگر گردش نہیں کرتی تھی۔
تمہارے پھوپھا صاحب نے کسی کام کو کہا۔ فوراً غائب۔ دم کے دم میں کام انجام دیا
اور پھر حاضر۔

پھوپھا صاحب کی یہ سب کرامات اپنی جگہ۔ مگر اب اجانی کبھی ان کے قابل نہیں
ہوتے وہ پھوپھا صاحب کے عملیات کو خلاف اسلام جانتے تھے اور بدعت میں شمار
کرتے تھے۔ مگر اس باعث کہ پھوپھا صاحب رشتہ میں بڑے تھے ان کے سامنے منزہ نہیں
کھولتے تھے۔ اصل میں پھوپھی اماں، اب اجانی سے عمر میں بڑی تھیں اور میاں جانی
انہیں مانند اپنی والدہ کے جانتے تھے کہ ان کی والدہ ماجدہ یعنی راقم المروف کی دادی
حضرت ان کی کم عمری ہی میں دنیا سے سدھا رکھئی تھیں۔ پھر پھوپھی اماں ہی نے
انہیں پال پوس کر رکھا اور تربیت دی۔ یہ باعث تھا کہ پھوپھی اماں خاندان میں
سب سے بڑی مانی جاتی تھیں۔ ان کے ہوٹوں سے نکلا حکم حاکم کی حیثیت رکھتا تھا۔

پھوپھی اماں واہ وہ سجان اللہ کی تال مکھانے کا سالن باتی تھیں۔ باقی رہا قورمہ تو خدا نے رازق قسم ہمنے پچھلے چالیس سال سے قورمہ نہ کھایا نہ آنکھ سے دیکھا۔ نہ وہ پکانے والے رہے نہ عفران اور کیوڑہ خاص مہیا ہیں، پھر قورمہ کیسے تیار ہوا اور چراغِ حوالی سے تو قورمہ کا جنازہ اسی روز نکل گیا تھا۔ جس روز پھوپھی اماں کی آنکھ بند ہوئی تھی۔ اب جو ہم قورمہ کھاتے ہیں تو قورمے کا منہ پڑتا ہے۔

ہاں پھوپھی حضرت جن دنوں لکھنؤ سے آجاتی تھیں، چراغِ حوالی کے دسترخوان پر ایک نئی بہار آجائی تھی۔ انس کا نز عفران خوب۔ شش دنگا مرغوب، شش رنگے کی ایک رکابی میں چھے ذائقے سوٹے جاتے تھے اور چھر نگ چک دکھاتے تھے۔ ارے اب ہم کیا کھاتے ہیں۔ خالی چپاٹی، گوشت اور چپاٹی بھی اب کہاں میسر ہے۔ وہ تو ہمارے میاں چپاٹی کے سامنہ چلی گئی۔ کیا چپاٹی پکاتے تھے۔ بُر چپاٹی اب آجائی کے کان سے بڑی، اور ق سے زیادہ پتلی کہ پوری چپاٹی پٹکی میں آجائے۔ میاں چپاٹی اب آجائی کے چھتے باورچی تھے۔ میاں چپاٹی کو بھی ان سے بہت لگا د تھا۔ جب آب آجائی کی آنکھ بند ہوئی تو ہم سے زیادہ میاں چپاٹی روئے۔ بھنڈے سانس بھرتے تھے اور کہتے تھے کہ قدر داں تو چلا گیا، اب میرے بنائے ہوئے پستہ کے سالن پر کون داد دے گا اور ہواں چپاٹی پر کون شاباشی دے گا۔ بس اسی غم میں باورچی خانے سے کنارہ کش ہو گئے اور چھ مہینے کے اندر ساندھچٹ پڑ ہو گئے۔ حیف صدر حیف کہ زمانہ بدل گیا اور ذائقے رخصت ہو گئے۔ تصور کیا چاہیے کہ ہم کتنے ذائقوں کے ماتم دار ہیں۔ اب چراغِ حوالی کے دسترخوان پر نہ پتے تال مکھانے کا سالن ہوتا ہے۔ نہ کیوڑے ذعفران سے مبتکا، نہ قورمہ، نہ سلطانی دال، نہ امہارہ درقی پر اٹھے۔ نہ نر عفران متجنم نہ یاقوتی کی کلھیاں نہ شش بنگے کی مشتریاں نہ عفرانی سویاں۔ سب نہیں نقشِ ذلگا طاق نیاں ہو گئیں۔

لذتول ذالقوں پہ کیا موقوف ہے۔ اس زمانے کا کونسانٹر اب باقی رہ گیا ہے۔ اب جانی کا کیا اثر درست خ تھا۔ انہیں کے منہ سے فرنگی حاکموں نے اس بیچ متقدرت کو خان بہادری کے خطاب سے نوازا۔ بعد میں آئے والے حاکموں نے بھی اپنے پیشروں کی وضع کو خوب بجا یا کہ جو کلکٹر بہادر اس ضلع میں تعینات ہوتے ہیں وہ اس بے بھالت کو ضرور یاد کرتے ہیں۔ جب کبھی کلکٹر بہادر کا اس نواحی میں ورود مسعود ہوتا ہے جو میل کو منقرہ اپنے قدم میمنت لزوم سے زینت بننے شروع ہے اور کھانا تناول فرمائے جو میل کے دستخوان کو عزت دیتے ہیں۔ مگر فیقر صاف صاف عرض کر دیتا ہے کہ یہ دستخوان ابا جانی کے زمانے کا دستخوان نہیں کہ بچوپنی اماں بچوپنی حضرت دونوں اس جہان سے سدھار گئیں اور میاں چاتی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے کہ اب جنت میں بھی رہائے ہیں۔ پھر بھی کلکٹر بہادر ہونٹ چاٹتے جاتے ہیں اور دوبارہ آگر کھانا تناول فرمانے کا وعدہ فرمائے جاتے ہیں۔ موجودہ کلکٹر بہادر دام اقبال تو بہارے دستخوان کا لکھہ پڑھتے ہیں اور وقت فرما تو مرد بربیانی کی فرماںش کرتے ہیں۔ کاش انہوں نے ابا جانی کے زمانے کا دستخوان دیکھا ہوتا۔

(قطع کلام ہوتا ہے۔ مگر مجھے اس ذکر سے اپنے گشده ذاتے یاد آگئے۔ بو جان اپنے بھلے وقت میں ماش کی دال بچروں کیا خوب پکاتی تھیں کہ فرش پر بھیر دو اور چاول کے داؤں کی طرح چن لو۔

”بو جان، کبھی آپ ماش کی دال بچروں پکایا کرتی تھیں۔ اب تو زمانہ ہی ہو گیا وہ دال کھائے ہوئے؟“

بو جان نے میری بات بات سن کر ٹھنڈا سانس برا لوئیں۔ بیٹے وہ بھلے وقت کی بات تھیں۔ اب ویسی دال پک نہیں سکتی۔ ”کیوں نہیں پک سکتی؟“

”بیٹے، وہ دال تو مٹی کی ہندڑیاں میں پکا کر قنیخی۔“

”بوجان، مٹی کی ہندڑیاں نایاب تو نہیں ہے۔ بکل، ہی لے آؤں گا۔“

”مٹی کی ہندڑیاں تو یہ آؤں گے۔ مگر میرے چاند مٹی کا چوپاہا کہاں سے مہیا کرو گے؟“

”مٹی کا چوپاہا، میں چکرایا۔“ بوجان، مٹی کی ہندڑیاں کی بات تو میری سمجھ میں آتی ہے۔

مگر مٹی کے چوپائے کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مطلب تو آپسے ہے۔ وہ گیس کے

چوپائے میں بھی ہوتی ہے۔“

”بیٹے آپس اور آپس میں بھی تو فرق ہوتا ہے۔ چری لکڑیوں کی دھمکی آپس پر پک کر ہندڑیا کا جو مزہ نکلا تھا وہ تمہارے گیس کے چوپائوں پر می ہونی ہندڑیا کا نہیں نکل سکتا۔“

شاید یہی احساس تھا کہ بوجان رفتہ رفتہ باورچی خانے سے بالکل بی بے تعلق

ہو گئی تھیں۔ زبیدہ نے پکا کر جو سامنے رکھ دیا اسے بلا تبصرہ کھالیا۔ نہ تعریف

نہ تعریض۔ آشیانے کے کچھ میں جہاں زبیدہ نے بڑے ذوق و شوق سے گیس کے چوپائے

بازار سے منگا کر فٹ کئے تھے۔ بوجان نے اس ایک دفعہ قدم رکھا اور ان چوپائوں

کو اور ان پر چڑھے پر شیر لگر کو دیکھ کر اٹھے پیروں واپس ہو گئیں۔ بوجان جو کچھ بھی

تھیں، پھر انہی کے باورچی خانے میں تھیں۔ کتنی لگن رہتی تھیں۔ دھوئیں سے بھرے

اس بڑے باورچی خانے میں۔۔۔ جہاں بڑے بڑے مٹی کے چوپائوں میں ہر دم

موٹی موٹی لکڑیاں سلکتی رہتی تھیں اور ہر دم کوئی نہ کوئی ہندڑیا ان پر پھر جھی ہی رہتی تھی۔

میں نے جب ہوش سنبھالا تو وہ رنگارنگ دسترخوان جس کا میاں جان نے ذکر کیا۔ اپنے

چکا تھا۔ میاں جان کی پھوپھی اماں اور پھوپھی حضرت دنوں اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں،

ان کے آبا جانی سدھار پکے تھے اور میاں چپاٹی بھی منوں مٹی تکے جا سوئے تھے۔ اب

وہ باورچی خانہ بوجان کی قلمرو تھا۔ خیر،

آبا جانی خود تو دو لفتوں میں سیر ہو جاتے تھے۔ کھاتے کیا تھے، سونگھتے تھے۔ دسترخوان

تو اصل میں مہماں ان عزیز اور بیار ان یا تیز کے لئے بچتا تھا۔ جہاں اور وضع داریاں تھیں۔ ایک وضع داری یہ بھی تھی۔ اباجانی کی وضع داری کا عالم تو یہ تھا کہ کہیں ایک دفعہ پھوپھی غفرت اور بچوپھا حضور کو ماہ محرم میں ادھر آنا پڑ گیا۔ محض ان کی خاطر اباجانی نے ایک مجلس کا اہتمام کیا۔ اگلا برس جب آیا اور وہ تاریخ قریب آئی تو اپنی وضع کا پاس کرتے ہوئے پھر مجلس کا اہتمام کیا۔ بس پھر وہ مجلس ہر برس ہونے لگی۔ اگرچہ خود اباجانی گری اور ماتم کے قائل نہیں تھے۔ گریہ کافلیضمان کی طرف سے اس مجلس میں پنڈت ہومدت آنجہانی ادا کرتے تھے۔ کس اہتمام کے ساتھ دور رومال لے کر مجلس میں آتے تھے۔ ادھر مقابل شروع ہوئے ادھر ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگائی ہے۔ جیب ایک دو ماں آنسوؤں سے شرلووہ ہو جاتا تو دوسرا دو ماں نکلتے۔ مجلس کے ختم پر دونوں رو ماں آنسوؤں سے تربت ہوتے اپنا پنڈت گنگادت اس بزرگ کی اکلوتی اولاد تھی۔ مجھے یاد ہے کہ یہی کو ان کی ایک ہی نصیحت تھی ”بے دلگیری بن لگیری۔ اسی میں تیراکلیاں ہے“ میں اس نصیحت پر بارہا چکرایا۔ ایک روز بھارت کر کے اس ہمپر ان نے پوچھا کہ ”پنڈت چیا لگیری بننے میں کیا بھیہ رہے“

تب اس بندگ نے یوں فرمایا: "بھتیجے، یہ تب کی بات ہے جب ہمارے سری رامچندر جی لئکا میں پہنچنے کے لئے ستمبر پہلی باندھ رہے ہے۔ ہنومان جی کی سینا پتھر دھونے پر لگی ہوتی تھی۔ ادھر سے ایک گلہری کا گزر ہوا۔ اسے چھتا ہوئی کہ آج یہاں کیا ہو رہا ہے پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ سری رامچندر جی کی آگیا سے یاں پہلی باندھ رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ اس کام میں شے بھی بھگوان کی سہاستا کرنی پاہئے۔ اس نے یہ کہا کہ منہ میں ایک کنکری دبائی اور پتھر دھونے والے بندروں کے ساتھ ساتھ چلی۔ جہاں انہوں نے پتھر ڈالے وہاں اُس نے یہ کنکری ڈال دی۔ دیر تک وہ یہی کرتی رہی۔ بندرا اسے دیکھ کے ہنسے۔ ایک بندوں نے اسے اٹھا کر اگر پھر نیک دیا۔ کہا کہ پرے ہرث: ہمیں کام کرنے والے گلہری بلاؤ۔

کرنے لگی۔ سری راجمندر جی نے یہ دیکھا تو اسے اٹھا کر پیارے گود میں بٹھایا۔ بندروں سے کہا کہ ہے بھلے بندروں۔ جو تمہارے لیس میں ہے تم کرہے ہو۔ جو گھبری کے لیس میں ہے۔ گھبری کر رہی ہے۔ سواس کا اپیان مت کرو۔ یہ کبھی کے انہوں نے شفقت سے گھبری کی پیٹھ پہ ماتھ پھرا۔ بھگوان کی شفقت بھری انکلیوں کے نشان آج مجھی گھبری کی پیٹھ پہ موجود ہیں۔“

پندرہت سوم دت آنجانی رامائن کا پاٹھ کس استغراق سے کرتے تھے۔ رامائن ان کے تاخنوں میں تھی۔ گھستان انہیں از بر تھی۔ پوچاپٹ کئے خعنوع و خشوع سے کرتے تھے۔ پیشانی پہ کتنا مبارک رکھاتے تھے۔ عید پر انگر کھازیبِ تن کے مقرر آتے۔ آباجانی سے غل گیر ہوتے، میرے سر پر شفقت سے ماتھ پھیرتے اور عیدی عطا کرتے۔ اسی وضعداری سے آباجانی ہولی دیوالی پران کے یہاں جاتے۔ پندرہت گنگا دت وضع احتیاط برستے۔ آباجانی کے روئے مبارک کونہ تو گلال سے الودہ کرتے زر نگ دلتے کہ آباجانی تو ان مشاغل کو خرافات جانتے تھے اور ہندو رسم کو شرک سے تعمیر کرتے تھے مگر دوستوں کے دوست تھے اور وضع کے پابند تھے۔ سو ہولی دیوالی پر دوست کے یہاں جانا ضرور تھا۔ تھا میں سے ایک الائچی اور تھوڑی سو لفٹ اٹھا کر منہ میں رکھ لیتے۔ لیجئے دوست کے تیوبار میں شریک ہو گئے۔ پندرہت سوم دت باپ کی کسری سے کے ساتھ رکھاتے۔ میرے منہ پہ اتنا گلال ملتے کہ میں بندہ بن جاتا۔ پھر گنگا دت پیکاری چلا کے مجھے ٹیسونگ میں شرالور کر دیتا۔ آباجانی سو لفٹ الائچی چباتے رہتے اور خاموش رہتے۔ دوست کی اس روشن پر کبھی معترض نہیں ہوئے۔ اللہ اللہ کیا رد اداری تھی اور کیا وضعداریاں تھیں۔

آباجانی اس دارفانی میں اسی برس جئے۔ سفر حیات گھستان محل سے شروع ہوا اور چدائی خوبی میں اگر انہیں پذیر ہوا۔ پوری زندگی راہِ احتدال پر گامز نہ ہے۔

جور و شش ایک دفعہ پکر ڈلی اس سے کبھی انحراف نہیں کیا۔ صبح سنہ اندر جیرے تاروں کی چھاؤں میں اٹھنا، مکدہ ہلانا، تازہ پانی سے غسل کرنا اور فخر کی نماز پڑھنا۔ فخر کی نماز کے بعد ناشستہ کر شہد بآسی روئی اور عرق ماراللحم سے عبارت تھا۔ پھر مطلب کرنا۔

جاڑے گرمی برسات وہی ایک طور، حتیٰ کہ کبھی بس میں بھی فرق نہیں دیکھا گیا۔ لٹھے کا چور ڈمی دار پا چمامہ، ململ کا کرتا، چکن کا انگر کھا کر گرمیوں میں پہنچتے تھے۔ مہاڑ کے جاڑوں میں بھی زیبِ تن کھٹے رہتے تھے۔ مگر کیا صحت تھی کہ بخار جاڑا کیا معنی کبھی چھینک بھی نہیں آئی۔ تبیسی آخر وقت تک سلامت رہی اور پہلی آنکھ کی آنکھ بند ہونے تک روشن رہی۔

اباجانی نے فکر و پریشانی کو کبھی قریب نہیں پہنچنے دیا۔ آخری مریں بس ایک ملال دامن گیر ہو گیا تھا کہ ان کے اٹھ جانے کے بعد خاندانی مند حکمت پر کون بیٹھے گا۔ کف افسوس ملتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم نے صاحبزادوں کو علی گڑھ بھیج کر کتنی رکعت کا ثواب کیا۔ ایک صاحبزادے دین سے بیگانہ ہو گئے۔ دوسرے صاحبزادے نے فرنگی کی چاکری کر لی۔

اباجانی بس: ایک ملال دل پر دھر کر لے گئے۔ مگر اس کے باوصفت آخری گھریوں میں بہت پُر سکون نظر آتے تھے۔ کس سادگی سے پردہ کیا کہ لیئے لیئے ایک پیکی لی اور آنکھیں موند لیں۔ انا لذت و انا ایہ راجعون۔

فرزندِ اکبر ہونے کی بنا پر اس خاکسارہی نے ابا جانی کو قبر میں اُمارنے کا شرف حاصل کیا۔ جب میں قبر میں اُترا تو خدا کو حاضر و ناظر جان کر عرض کرتا ہوں کہ قبر خوبیوں سے مہک رہی اور جب ابا جانی کا جسدِ مبارک میرے ہاتھوں میں آیا تو وہ پھول کی شال ملکا تھا۔ میں حیران کریا اہنی ابا جانی تو دہرے بدن کے تھے۔ کہ تھی بنی ہوئی تھی اور اس گھری اتنے بُک ہیں کہ جیسے آدمی کی لاش نہ ہو پھولوں کی دُالی ہو۔

چراغِ حوتی سے اباجانی کا جنازہ کیاں کلاکہ بچوں سے خوبصورت گئی۔ کیا امی جمی
رمتی تھی۔ مطب مریضوں سے بھرا ہوا۔ دیوان خانے میں ملاقاتیوں کی چیک مہک۔
اب مطب سنان تھا۔ دیوان خانہ ویران تھا۔ دُلور ہی سونی پڑی تھی۔

ہمارے اباجانی طب کے آخری پشم و چراغ تھے۔ وہ دنیا سے سدھارے
تو بچیرخاندان کی مندرجہ پر کوئی بیٹھنے والا نہ رہا۔ اباجانی اس فنِ شریف کے موزوں کات
کو کے مستغل کرتے سینہ پر دھر کے لے گئے۔ ان کا ملال اس ناخلفت کے دل پر
دااغ ہے۔ مگر کیا کرتا طبیعت سے مجبور تھا۔ اباجانی نے سکھانے پڑھانے کی اپنی
سی کوشش کی مگر طبیعت نے اس بہر سے میل نہیں کھایا یا شاید تقدیر ہی میں فرنگی
کی چاکری لکھی تھی۔ اباجانی کا اثر در سوخ کام آیا۔ نائب تھیںلداری کی اسمی پر
تقریب ہو گئی۔ اس چاکری نے فیر کو بہت غراب کیا۔ آج یہاں کل وہاں۔ روز رو ز
کے تبادلوں نے کہیں جنم کر بیٹھنے نہ دیا اور جس شہر میں تبادلہ ہوتا وہ شہر کاٹ کھانے
کو آتا۔ ایک شہر بھلا لگا مگر وہاں اور ہی افتاد پڑی۔ اہنی کسی کو مسافرت میں دل زدہ
مبت کیجئیو۔ باقی شہروں میں سو طرح کے رنج کھینچے۔ مگر اس شہر میں آگر رنج عشق
کھینچنا پڑا کہ سب رنجوں سے سوا تھا۔ صاحبو وہ شہر ناپر سال نکلا۔ شریعت وصل
تود و در ما اس عشوہ طراز نے تو ایک جنگل دکھا کر شربت دیدار کو بھی تر سادیا۔ کتنے
پاپڑ بیٹھنے اور خوار ہونے کے بعد ملاقات کی گھری آئی۔ مگر کیا آئی؟ وصل کے نام
پر وہ خام پارہ بستھے سے اکھڑ گئی۔ پھر تو اسی گئی کہ پیغام نہیں دکھائی۔ کتنے دنوں اس
شہر میں خراب پھرتا پھرا۔ سدھ بڑھ کھو بیٹھا۔ طبیعت خفقاتی ہو گئی۔

انہیں دنوں ایسا ہوا کہ بڑے دن کی چیزوں میں گھر آنا پڑا۔ اباجانی نے میری صور
دیکھی تو کشک گئے۔ آخر نامے کا گرم و سرد بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر درپر ان کے ایسے
مریض بھی تو آتے تھے کہ انہیں کوئی بیماری نہیں ہوتی تھی۔ مگر وہی سب سے بڑھ

کر بیمار ہوتے تھے۔ اب اجانی نے اس پیار کا علاج خوب سوچا کہ جھٹ پٹ نلاش کر کر اس کے ایک نیک بجت کے ساتھ ہمیں رشتہ ممنا کرت میں باندھ دیا۔ ساتھ ہی یہ بندوبست کیا کہ حکام بالا سے کہ سن کر ہمارا تباہی دلہ دور کے شہر ہیں کر دیا۔ علاج کا درگر ہوا۔ ازدواجی ذمہ دار یوں نے مجھے آجھا لیا۔ پھر آنکھ اور جمل پہاڑ اور جبل۔ جب وہ شہر ہی جھٹ گیا تو اس شہر خوبی کا خیال بھی دور ہوتا چلا گیا۔ یوں اب بھی جب اس کا خیال آ جاتا ہے تو دل تملکا جاتا ہے۔ خیر تو جب طوفان ذرا تھما تو اپنی سرکاری ذمہ دار یوں کا بھی دھیان آیا۔ پھر میں نے دلمبئی سے اپنے فریض منصبی بجالانے شروع کئے۔ پھر تو ترقی کے درواہوں کے اور درجات بلند حاصل ہوئے چلے گئے۔ آخر الامر دُبیٰ ٹکٹکٹری کے چہرہ جدیلہ پر فائز ہوا۔ اس منصب کو فیر نے اس خوش اسلوبی سے نبھایا اور سرکار انگلیسیہ کی وہ خدمات انجام دیں کہ حکام بالا نے خوش ہو کر دینا منٹ کے وقت مجھے خان بہادر نی کا خطاب عطا فرمایا اور آنریخی محبرٹیٹ کے منصب سے نوازا کہ ہنوز حباری ہے۔ آگے اس دیپورٹیٹی پر ملکیوں کا بحوم دستاخا۔ اب داد خواہوں کا مجھ ہوتا ہے۔ مگر دیپورٹیٹی کی وہ رونق اجداد کے کسبِ کمال سے مختی، یہ رونق فرنگی حکام کی نظر کرم کی مر ہوں منت ہے۔ سوا اس کا کیا اعتیار، آج ہے کل رہے رہے نہ رہے۔ آسمان کا زنگ جوں جوں بدلتا ہے توں توں فیر کا دل ہوتا ہے۔ پرانغِ جو می دا مم آبادر ہے مگر میرے دل میں وسو سر پیٹھ گیا ہے۔ تیور جوزمانے کے اپنے نہیں ہیں۔

۱۵

میں نے دیکھا کہ آشیانے کی منڈیریں پاٹ ہیں، نہ کوئی برجی، نہ کوئی مشی۔ میرا دل بیٹھ گیا
اب سے پہلے یہ بات میرے دھیان ہی میں نہیں آئی تھی۔ نے مگر کا بھی عجائب نشہ جوتا ہے
نئی تحریر ایسا سحر باہد صحتی ہے کہ تحریر کی خامیاں اور کیاں نظر ہیں نہیں آتیں۔ وقت کے ساتھ
بایکوم موسموں کے اثر سے یہ نشہ رفتہ رفتہ اترتا ہے اور سحر ٹوٹتا ہے پھر یہ خامیاں
اور کیاں نظر آنی شروع ہوتی ہیں مجھے تحریر میں اس نقص کا احساس میرا دل کے داشتے
سے ہوا میں نے دیکھا کہ پرندے آشیانے کی منڈروں سے کئی کاٹ فرنگل جاتے ہیں
اور قریب میں مکھرے ہوئے درختوں کی چنگوں پر جا کر پڑاؤ کرتے ہیں۔ میرے لیے ان
کا یہ حرز عمل تعجب خیز تھا اور ماوس کن بھی۔ مجھے کتنا اشتیق تھا کہ رنگ برد بندے پرندے ہماکے
آشیانے کی منڈروں پر آکر مُھکانا کریں چہہا ہیں۔ موقع تو یہی تھی منڈروں میں پرندوں کے لیے
ایک کشش ہوتی ہے پرندہ کتنے ہی بلے سفر پر رواں دواں ہو مگر رستے ہیں کوئی منڈیر
نظر آ جائے تو وہ اس پر ضرور اتر جاتا ہے بیٹک لکھری بھر بعد پھر اڑ جائے۔
میں نے پرندوں کے اس حرز عمل کی توجہ ہی پہنچنے کی تحریر کی کہ آشیانہ بھی نیا نیا ہے نہیں
دیواریں اور منڈروں پرندوں کے لیے اپنی اپنی صورتی ہیں شاید وہ انہیں لاپنی کشادہ فضائیں
رخنے نظر آتی ہیں مگر موسموں کے عمل کے ساتھ ساتھ منڈروں پرندوں کے لیے ماوس ہوتی
جلی جاتی ہیں اور کسی کسی منڈر سے تو ان کا انس اتنا بڑھ جاتا ہے کہ ہر بچر کر دواں اسی
پر آکر پڑاؤ کرتے ہیں اور کسی کسی پرندے کا رشتہ تو منڈر کے ساتھ اتنا گہرا ہو جاتا ہے

کہ وہ دہاں اتر کر بھول ہی جاتا ہے کہ اسے یہاں سے اڑان بھی کرنے ہے۔

فاختہ کبوتر چلی یہ وہ پرندے میں جن کا منڈیروں سے رشتہ بر جھتے بڑھتے

با تھوم یہ صورت اختیار کر لیتا ہے میں اتنا سوچ پایا تھا کہ چانک میرے دھیان میں یہ بات آئی کہ پرندے منڈپ پر اتر کر لگیوں اور برجیوں پر بھی نازیادہ پسند کرتے ہیں پھر ان کی یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ جس منڈپ پر وہ اتریں اس کی دیوار اونچی ہو۔ دانے دنکے کے متاثر پرندے جیسے گردیا چڑیاں یا کوئے پست دیواروں اور سپاٹ منڈپوں کے ساتھ بھی گذارہ کر لیتے ہیں بلکہ تاید انہیں کو تزعیج دیتے ہیں کہ دہاں سے صحن میں پڑے ہوئے ٹوٹے نوالے تک رسائی آسان رہتی ہے مگر جو پرندے دانے دنکے سے بے نیاز آسمان کی بلندیوں میں پرداز کرتے ہیں وہ نیچے اترتے ہوئے فلک بوس برجیوں اور لگیوں پر ڈپرا گزا پس کرتے ہیں کوئی چینی کبوتر آسمان پڑا۔ بن جانے کے بعد جب نیچے آئے لگتا ہے تو کوئی اوپنجی مٹی کوئی فلک بوس برجی اسے اپنی طرف ٹھیکھتی ہے اور دہاں اتر کر وہ اتنا گھن ہوتا ہے کہ یہ بھول ہی جاتا ہے کہ اسے اپنی چھتری پر واپس جانا ہے اور چل تو اوپنجی مٹی پر بیٹھ کر فوراً ہی مراقبہ میں چلی جاتی ہے مگر میں نے سوچا، آشیانے کی ذائقہ دیواریں اوپنجی ہیں نہ اس کی منڈروں پر کوئی مٹی اور برجی قسم کی کوئی چیز ہے بلکہ پرداز پرندوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ان کے پاس کیا ہے۔

پسے مجھے اپنے آپ پر غصہ آیا کہ تعمیر کے درداناں میں نے اس بات پر دھیان کیوں نہیں دیا تھا میں دھیان کیے دیتا۔ میری تو سمجھ بھی میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ہو کر رہا ہے تعمیر کا بچتا ہوا نقشہ مجھے تو سب اینٹ گارے کا بلود نظر آتا تھا۔ اس بوئے میں سے کیا شکن ابھرے گی مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا ہاں زیست کی نظر ماری جزیت اور تفصیلات پر بھی بھرا سے نہیں اور برجیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

پھر مجھے سا جد پر غصہ آیا۔ مکان کا نقشہ میں نے سا جد ہی سے بنوایا تھا وہ

وہ میرے ساتھ دفتر میں رہ چکا تھا مجھ سے جو نیسر تھا رفتہ رفتہ خاصی دوستی اور بے نسلتی
تھی پھر وہ امر کیلئے علاً گیا وہاں سے وہ بہت مادرن قسم کا آرکیٹ بن کر آیا اور اپنے پیشے
میں صرف ہو گی پھر میرا اور اس کا ٹاکرہ ہی نہیں ہوا مکان کے نقشے کا جب مسئلہ پیدا
ہوا تو مجھے اس کا خیال آیا میں اس سے جا کر ملا۔ بہت خوش ہوا۔ مکان کے ذکر پر اس نے
خود ہی پیش کی کہ اخلاق بھائی تھا اسے مکان کا نقشہ میں بناؤ گا اور دیکھنا بارہ مرد
کی جگہ کو اس طرح استعمال میں لاؤں گا کہ وہ ایک کنال میں بھی کوئی نظر آئے گا اس
وقت اس نقشے سے میں مطمئن تھا مگر اب مجھ پر اس کے نقش کھل ہے تھے میں ساجد
کے پاس گیا اور کہا کہ ”بھائی ساید تم نے تو خالص مخرب پسائل میں ہمارا مکان کھڑا کر
دیا کچھ اس خاکسار کے دیکی مذاق کا بھی لمحاظہ رکھا ہوتا۔“

” اچھا۔ کیا کمی رہ گئی اس گھر میں؟“

” یا رہا؟ وہاں مٹی کوئی نہیں ہے۔“

” مٹی؟ یہ کیا شے ہوتی ہے؟“

” کمال ہے سچد، تم اپنے پرانے طرز تعمیر سے اتنے ناشتا ہو۔ مٹی کو نہیں
جانتے۔ پرانے روایتی مکانوں کی دیواریں بہت اونچی ہو اکرتی تھیں۔ مندرجہ ان کی
خاص وضوح کی ہوتی تھیں اور گوشوں میں کوئی برجی کوئی مٹی ہوتی تھی۔“

” اچھا۔ اچھا برجی میں سمجھ گیا مگر اخلاق بھائی تم نے مجھ سے مکان کا نقش بنوایا تھا
قلعہ کا نقش بنانے کو تو نہیں کیا تھا۔“

” نہیں یا رہا تو اور ہی شے ہوتی ہے اس میں تو بہت کچھ ہوتا ہے اب جیسے ہماری
چراغِ حولی بختی جس میں...“

” یا را اخلاق بھائی۔“ ساجد نے فوراً میری بات کا لیا۔ ” ایک تو میں اس بات سے
بہت تنگ ہوں کہ ادھر سے جو بھی آیا ہے وہ ایک پو دینے کا باٹ اور ایک حولی ضرور

چھوڑ کر کیا ہے ”زور سے ہنسا میں بھی نہس دیا۔ پھر کہنے لگا“ خیر پوچھنے کے باش تو میر ددہ سر
نہیں میں مگر ادھر رہ جانے والی ہو ٹیکیوں نے مجھے بہت پریشان کیا ہے بھائیوں کے نام
دس دس اور پانچ پانچ مرے کے چلاٹ قرویں نسلکے میں مگر نقش بنوانے آتے ہیں تجویلی
کا تصور دماغ میں لے کر آتے ہیں۔ ایک بندرگ مچھے مداٹ دینے لگے کہ میرے عزیزانگانی
کتابہ ہونی چاہیے ستم کا پڑھ لگا میں گے چاہتے ہیں کہ سادون میں بیٹا کے جھوٹے کا کچھ
بندوبست رہے میں نے عرض کیا کہ قبلہ ہمارے پاس دس مرد ہیں ہے آپ نے اپنی
جو خود ریات بتائیں ان کے پیش نظر کوارٹ ایریا خاصاً رکھا گیا ہے مانگنا فی ونگنا فی تو میں جاتا
ہیں۔ چھوٹے سے لان کی گنجائش نکلتی ہے اس میں میری دانست میں تو کچھ پوچھے
لگائے جاسکتے ہیں آپ بے شک بُرگو کا پیٹر کھڑا کر لیں۔“

”وہ تو سب صحیح ہے مگر ایک بات میں خود رکھوں گا کہ آپ نے ارنی ملکہ مغربی طرز تعمیر کو اپنے اوپر آسان سوار کر لیتے ہیں کہ اپنے یہاں کے طرز تعمیر کو ظاہر ہی میں نہیں لاتے یا اس سے نا آشنا ہوتے ہیں نہ یہاں کی آپ دہوا کا الحاظ درستھے ہیں نہ یہاں کے رسم سمن کا۔“

”اخلاق بھائی آپ کو شاید یہ احساس نہیں ہے کہ آپ کا رسن سہن لئا بدل چکا ہے آپ کو شکایت ہے کہ آپ کے مکان کی دیواریں نیچی ہیں اور نیچی چھپتوں دیواروں والے مکانوں کا زمانہ گزر گیا۔ آپ ان کو ٹریشنر رکھا گیا ہے۔

”مگر میں اور کندہ شیر لفورد ڈنہیں کر سکتا۔ خس کی سُٹی البتہ لفورد ڈنہ کر سکتا ہوں۔“
”مگر اخلاق بھائی خس کی سُٹی کو یہ سماں از ماں لفورد ڈنہیں کر سکتا اور جہاں نہ ک
مرچ پتک میں ملا دٹ ہوتی ہے دہاں آپ کو ٹھلی خس کہاں مل جائے گی تو جہاں آئے
مکان کی تحریر میں اتنے لاکھ خرچ کر دیئے ہیں دہاں چند ہزار خرچ کر کے ایک اور کندہ شیر
لے لیجئے۔“

ساجد نے میری ایک نہیں چلنے دی اپنی کہے گیا آخر میں انہوں کھڑا ہوا "ساجد" تم کچھ
ہی کہو مگر تمہارا ایک جرم میں معاف نہیں کر سکتا"

"کی؟"

"تم نے اتنی بڑی عمارت میرے یہے کھڑی کر دی مگر اس میں تم ایک مٹی کی گنجی
پیدا نہ کر سکے۔

ساجد نے قبھرہ لگایا اور چلتے چلتے کہا کہ "اخلاق بجانی آپ

کی ایک مٹی کے یہے میں اپنی ماڈرن آرکٹیکٹ والی روپوشن کو خاک میں نہیں ملا
سکتا تھا"

میں نے جب زبده سے مکان کے اس نقص کا ذکر کیا تو اس نے بھی اس نقص کو
کوئی اہمیت نہیں دی۔ اٹھ مجھے الزام دینے لگی "اخلاق جب مکان بن رہا تھا تو میں نے
تمہاری کتنی منتبیں کی تھیں کہ ان راجح مزدوروں کا کوئی اعتبار نہیں میں ہر وقت ان کے
صریر پکھڑی نہیں رہ سکتی۔ تم بھی تھوڑی بہت نگرانی کر دیا کرو۔ کوئی نقص نظر آئے تو فوراً
ٹوک دیا کرو اس وقت تو تم نے میری سی نہیں اب تم روزگر میں ایک نقص نکال دیتے
ہو" "پھر فوراً ہی اب جان سے مخاطب ہوئی" بوجان آپ سن رہی ہیں اپنے بیٹے کی
باتیں:

بوجان اپنے مراقب میں بیٹھی تھیں ابھی تک انہوں نے ہماری باتوں پر دھیان نہیں
دیا تھا۔ مخاطب کیے جانے پر چونکیں کیا ہوا"

"آپ کے بیٹے کو یہ مکان پسند نہیں آیا۔ کہتے ہیں کہ ناقص بن ہے"

"لے بیٹے کی نقص ہے اس میں"

اب مجھے اپنی بات کی وضاحت کرنی پڑی" بوجان آپ کو چرانغ جویلی کی چھت
یاد ہے چاروں طرف کتنی اچھی جالی بنی ہوئی تھی اور چاروں تکروشوں میں کتنی خوبصورت

برجیاں بنی تھیں اور مٹیاں؟"

بوجان کو اشارہ مل گیا میں جاری ہو گئیں۔ "چراغِ حوتی کی برجیاں تو ایسی خوبصورت تھیں کہ حوتی قلعہ نظر آتی تھی۔ تھی بھی تو اتنی اونچی سُبْشِن سے اس کی برجیاں نظر آنے لگتی تھیں۔ اللہ رحمناگر میں سب سے اونچی عمارت تھی اور یہاں تک کہنا اونچا تھا کہ باختی محظہ ہو دے کے اس میں سے گذر جائے قدم رکھتے ہوئے لگتا کہ قلعہ میں داخل ہو رہے ہیں۔"

چراغِ حوتی کا بلند و بالا چاہنک میرے اخ سور میں گھوم گیا محراجی پیشانی جس پر امیں دو بڑی بڑی تھیں بنی ہو یہیں تھیں خیر وہ تو حوتی تھی اور حوتی کے دروازے ہاتھی کے حساب ہی سے بنائے جلتے تھے چاہیے ہاؤ ڈیور ڈھی میں بندھا ہو یا بندھا ہو پھر آخر ہاتھی کی سواری کرنے والوں کے بھی تو کچھ قدر ہوتے تھے مگر تھوڑے مکافن کے دروازے بھی تھے چوڑے اور اونچے ہوتے تھے۔ دو پیوں والے بیتل کی موٹی موٹی گیلوں سے مرصع کنواڑ، دایمیں دایمیں اونچی چوکیاں ستونوں کے ساتھ، ان کے اندر لبے اور گہرے طاق، چوکھٹ اونچی، کشادہ ڈیور ڈھی، ان دروازوں کے مقابلے میں مجھے آشیانے کا پستہ قد نیکٹ کن بے دقار نظر آیا۔ کوئی ٹھیوں کے گیٹ تو موٹر کے حساب سے بنائے جلتے ہیں مگر عجیب بات ہے میں نے سوچا، سواری کے قد کے ساتھ آدمی کا قد بھی گھٹا بڑھتا رہتا ہے۔

بہر حال میں نے سوچا کہ اب آشیانہ مہم ہو گردد وبارہ تو تحریر ہونہیں سکتا۔ انہیں درود دیوار کے ساتھ گذر سپر کرنی ہے۔ پرسات لگ پکی تھی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ بارشگوار کا ایک پو دالا کرلان کے ایک گوشہ میں لگا دیا۔ پرندوں کو تو کسی زکری طرح آشیانے میں آتا رہا ہی تھا مجھے گمان ساتھا کہ شپہ پرندے مہکتے درخت پر اترنا زیادہ لپسنہ کرتے ہیں۔

برسات کا احوال مت پوچھو۔ سادن کے پیسے ہی ڈونگرے کے ساتھ آشنا نے کی چھتوں نے ٹپ ٹپ شروع کر دی۔ زبیدہ کو اب پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ آشنا نے اتنا بخشنہ نہیں بنائے جتنا دہ سمجھ رہی تھی ایسا سے اپنی چوک کا احساس ہوا کہ لنسٹر ٹرپ نے وقت اور پیدجا کر اس نے نجرا نی نہیں کی تھی۔ ٹھیکیڈار اسے جل دے گیا۔ میٹریل بچا لیا۔ ریت زیادہ کھپا دی۔ چھتوں کو تو سُپکنا ہی تھا بس اس واقعہ کے ساتھ ہی برسات کے باسے میں میرے اور زبیدہ کے رد عمل میں فرق پیدا ہوتا چلا گیا جب گھٹا گھر کر آتی تو میری خواہش یہ ہوتی کہ اسے موسلا دھار بر سنا چاہیے زبیدہ کی دعا ہوتی کہ خالی گرجا کر گذر جائے۔ سو میں ڈونگرے کی اس لگا کر بہ آمدے میں آبیٹھتا اور زبیدہ تسبیح لے کر بچھے حصے میں کھڑے پست قدر کیکر کی طرف دوڑتی۔ یہ کیکر اس زمین میں پہنے سے کھڑا تھا زبیدہ نے تو چاہا تھا کہ اسے کاٹ دیا جائے کہ اس سے تغیریں کھنڈتے نہ رہے مگر میں نہ اسے نہیں کٹتے دیا۔ زبیدہ کو اس برسات میں اس کی اندازت کا احساس ہوا۔ گھٹا جب گھر کر آتی تو وہ تسبیح لے جا کر اس کی شاخ سے باندھ دیتی۔

”یہ کیا چکرے؟“

”یہ بی بی فالملہ کے نام کی تسبیح ہے اسے صحن میں کھڑے درخت میں باندھ دیا جائے تو چہ بارش نہیں ہوتی۔“

”مگر زبیدہ یہ سادن کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہے اور نہ دھوپ اور لوسو سے ستائی ہوئی خلقت کے ساتھ۔“

”ہاں تم یہ باتیں کرتے رہو۔ بارش ہونے کے ساتھ جب چھتیں ٹیکتی ہیں تو صحت تو مجھے جھیلنی پڑتی ہے۔“

چھتیں جیسی پڑتی تھیں ان کا پتہ تو برسات کے واسطے سے جل گیا باقی چمارت کی کیختی کا کس طور پر چلتا۔ مگر اب شک تو پوری عمارت کے بارے میں پیدا ہو۔

گیا تھا کرے کی ایک دیوار میں ڈرار دیکھ کر زبیدہ اس تشویش میں پڑ گئی کہ کہیں عمارت کی بنیاد تو نہیں بلکہ نہیں ہے اب میں نے پڑ لیا پانے ذمہ بیا کہ اسے عمارت کی طرف سے اطمینان دلاؤں" نہیں زبیدہ بنیاد عمارت کی پختہ رکھی گئی ہے:

"کیا پتہ ہے۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا۔" زبیدہ نے افسر دہ بھجو میں کہا اور چپ ہو گئی پھر بولی "میں تو اس وقت سے ڈرتی ہوں جب عمارت سانس لے لے گی۔"

"بات یہ ہے کہ عمارت بن چکنے کے بعد ایک مرتبہ سانس لیتی ہے کوئی کوئی عمارت تو سانس لینے کے ساتھ ہی بلکہ جانی ہے۔"

خیر تشویش لمبی نہیں کھینچی برسات کے ساتھات آئی گئی ہو گئی زبیدہ جیسے بھول ہی گئی ہو کہ کبھی برسات بھی آئی تھی اور تمہیں پہلی بھی تھیں وہ آشیانے کے در در دیوار کے سچے اب اتنی ہی مگن بھی جتنا برسات سے پہنچے ہوا کرتی تھی میں کبھی کبھی یہ اطمینان ہو جاتا تھا۔

"زبیدہ اس گھر میں کوئی خاق نہیں ہے۔"

"خاق؟" زبیدہ نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔

"ہاں ایک دو طاق گھر میں ہونے چاہیے تھے اسی طرز کے محالی شکل والے۔ دیکھو نا۔ جب اب گھنٹوں کے حساب سے جاتی ہے اور تمہیں مومن تباہ کرنے کے لیے کوئی مناسب جگہ میرے نہیں آتی طاق ہوتے تو ان میں شمعدان رکھئے ہوئے مجھے لگتے اور لکرے میں روشنی بھی اچھی ہوتی۔"

"ہاں۔ اور پھر طاق دھوئیں سے رُچ جاتے۔ پھر کرے کتنے خوبصورت لگتے۔" زبیدہ نے طنز پھرے لے چکرے میں کہا۔ چپ ہوئی۔ پھر بولی "اخلاق تمہیں دیہیں رہتے چاہیے تھا۔ اپنی چڑاغ حوصلی میں۔"

بوجان بیچ میں بول پڑیں ” دہن تم نہیں کہتی ہو میاں جان نے تو مرتبے سمجھلیا
کہ جہاں ہو دیں بیٹھے رہو خدا جو دکھائے سو دیکھو۔ میں نے بھی کہا کہ کافی کارے کو سوں
جارہے ہو۔ مگر اخلاق کے باپ کو تو پاکستان سے عشق پوگیا تھا۔ اب دھرمیاں جان
کی آنکھ بند ہوئی ادھر حل پکھرے ہوئے مگر ان کی قسمت میں برداشت نہیں تھا۔ یہاں اگر
کتنے دن جائے۔ ادھر آئے ادھر گئے؟ ”

” ان کے حق میں اچھا ہی ہوا ۔ ”

” اے ہے یہ کیا بات ہوئی ۔ ”

” نہیں کہہ رہا ہوں بوجان۔ کتنے صد میں سے بچے گئے ۔ ”

تو خیر آشیانے کے بارے میں میری بے اطمینانی بھی لمبی نہیں لکھنچی۔ آشیانے ہی
کی تعریف سے پریشان ہوں کا ایک ریلا آیا اور اس بے اطمینانی کو پہاڑ کرے گیا۔ میں نے
بتایا کہ دفتر سے پاؤں بلڈنگ والوں سے مختلف بنجوں سے تو میں نے قرضے
نہیں تھے، آخر میں کچھ دوستوں غریز دن سے بھی چھوٹے چھوٹے قرضے ہی کوئی ” دو دو
ہزار دھائی دھائی ہزار روپے والے لے ڈالے تھے۔ میرا خال تھا کہ کم از کم یہ لوگ میری
مشکلات کو دیکھتے ہوئے تھوڑا توقف کریں گے مگر وہ پاؤں بلڈنگ والوں اور
بنجوں سے بڑھ کر بے صبر بے نکلنے ان سے پہنچے ان کے تعاضے شروع ہو گئے اور
سب نے ایک دم سے تعاضے کیے ادھر ایک بیک سے بھی یاد دہاتی کا پرواز آگیا
کہ آپ نے ابھی تک فسطلوں کی ادائیگی شروع نہیں کی ہے میرے لاتھ پاؤں چھوٹے
” زبیدہ، یہ تو بڑی پیشی کی بات ہے قرض خواہ تو مہلت دینے کے لیے
نیا سہی نہیں ہیں ۔ ”

” ہاں یہ تو بڑی مصیبت ہے کہ بختی مارے ہماری بوٹیاں نوچے ڈال رہے ہیں ۔ ”
” اگر میں ان سب کے قرض اکٹھا چکانا کر دوں تو کھر میں فاقہ پڑ جائیں گے ”

اور پھر بھی سب کی ادائیگی نہیں ہو گی۔ آخر ایک تھواہ میں کستون کو بھگتا دیا گا۔
” اخلاق تھیں اب اور کوئی بیل نکالنی چاہیے ایک سوکھی تھواہ سے اب گاڑی
نہیں بھینچے گی۔ اور تمہاری فوکری میں تو بالائی آمدی بھی نہیں ہے۔“
” آخر کیا بیل نکالی جائے۔ میری تو سمجھ میں کچھ آتا ہے۔“

” سوچو کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔ دنیا کو دیکھو کس کس طریقے سے لوگ کہاں کر رہے
ہیں۔ تمہاری طرح خالی تھواہ پہ سمجھ کر کے تو کوئی بھی نہیں بیٹھا ہوا۔“

قرض خواہوں کا دباؤ، ان سے بڑھ کر زبیدہ کا دباؤ، مجھے اضافی آمدی کے لیے
سبھی سے سوچا پڑا۔ صدیقی صاحب کا خیال آیا اور سمجھا کہ میری مشکلات کا حل نکل
آیا۔ صدیقی صاحب ہمارے دفتر کے اکاؤنٹس سیکشن میں تھے معمولی تھواہ تھی بائیکل
پر دفتر آتے جاتے تھے۔ ایک دن اچانک سکوٹر کو فراٹے سے چلائے ہوئے آئے برقا
کار ان کے سکوٹر کو دیکھ کر حیران بھی ہوئے خوش بھی ہوئے۔ خوشی میں ان سے مٹھائی
بھی لھائی۔ مگر دفتروں میں تاریخ و ایسے بھی ہوتے ہیں جو اُسی چڑیا کے پر گن لیتے
ہیں لیس صدیقی صاحب ایک ایسے ہی رفیق کار کی خصوصی توجہ کا مرکز بنے اور مشکل
میں بھنسپں گئے۔ حساب کتاب میں گھینڈا نکلا۔ بقول بعض لمبا غبن کیا تھا۔ بہر حال خارشیں
کر کے کس کو دبوایا۔ چھرستھے دیدیا۔ دفتر سے فراغت پا کر سارے مجنبھٹ سے
چھوٹ گئے۔ ادھر سے فراغت پا کر اپنا کار دبار شروع کیا۔ ایک ڈائجسٹ نکالا جو چھ
ماہ کے اندرا اندھر بیٹ سید بن گیا اور سال کے ختم ہوتے ہوئے صدیقی صاحب نے
سکوٹر کو رسیٹ کر دیا اور کار خریدی۔ مجھ سے ان کے تعلقات شروع سے خوش ہو گئے۔
پہنچنے آتے تھے۔ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ” اخلاق صاحب کچھ ہمارا باختہ
بنا یئے۔“

” کیسے۔“

”بچھہ ہمارے لیے نکھلے“

”صلیقی صاحب کسی باتیں کرتے ہیں لکھنے والوں سے لکھوائے میرا اس فن شرف ہے کیا تھا تھے؟“

”آپ نے اتنی کتابیں پڑھی ہیں لکھنا چاہیں تو آپ لکھ بھی سکتے ہیں“

”کتابیں پڑھنے کا یہ مطلب تو ہیں ہوتا کہ اسے لکھنا بھی آتا ہو۔ میں کتاب پڑھتا ضرور ہوں، لکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا“

”اخلاق صاحب ایک مرتبہ آپ قلم اٹھانے کے پھر آپ دیکھیں گے کہ آپ میں لکھنے کی کتنی صلاحیت ہے یوں لکھیے کہ ہمارے لیے انگریزی سے کسی جاسوسی ناول کی تلخیص کر دیجئے ان ناولوں پر تو آپ کی نظر ہو گی“

”نہیں صدیقی صاحب، یہ کام میرے سب کا نہیں ہے“

”آپ ہم ت تو لکھیے اور ایک بات میں عرض کر دوں آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی یہ گارنٹی دیتا ہوں کہ ایک سال کے اندر اندر آپ رکشادوں کے جھیل سے نکل جائیں گے۔ چار پہلوں والی آپ کے قدموں تے ہو گی۔

میں نے مشکل سے جان چھڑائی مگر تھوڑے عرصے کے بعد صدیقی صاحب پھر آکر مجھ سے ملے۔ اب کے ان کارنگ اور تھاں کہنے لگے۔ اخلاق صاحب آپ کی نعلوں سے اور اللہ تعالیٰ کے خصل و کرم سے پیسہ تو ہم نے دال روٹی لائیں کمالیا ہے اب سوچتے ہیں کہ پاکستان کی بھی کچھ خدمت کرنی جا جیئے“

”اچھا خیال ہے“ میں یہی کہہ سکتا تھا اور کیا کہتا۔

”اس کا خیال مجھے مل ایسٹ کا دودھ کرتے ہوئے آیا۔

آپ کو پتہ ہے کہ ہمارا ڈائجسٹ ڈل ایسٹ میں بہت نکلتا ہے میں نے چھلے دنوں دیاں کا ایک سروے کیا۔ بہت بڑی مارکیٹ ہے صاحب۔ اور بہت امکانات

ہیں کوئی کام کرنے والا ہے۔ اس وقت تو رہاں انڈیا چھایا ہوا اور صاحب کس کمال سے وہ اپنے لکھر کا پروجیشن کرتے ہیں دہاں سے مجھے خیال آیا کہ ہم دہاں پاکستان کا پروجیشن کیوں نہ کریں۔ آخر تکاری بھی ثقافت ہے ادب ہے، آرٹ ہے تو اس سلسلہ میں آپ ہماری کیا سرد کریں گے۔ مجھے لکھنا پسند کریں گے کوئی کتاب بس ایسی کہ پاکستانی لکھر پر حرف آخر ہو۔ بہت ضرورت ہے ایسی کتاب کی۔"

"صلیقی صاحب آپ کو پتہ ہی ہے کہ لکھنے کے معاملہ میں میں صفر ہوں" خیریہ تو آپ کی کسرِ شخصی ہے اچھا اس پر بعد میں بات کریں گے۔ بہر حال اس معاملہ میں آپ ہمیں مشورہ تو دے سکتے ہیں؟"

"ہاں اس کے لیے حاضر ہوں۔ پتہ ہمیں میرشورہ آپ کے کام آسے گا یا نہیں۔"

"یہ آپ ہم پر چھوڑ دیجیے بس آپ ہمارے مشیر بن جائیے اور اس مقصد کو پیش رکھتے ہوئے کوئی منصوبہ بنادیجیئے اور میری طرف سے آپ کو کوئی شکاعت کا موقعہ نہیں ملے گا پوری خدمت کر دیں گا"

میں نے دھدہ کیا اور چلا آیا۔ مگر ہوا یہ کہ اسی دردان میں تحریر کا بھی پر اشتراک ہو گیا اور مکان کی تحریر تو یہی ہی آدمی کی مت مار دیتی ہے سو دعده پورا کرنے کی توہنی ہی نہیں آئی۔ صلیقی صاحب کا ایک دو مرتبہ پیغام بھی آیا۔ مگر میں مکان کے جھیلے میں الیسا پہنچا ہوا تھا کہ ان کے پاس جا ہی نہیں سکتا۔

میں نے سوچا کہ صلیقی صاحب سے چل کر بات کرتے ہیں ادب اور فنون پڑیف کے ذیل میں کیچھ پیش کرنا چاہیے اور کس طرح پیش کرنا چاہیے اس پر بہت سوچ بچار کر کے میں صلیقی صاحب کے پاس پہنچا۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے بہت تپاک سے ملے جب میں نے انہیں ان کا منصوبہ یاد دلایا تو افسر دہ بوکر بولے کہ "اخلاق صاحب آپ کے پیچھے ہم اتنا دوڑے اور آپ ہاتھ نہیں آئے اب

زدہ دیلا ہی نگیں:

”کیوں کیا ہوا۔ پاکستان کو اب اپنے پر جنگیں کی ضرورت نہیں رہی۔“

”نہیں یہ بات نہیں ہے اصل میں مارشل لانے تو سارے بیش ہی کوٹھپ کر دیا، اور پری سنرشر نے تو ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کوئی معقول کتاب چھاپی ہی نہیں جاسکتی۔“

دلیل دل کو لگنے والی تھی۔ میں ناٹک ہو گیا۔ خیر دیتا ہم ادھرا۔ ہر کی بائیں کرتے رہے گزرے ہوئے اچھے زمانے کی بائیں کر کے اپنے آپ کو تسلیم دیتے رہے بائیں کرتے کرتے صد لقی صاحب بولے ”اخلاق صاحب ایک پر جنگیٹ ہے سی میں آپ ہمیں کچھ مشورہ دیجئے۔“

”کی؟“

”اسلامی بنکاری پر ایک کتاب لکھوانی ہے اس کے لیے کوئی ادمی تجویز کیجئے۔“

”صد لقی صاحب اس کے لیے تو کسی ماہر اقتصادیات سے رجوع کیجئے۔“

”معاف کیجئے میں نے انہیں ٹوہ کے دیکھیں ہے اسلام کے متعلق وہ کچھ جانتے۔“ تھوڑا رک کر اخلاق صاحب آپ اس موضوع پر لمحیں توکیا رہے۔

”میں؟“ اس تجویز پر میں حیران رہ گیا۔ صد لقی صاحب اس موضوع پر تو میرا کوئی مطلع نہیں ہے۔“

”اخلاق صاحب ہمیں کوئی فاضلانہ مقالہ درکار نہیں ہے لیس سوٹی موٹی بائیں ہونی چاہیں۔“

میں نے بڑی مشکل سے اس پیشکش سے سچا چھڑایا۔

”اچھا خیر اس پر جنگیٹ کو جھوڑتے ہیں ایک اور پر جنگیٹ میرے ذہن میں ہے آپ فارسی تو ماثر اللہ خوب جانتے ہیں مجھے یاد ہے آپ حافظ شیرازی کے

شر بہت سنا یا کرتے تھے ہم آپ کی فارسی دانی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں؟"

"اچھا خیال ہے لائے آپ کے یہ ہم حافظ کا ایک انتخاب کیے دیتے ہیں؟"

"حافظ کا انتخاب" صدیقی صاحب سوچ میں پڑ گئے "نہیں اخلاق صاحب."

حافظ کا زمانہ گزر گیا اب اسے کون پڑھتا ہے؟"

"صدیقی صاحب آپ کسی باتیں کرتے ہیں حافظ تو سدا بھار ہے؟"

"اے اخلاق صاحب حافظ کو قواب ایران میں بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ اس وقت

تو ایسے شاعر کو پسند کیا جاتا ہے جس کے پاس دینے کے لیے پیغام ہو۔ بھل دبیں اور جام و سبو والی شاعری تو زوال کے زمانے کی یادگار ہے؟"

میں نے صدیقی صاحب کو حیرت سے دیکھا "صدیقی صاحب آپ بھی انقلابوں
والے روزمرہ میں باتیں کرنے لگے؟"

"لاؤں دلاقرہ - انقلابوں پر تو میں لخت بھیجا ہوں انہوں نے تو ملک کا
ٹیکا غرق کیا ہے ساری نئی نسل کو لا دین بادیا۔ صاحب میں تو اسلامی انقلاب
کا قائل ہوں۔ ہاں لیجئے وہ بات تو بیکھ میں ہی رہ گئی۔ ہمارے پاس ایران سے
اسلامی انقلاب کے بارے میں بہت سفر بھر آیا رکھا ہے اسے سامنے رکھ کر ارد ڈیں
اسلامی انقلاب کے بارے میں ایک بہت اچھی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اخلاق حسنا۔
آپ یہ کام کر سکتے ہیں اس میں اردو کی بھی خدمت ہے اور اسلام کی بھی ہے۔"

"لوو میں؟ نہیں صدیقی صاحب میرے لیے پہنچمت
انجام دینا ذرا مشکل ہے؟"

"اچھا" صدیقی صاحب مایوس ہو گئے "آپ کی خوشی۔ پھر کوئی آدمی یہیں بتائے
فالم فاضل آدمی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس فارسی کی شدید بُرھ رکھتا ہو۔ میریل
سارا ہم مہیا کریں گے اسے تو بس دائیں باعثیں کرنا ہو گا"

میں کتنے مشکلوں سے جان تھڑا کر دیاں سے واپس ہوا۔ گھر پہنچ کر دیر تک میں دھیر ہوا پڑا رہا۔ جیسے پھر دھوکہ آیا ہوں۔

"اخلاق کی بات ہے بہت چب چب نظر آرہے ہو۔"

"آج میں صدقی صاحب کے پاس گی تھا۔"

"ماں ہاں وہ تو مجھے یاد ہی نہیں تھا۔ ان سے کوئی بات طے ہوئی؟"

"نہیں۔"

"نہیں؟ تم تو بڑے بیٹے سے تھے کہ ان کے ساتھ معاملہ طے ہو جائے گا۔"

"پس جو انہوں نے بات کی تھی میں اس حساب سے تو پک رہا تھا۔"

"اب کیا ہو گیا۔"

"اب؟ اب یہ ہوا کہ زمانہ بہت آگئے نکل گیا، میں بہت پچھے رہ گیا ہوں۔"

زبیدہ بھٹھ سگئی۔ خاموشی سے اٹھی اور چین میں چلی گئی۔ دیر بعد کچن سے خلی آر پچھوڑے والی دیوار کی طرف چلی گئی۔ دیاں پڑی ہوئی دو ایشور پر پنجھے ٹکا کر ہیڑیاں اٹھا کر دیر تک پچھوڑے کے منظر کا جائزہ لیتی رہی۔ زبیدہ کا اب یہ طور بن گیا تھا کہ دن میں ایک دفعہ ضرور جب بھی اسے گھر کے کاموں سے فراغت ہوئی یا جب بھی گھر کے کاموں سے بور ہو جاتی اس طرف جاتی اور پچھوڑے کا مشاہدہ کرنے لگتی۔ گھر کی چار دیواری میں بند عورتوں کو باہر جھانکنے کا کتنا شوق ہوتا ہے باہر کھلنے والی کھوئی کھڑکی یا ایسی دیوار جہاں سے باہر جھانکا جا سکے ان کا مر جمع بن جاتی ہے۔ کس شوق کے ساتھ وہ دیاں سے باہر کا نظارہ کرتی ہیں یہ ان کی آڈنگ ہوتی ہے باہر دیکھنے کے لیے بیٹک کچھ نہ ہو سکن نظر کو منظر کی یکسانیت سے تو نجات ملتی ہے

چار دیواری کی تنگی سے نکل کر ایک کشادہ فضائیں نظر کو سفر کا موقعہ میرا تابے نظر کے ساتھ ذات بھی ایک وسیع تر دنیا میں سانس لیتی محسوس ہوتی ہے آسا تو تھا ہی مگر زبیدہ کے یہے اس مشغد میں شاید اس سے زیادہ نہیں تھے مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس واقعہ کے بعد سے پچھواڑہ زبیدہ کے یہے زیادہ پُرمحتی زیادہ پُرسار بنتا چلا جا رہا ہے۔

بوجان نے براہمے میں اپنی چوک پہ بیٹھے بیٹھے کتنی مرتبہ بچیتی کے ساتھ زبیدہ کو دیکھا۔ آخر ضبط نہ ہوا۔ پکاریں ”دہن بس بھی کرو۔ آجاؤ۔“ زبیدہ ادھر سے واپس ہوئی اور بوجان کے پاس آ بیٹھی۔

”دہن یہ جو تم وقت بے وقت ادھر جا کھڑی ہوتی ہو یہ بات بھی اپنی نہیں لگتی۔ مت جھانکا کرو ادھر مجھے تک آ دے بے۔“

”بوجان اس روز کے بعد سے تو ادھر ایسا نہ ہوا ہے کہ نہ کوئی آدمی نظر آتا ہے نہ کوئی آدازمندی دیتی ہیں۔“

”رات کو تو بہت آوازیں نہیں دیتی ہیں کہ بخت چوک والا آدمی رات سے جو آوازیں لگانی شروع کرتا ہے تو فجر تک لگاتا ہی رہتا ہے۔“

”مگر دن میں جانے سب کہاں دن ہو جاتے ہیں۔ ہو کا عالم ہوتا ہے پھاٹک بھی بند پڑا رہتا ہے میں تو جالتوں اس روز کے بعد سے کھلا ہی نہیں جیسے اب اندر کوئی ہے ہی نہیں۔“

بوجان نے لمبا مھنٹاں سانس لیا ”جانے کس ماں کے لال تھے۔ تینوں جوان تھے۔ بچا رے۔“

”بچا رے تو وہ نہیں تھے۔“

”دہن بھیں کیا پتہ کہ وہ کون تھے کیا کیا تھا انہوں نے۔“

”بوجان آخر کچھ تو انہوں نے کیا ہو گا کہ، اگے کچھ کہتے کہتے زبیدہ
مجھ پر کئی۔

”ماں کچھ تو کیا ہو گا؟“ بوجان چپ ہوئیں پھر سوچتے ہوئے بولیں ”پتا نہیں
کہنتوں کے دماغ میں کیا کہرا مکلب یا تھایا آنکھوں پر پردے پڑ گئے تھے“ بوجان
چپ ہو گئیں۔

زبیدہ بھی جواب میں کچھ نہیں بولی۔ کتنی دیر بوجان کے گھستے سے لگی بیٹھی رہی
مگر چپ۔

۶

تحکماں را میں دفتر سے آیا ہی تھا کہ زبیدہ نے ایک لمبا سالغافرہ ٹھہر میں پکڑا دیا۔

”کیا ہے یہ؟“

”پڑھلوت“

میں نے لفاف الٹ پلت کر دیکھا کہ کہاں سے آیا۔ پاؤ منگ فناں کار پورش کی طرف سے نکلا۔ اچھا، اچھا۔ قسط کا تقاضا کیا ہو گا۔ تھیک ہے۔ اب ہمیں انہیں باقاعدگی سے ادا میگن شروع کرنی چاہیے۔“

”تقاضا نہیں تو شُس ہے“ زبیدہ نے جلے کئے ہجھ میں کہا۔ ”چھ بنت کی خبر ہے۔ وہ ہمارا گھر نیلام کرنے لگے ہیں۔“

میں نے یہ سنتے ہوئے جلدی سے لفاف چاک کیا۔ جلدی جلدی پڑھا۔ واقعی وہ تو نوش تھا اور نوش بھی ایسا ویسا نہیں۔ خبر داہ کیا گیا تھا کہ پچھلی ساری قسطیں معہ سو در پندرہ دن کے اندر ادا کر دی جائیں۔ بصورتِ دیگر محکم مکان کو نیلام کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ میں پریشان ہوا کہ پندرہ دن کے اندر اندر اتنی لمبی رقم کا انتظام کہاں سے کروں گا۔ کیسے کروں گا۔ مگر چھرے سے میں نے اپنی پریشانی ظاہر نہیں ہوتے دی۔ کچھ ایسا آثار دینے کی کوشش کی جیسے یہ کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ قدرے پے اعتنائی سے کہا۔

”اچھا دیکھتے ہیں؟“

زبیدہ کو ایسے خشک رد عمل کی باکل توقع نہیں تھی۔

”غور سے پڑھا بھی ہے۔ بے پرواٹی سے کہہ دیا کر دیکھتے ہیں۔ کیا دیکھو گے۔ آتی لمبی رقم کا انتظام پندرہ دن میں کہاں سے ہو جائے گا۔ میں پہلے ہی کہتی تھی کہ دیکھو میں ہمینے کے ہمینے ادا کرتے۔ ہونہیں تو بہت سوچ رکھ چاہئے گا۔ مگر تم نے میری ایک نہ سئی“
 ”زبیدہ تمہیں پتہ ہے کہ ہمینے پر کتنی قسطیں ادا کرنی پڑتی ہیں۔ جس قسط کو وہ کتا
 اسی کی طرف سے نوش آ جاتا تھا۔ بہر حال کسی نہ کسی کی قسط تو مکنی ہی تھی“
 ”لیکوں دکنی تھی؟“

”جہاں جہاں سے ہم نے مکان کے قرض لیا تھا ان سب کی قسطیں باقاعدگی
 سے ادا کی جاتیں تو ہم کھاتے کیا۔ گھر کے خرچ کے لئے کوڑی نہیں بھنی تھی“
 ”مزکھاتے فاقہ کر لیتے؟“

اس پر مجھے یاد آیا کہ جب مکان کی تعمیر کے دران قرضے پر قرضہ لیا جا رہا تھا اور اس
 پر میں نے فکر مندی کا انہمار کیا تھا تو زبیدہ نے اسی قسم کا اعلان بڑے اعتماد سے کیا تھا
 کہ اپنا گھر بن جانا چاہیے، سب قرضے ادا ہو جائیں گے، اپنا گھر ہو تو آدمی فاقہ بھی کر سکتا
 ہے۔ نہیں کہا میں گے، تر نوالہ، روکھی سوکھا کھا کے سب قرضے آتار دیں گے۔ مگر مکان بن
 جانے کے بعد زبیدہ نے اس اعلان کو کہاں یاد رکھا۔ گھر کے اخراجات اسی طرح جاری ہے
 بلکہ نئے مکان کی فرنٹگ کے چکر میں اخراجات کچھ بڑھ ہی گئے۔ اور میں قرضوں میں جکڑا
 ہوا تھا۔ ہر قرضے کی شرط یہ تھی کہ قسط ماہانہ ادا کی جائے۔ میں پریشان کہ یا اللہ کو نسی قسط
 ادا کروں کوئی ادا نہ کروں۔ جس قسط سے ذرا بھا تھا کہیں اس قسط کے سلسلہ میں پادری کا
 پرواٹ موصول ہو گیا۔

اصل میں اپنے گھر کے ہنی مون کی درست بہت مختصر ہی۔ ابتداء کے دن تو خوشی خوشی

گزد گئے۔ خوشی سی خوشی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ پڑھلا کر اپنے بنائے ہوئے گھر میں بس رکرنے کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ کتنا اطمینان، کتنا آسودگی ہوتی ہے اپنی دُالی ہوئی چھت تلے سونے جانے میں۔ مگر جب قسطلوں کی ادائیگی کا مرحلہ آیا اور یاد دپانیوں کے پرداں آنے شروع ہونے تو پھر تصویر کا دوسرا درج سامنے آیا۔ بوجان نے تو مجھے بس یہ تصویر دکھائی تھی کہ آدمی کا اپنا کونہ نہ ہو تو بے ٹھکانا رہتا ہے۔ سارے مزاحمت کے باوجود یہ خیال میرے اندر سرایت کر گیا۔ لگنے لگا کہ میں اسی باعث اکھڑا بھرا بھرتا ہوں کر پناکوئی مٹھپا نہیں ہے۔ اگر اپنا مکان بناؤں تو زندگی میں ایک جفا و آجائے گا۔ مگر مکان بنانے کے تصور ہے، ہی دن بعد کھلا کر میں تو اور بھر گیا ہوں۔ پاؤ سنگ فناں کا روشنی میں، بیکوں میں، اپنے دفتر کے اکاؤنٹ سکیشن میں۔ کہاں کہاں بھرا پڑا ہوں۔ شاید یہ اس نے زمانے کی زندگی کا خاص سر ہے کہ آدمی جتنا اطمینان کے لئے جتن کرتا ہے اتنا ہی اپنی پرہیزا تیوں میں احتفاظ کرتا ہے، آسائش کے جتنے اساب مہیا کرتا ہے اتنا ہی بے آرامی کا سامان کرتا ہے جتنا زندگی میں ترتیب کا اہتمام کرتا ہے اتنا ہی بھرتا چلا جاتا ہے اور اپنا مکان، یہ تو بور کے لڈو ہیں کہ کھائے تو بچھائے زکھائے تو پچھائے۔ بہر حال اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس پچھتاوے سے تو اپنی وہ حسرت تعمیر ہی اچھی تھی۔

”خراں وقت تو جی جلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، میں نے قصہ منتشر کرنے کی کوشش کی۔“ صبح دفتر نہیں جاؤں گا۔ اسی مارپی نکلوں گا۔ کچھ نہ کچھ بندوبست ہو ہی جانے گا۔“

”اگر تم ایسے ہی بندوبست کرنے والے ہوئے تو پہلے نہ کر لیتے۔ آج کہہ رہے ہو کہ کل کچھ کروں گا۔ محل کہو گے کہ پرسوں کروں گا۔ بس اسی آج محل میں میعاد گزد جائے گی اور وہ کمجنگی مارے ہمارے گھر کی بولی لگانے کے لئے آن و حکیں گے۔“

بوجان کہ اب تک خاموش بیٹھی تھیں ترپ کر لوں۔ ”خاک بھو محل ان منہ جھبلوں

کے منہ میں آئے بڑے کہیں کے ہمارے گھر کی بولی لگانے والے۔

"اچھا صبح تو ہونے دو۔ کل دیکھیں گے تھے میں نے ایک مرتبہ پھر قصہ مختصر کرنے کی کوشش کی۔"

"جب میں نے کہا تھا کہ ایک من چاول کا بندوقیت کر دو، اچھے بُے وقت کیلئے گھر میں پڑے رہیں گے تو اس وقت بھی تم نے یہی کہا تھا کہ اچھا کل کچھ کر میں گے یہ "ایک من چاول" بوجان بولیں" ایک من چاول میں دلہن تم کتنے دن نکال لوگ شیطان کے کان بہرے، اگر دلکا فساد شروع ہوا تو جلدی تو نہیں نسبٹ جائے گا۔

"ایک من چاول۔ اے دلہن خالی ایک من چاول سے کیا بنے گا۔ بازار تو ساتے پٹ ہو جائیں گے۔ کوئی چیز نہیں ملے گی"۔

"بوجان آتا تو بھرا رکھا ہے اور منگا کے رکھ لوں گی۔ دالیں بھی بھری رکھی ہیں"۔

"ارمی وہ تو مہینے کے خرچ کی ہوں گی۔ اس وقت گوشت تو علے دلے گا نہیں، دالوں پہ ہی گذا دہو گا۔

"سب دالیں منگا کے رکھ لو۔ نون مرچ دھنیا، لہن پیاز ہر چیزوں وقت کا کوئی پتہ تھوڑا ہی ہے"۔

میں نے بوجان اور زبیدہ کی یہ گفتگو حیرت سے سنی۔ لگتا تھا کہ ساس بہوں بخیگی سے کچھ بڑے مسائل پر تبادلہ خیال ہوا ہے اور بعض انتظامی امور طے ہوئے ہیں اور یہ کہ مجھے اعتماد میں لینے کی قطعی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

"قصہ کیا ہے۔ کیا جنگ چھڑنے والی ہے؟"

"سن رہی ہو بوجان، تمہارے بیٹے کیا پوچھو رہے ہیں"۔ زبیدہ کا ہجہ سخت طنز یہ تھا۔

"میرے لال، دنیا میں رہتے ہو تو دنیا کی خبر بھی رکھا کرو۔ تم تو باہر گھومنے

پھر نے دلے ہو، تمہیں تو زیادہ پتہ ہونا چاہئے۔ ہم گھر میں بیٹھے اتنا کچھ سن رہے ہیں۔
نصیبین بوآ بتا رہی تھی کہ دونوں طرف جھڑپیں تیز ہو رہی ہیں۔ وہ قسلام ہو گا کہ خون
کی ندیاں بہہ جائیں گی یہ

”اچھا؟“ بوجان کی باتوں سے میں محظوظ ہونے کے موڑ میں تھا۔

زبیدہ نے پھر نشرت چلا یا۔“ بوجان اپنے بیٹے کا جواب سن لیا۔ مجھے بن کر پوچھ رہے ہیں کہ اچھا۔ ان کی اُنہیں باتوں پر تو میرا جی جلتا ہے۔“

”بیٹے، میرے چاند، تم کس مراق میں رہتے ہو۔ چاروں طرف سورمچا ہوا ہے۔
تمہیں کسی بات کی کوئی خبر ہی نہیں ہے؟“

”بس اُنہیں اتنا ہی پتہ ہوتا ہے جتنا کام ریڈ اُنہیں بتا جاتا ہے۔“

”مگر بخت مارے کام ریڈ کو تو دنیا کی ہر بات کا پتہ ہوتا ہے۔ اسے اور کام
ہی کیا ہے۔ جو روز جاتا گھر نہ بار۔ ٹک کے کہاں بیٹھے۔ جلے پاؤں کی بلی جنا گھومتا
رہی رہتا ہے۔“

”جب وہی تو لوگ اس پر انگلیاں اٹھاتے ہیں۔“ زبیدہ کہنے لگی۔ نصیبین بوآ
مجھ سے پوچھنے لگی کہ یہ آدمی تمہارے گھر کیوں آتا ہے۔ میں نے کہا کیوں بات ہے کہنے
لگی کہ یہ تو دوس کا جاسوس ہے۔ بوجان یہ سن کے ایک دفعہ تو میں ناٹے میں آگئی۔“

”اچی کوفی رو دوس کا جاسوس ہے تو ہوا کرے، ہمیں کیا ہم کو نسا رو دوس کے خلاف
مسکوٹی کرتے ہیں۔ پھر بھی اگر کوئی لگائی بجھائی کرتا ہے تو کرے، ہماری جوتی سے
رو دوس سے۔ ہمارا کو نسا یہاں دنیا ہے۔ جو وہ ہمیں دیتا ہو وہ نہ دے۔“

میں نے دیکھا کہ بات قسطلوں کی ادائیگی کے مشکل سے چل کر رو دوس پر پہنچ گئی
ہے۔ میں نے یہ موقع غنیمت جانا۔ اب زبیدہ کی طرف سے کسی نشرت کا اندر لشہ نہیں بھا۔
اوھر ادھر کی بات کر کے قصر تخت قصر کیا اور بوجان کو احساس دلایا کہ ان کے دعا پڑھنے

اور سونے کا وقت آن پہنچا ہے۔ بوجان فوراً ہی اُنہوں کھڑی ہوئیں۔ ادھر میں نے بھی اعلان کر دیا کہ بہت تھکا ہوا ہوں! بس سونا چاہتا ہوں۔

زبیدہ نے صبح ہی جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔ وہ دن تواب گذر گئے تھے جب اس گھر میں ترک سے میری آنکھ کھل جاتی تھی اور بھر میں اس گھر میں چڑھنے والی تازہ تازہ صبح کا لطف اٹھاتھا۔ دیر سے اٹھنے کا معمول واپس آگیا تھا۔ وہی پرانا دستور کہ زبیدہ نے جھنجھوڑا۔ ”احی آج تھیں دفتر جانا نہیں ہے“ خیر یہ جملہ تو بہت پرانا ہو گیا تھا۔ نے گھر میں آ کر جگانے کے کچھ نئے بہانے پیدا ہو گئے تھے۔ ”کچھ یاد ہے آج آپ کو قسط جمع کرنی ہے؟“

”اٹھنے نا۔ آج بنک بھی جانا ہے۔ پر اپنی میکس جمع کرانے کی آج آخری تاریخ ہے۔“ دیسے آج زبیدہ نے اس قسم کا کوئی نوٹس نہیں دیا۔ لیں جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔ شاید مزانح کی درسمی کسی قدر ابھی باقی نہیں۔

میں اُنہوں کر باتھر و م گیا۔ نہایا دھویا۔ برآمدے میں آ بیٹھا۔ فوراً ہی سامنے ناشترہ آگیا۔ ناشترہ کے آتے ہی صبح کے مہماں بھی ایک ایک کر کے آن موجود ہوئے اور مجھے لگا کہ جیسے میں نئے مسرے سے اکٹھا ہو رہا ہوں۔ رات تو زبیدہ کی باتیں سن کر بالکل ہی بھر گیا تھا۔ ایک محذوب کے متعلق سن رکھا تھا کہ رات کو سوتے وقت ان کے اعضا بھر جاتے تھے، صبح ہوئے پر اعضاء بیکھا ہوتے اور بزرگ صبح و سالم اُنہوں کھڑے ہوتے۔ مگر میرے اعضاء دن نکلنے کے ساتھ بھرنے شروع ہوتے۔ لیں ادھر گھر سے قدم نکالا اور اعضا بھرنے شروع ہوئے۔

ہاں تو میں اپنے صبح کے مہماں کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ بھی بتاتا پڑے گا کہ ان مہماںوں کی آمد کی تصریب کیسے پیدا ہوئی برآمدے کے سامنے لپٹنے مختصرے سبزہ زار میں جو ہار سنگھار لگایا تھا وہ اب اچھا خاصا بڑا ہو گیا تھا۔ اس کے قریب انار۔ انار کے قریب

گروندا۔ یہ چراغِ حجیل کی طرح کوئی لمبے چورٹے احاطہ والا گھر تو تھا نہیں کہ نیم اوپا میں جیسے اوپنے پیڑ لگائے جاسکتے۔ یہاں تو چھوٹے قد اور کم پھیلنے والے درخت ہی لگائے جاسکتے تھے۔ سو ماہ سنگھار، انار، مگر وندرا۔ ساتھ میں چند پودے اور بیلس۔ یہی بیلا، چنبیل، موتیا، اگلاب ان میں کسی کی نیل کسی کا پودا۔

ان پیڑ پودوں کی وجہ سے اپنا یہ چھوٹا سا گھر جلد می شاد آباد ہو گیا۔ کیا کیا مہاں بیان، اگر اتراتا تھا۔ یہ جو خاکستری رنگ کی چڑیاں ہوتی ہیں ان کا کیا ہے جہاں نام کو بھی دانما ذکر کا دیکھا ہے آن انکھی ہوتیں۔ ہر گھر میں اپنے لئے جگہ پیدا کر لیتی ہیں۔ کڑیوں والے مکانوں میں انہیں اپنے گھر بناتے کی زیادہ سہوتیں حاصل تھیں۔ ذرا کڑی جھکی اور انہوں نے چار تینکے چن کر اپنا گھونسلہ بنایا۔ چھتیں کڑیوں سے بے نیاز ہوتیں تو پھر ان کی ساری توجہ روشنداں پر ہو گئی۔ گھر میں جب گھونسلہ بنایا تو پھر گھر کے کھانے پینے میں بھی برابر کی شریک ہو گئیں۔ خیرا بھی اپنے گھر کا کوئی گوشہ ان کے گھونسلوں کی نزد میں نہیں تھا۔ مگر صبح کے ناشستہ میں شریک ہونا ان کی عادت بنتی جا رہی تھی۔ شلیدن بکلی تھی۔ سیدھی وجہ یہ تھی کہ جب سے میں یہاں مستقل ہوا تھا، مگرے میں بند ہو گر ناشستہ کرنے کا طریقہ میں نے ترک کر دیا تھا۔

بڑا مدد میں بیٹھ کر ناشستہ کرتا تھا۔ مجھے تو پتہ بھی نہیں چلا کہ اس نیک رسم کا آغاز کیسے ہوا۔ بس مجھے رفتہ رفتہ اس کا احساس ہوا کہ جب میں صبح ہی صبح برآمدے میں بیٹھ کر ناشستہ کرتا ہوں تو آس پاس کچھ چڑیاں بے چین بے چین سی نظر آتی ہیں۔ کوئی کوئی بے تاب ہو کر میز پر آن بیٹھتی ہے اور پیٹ میں رکھے تو س کو ندی میں دیدوں سے دیکھتی ہے۔ یہ دیکھ میں نے کھلے دل سے ان چڑیوں کا خیر مقدم کیا اور اپنے ناشستہ میں انہیں مستقل شریک بنایا۔ تو س کے کنارے ریزہ ریزہ کر کے ڈال دیتا۔ وہ بُسے شوق سے ان ریزوں کو چھتیں اور دم بھر میں چٹ کر جاتیں۔ اس

روز روزگی خاطرداری سے ان کی بے تکلفی اتنی بڑھ گئی کہ کوئی کوئی اُد کرنا شرکی میز پر آن سمجھتی۔ تھوڑی دیر دور دو رپچھد کرتی۔ پھر ایک دم سے قریب آگر میرے سامنے رکھے تو س پر چونچ مارتی۔ چڑیوں کی اس بے تکلفی پر اعتراض نہیں۔ اعتراض اس با پر ہے کہ اتنے قرب اتنی بے تکلفی کے بعد بھی پڑیاں آدمی پر اعتبا۔ نہیں کرتیں۔

بہت وہی اور شکی ہوتی ہیں۔ اعتباً کر کے بھی اعتبار نہیں کرتیں۔ ذرا کھٹکا ہوا وہ بھرا کھا کر اڑ گئیں۔ کوئے کام عاملہ تو یہ ہے کہ وہ تو سرے سے اعتباً کرتا ہی نہیں۔

مریضانہ حد تک شکی۔ ہر وقت کان کھڑے رکھنا سمجھتا ہے کہ ساری دنیا اُس کے درپسے ازار ہے۔ روشنی کا تکڑا دالو، فوراً آتے گا۔ مگر تکڑا دلانے والے پر اعتباً کر لے یہ نہیں ہو سکتا۔ تو کوئے نے تواعتباً کرنا سیکھا ہی نہیں۔ اس لئے اس کی کسی حرکت سے صدمہ بھی نہیں ہوتا۔ مگر پڑیاں تو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ انہیں آپ پر بہت اعتباً ہے اور پھر اچانک کسی فدائی بے معنی سی بات پر اپنی بے اعتباً کا اعلان کر دیتی ہیں۔ میں سمجھتا رہا کہ میں نے ان کا بہت اعتباً حاصل کر لیا ہے۔ مگر کبھی زور سے کھاش دیا یا چینک آگئی تو آن کی آن میں انہوں نے سارے آپ کے اعتباً کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا۔ بھسر اکھا کر یہ جا وہ جا چاہے وہ اس کے بعد فوراً ہی واپس آ جاتیں مگر ایک مرتبہ تو ظاہر کر ہی دیا کہ انہوں نے مجھ پر کچھ زیادہ اعتباً نہیں کیا تھا۔

خیر پڑیاں اعتباً کریں یا نہ کریں۔ مگر تکلف نہیں کرتیں۔ کھانے پینے کے معاملہ میں بہت ہی بے تکلف واقع ہوئی ہیں۔ تو صبح کے ناشتر پر وہ بہت بے تکلف سے میرے قریب آ جاتیں۔۔۔ مگر بیل کے یہاں تکلف بہت ہے۔ میں تو س کے کنارے ریزہ ریزہ کر کے قریب ہی دال دیتا۔ چڑیاں بے تکلف اُتر آتیں اور چک لیتیں۔

ایک دن دیکھا کہ ایک بیل آس پاس منڈلا رہی ہے۔ قریب آنے سے جھجکتی ہے۔ میں نے اس کی جھجک کا احترام کرتے ہوئے تو س کے تھوڑے ریزے سامنے والے

پار سنگھار کے بھر دیئے اور خود واپس آگر برآمدے میں اپنی جگہ آن جیٹھا۔ بلبل کسی قدر تماں کے بعد اناس کی شاخ سے اڑ کر پار سنگھار پر آئی۔ بھر جھوکتی جھوکتی شاخ سے اُتر اور ایک رینہ چونچ میں دا ب پھرتی سے اُڑ پھر شاخ پر جا بیٹھی۔ پھر اس نے مجھ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ میری حرکات و سکنات کا جائزہ لیا۔ پوری طرح اطمینان کر لینے کے بعد پھر شاخ سے اُتری۔ بھر ایک رینہ چونچ میں دا با اور بھرا سی پھرتی سے شاخ پر جا بیٹھی۔ خیریہ تکلفت پہلے دن رہا۔ کسی قدرہ دوسرے دن۔ تیسرا دن اس نے شاخ سے اُٹ کر اطمینان سے رینے پر چن کر کھائے۔ چوڑھے دن وہ اکیلی نہیں آئی۔ نرادہ ساتھ آئے اور بھروہ اس دسترخوان پر چڑیوں کے مستقل شریک ہو گئے۔ بلبلوں کی شرکت نے پار سنگھار کی چھاؤں میں بچھنے والے اس دسترخوان کو چارچاند لگا دیئے۔

چند دنوں بعد بیکھاکہ دو گرد سلیں بھی مر وقت آن اُتری ہیں اور چڑیوں بلبلوں کی شریک بن جاتی ہیں۔ ان کی شرکت بھی بھلی لگی۔ لیکن جب ایک کوئے نے یہاں آگر اس سچھا میں کھنڈت ڈالی اور ان کے رذق پر باتھ صاف کیا تو مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ اور وہ تو ان دیزوں پر اتنا ٹوٹ کر گرتا تھا اور اتنا جارحانہ رو یہ اختیار کرتا تھا کہ چڑیا بلبلیں گر دیں سب بخورہ می دیر کے لئے کنارہ کش ہو جائیں ہیں، لکھتی مرتبہ میں نے اسے اڑانے کی کوشش کی، دھنکارا، شی شی کیا، مگر کو ا تو بہت ڈھیٹ ہوتا ہے۔ مگر بھر مجھے خیال آیا کہ کوئے کے خلاف میرے یہاں اتنا تعصیب کیوں ہے۔ آخر یہ بھی تو پہنچہ ہے اور وہ پہنچہ ہے جسے گیتوں کی بہن کا گا کہہ کر پکارتی ہے۔ نام سے بھی کتنا فرق پڑ جاتا ہے۔ کاگا کا نام دھیان میں آتے ہی اس کے ساتھ میرا سلوک بدلتا گیا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میرے دماغ میں زانع وزغن پھنسنے ہوتے تھے۔ اس دلائل سے کوئے کے خلاف یہ تعصیب تھا۔

پرندوں کی اس سیحائیں ایک غیر حنیں بھی شامل ہو گئی۔ ہمارے سنگھار کی چھاؤں میں
چکتے چکتے چڑیوں بیبلوں گڑسلوں نے محسوس کیا کہ نیچے ان کے ایک گلہری بھی آنکھی
ہے جو ان کے کھانے دانے میں حصہ بٹا رہی ہے۔ اس سے اس سیحائیں تھوڑی
بدمزرگی پیدا ہوئی۔ مگر گلہری نے پرندوں کے ردِ عمل پر دھیان نہیں دیا۔ اسے پتنے
کام سے کام تھا۔ پنجوں میں تو س کاریزہ کے منہ میں رکستی جیسے آدمی نوالہ توڑ کر
منہ میں رکھتا ہے۔ آخر چڑیوں نے بھی اپنے رویے میں فرمی پیدا کی اور گلہری کے ساتھ
افہام و تفہیم کر لی۔

خبر تو میں روز صبح کو ناشہ کرتے کرتے تو س کے کنارے الگ کر کے ریزہ ریزہ
کرتا، ہمارے سنگھار تکے انہیں بکھر دیتا۔ چڑیاں تو پہلے سے منتظر ہوتیں۔ ادھر ریزے بکھرے
گئے ادھروہ مختلف گوشوں سے اڑ کر آئیں اور چکنے لگیں۔ بلبلیں عین وقت پر آتیں
اور ان کی شریک بن جاتیں۔ گرد صلبیں بھی ان کے آگے پیچے آنے لگتیں۔

ادھر گلہری منہ پر پر دوڑتی ہوئی آتی، تیزی سے نیچے اترنے اور ناشتے میں شامل
ہو جاتی۔ کوئی بھی آتا کبھی نہ آتا۔ جب آتا تو نٹ کر گرتا، اناپ شتاب کھاتا اور فودا ہی
اڑ جاتا۔

بس یہ وہ وقت ہوتا جب میں محسوس کرتا کہ میں اکٹھا ہو رہا ہوں۔ رنگارنگ مہماں
اٹرتے جاتے اور میرے بکھرے دیزے اکٹھے ہوتے جاتے، دیکھتے دیکھتے میں سارا
اکٹھا ہو جاتا۔ لگتا کہ اب میں پورا ہوں، باکل سالم۔

”کس مراق میں بیٹھے ہو۔ آج دفتر جانا نہیں ہے، زبیدہ کی آواز۔ اس کے ساتھ
ہی جیسے میں پھر بکھرنے لگا ہوں۔“

”یاد ہے آج ہاؤ سنگ والوں کی قسط بھی جمع کرانی ہے؟“

”وہ بھی یاد ہے؟“

یاد تو نہ کا۔ مگر بار سنگھار نے جو پرڈ کا نکھا چڑیاں تو چک کر اڑ گئی تھیں۔ مگر ہار سنگھار نے میرا رستہ روک رکھا تھا۔ ان دنوں اس کا موسم تھا۔ مگر میاں جا چکی تھیں۔ اب تو بس دیپر کی دھوپ میں بچی کچھی چلکی بھر گئی رہ گئی تھی۔ مگر وہ تو دوپہر کا قصہ تھا۔ شامیں اور صبحیں تو خنک ہو چکی تھیں۔ اس خنکی کے ساتھ ہار سنگھار کے مہکنے کا موسم شروع ہو گیا۔ شام کے ساتھ پھوننا شروع ہوتا۔ تاریکی میں رات کے ساتھ دمبدوم پھولتا چلا جاتا۔ صبح کے دھندر لکے میں کتنا ہنسا میکتا دکھائی دیتا۔ چھاؤں میں اس کی آدھا سینہ آدھا عفرانی بستر بچا نظر آتا۔ دھیرے دھیرے ایک ایک کر کے پھولوں کا گہنا اور بستر کا دبیرہ ہوتے چلے جاتا۔ ہار سنگھار کی مہک میں یہ اور کوئی مہک آن شامل ہوئی کہ میں مہکنے لگا۔ اچھا وہ۔

میں یاد کر کے کتنا حیران ہوا۔ میں یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ وہ مہک میری زندگی سے نکل گئی، کہیں کھو گئی۔ اسے لو وہ تو میرے اندر ہی کہیں گم ہوئی تھی۔ ہار سنگھار کی مہک اسے اندر سے باہر کھینچ لائی۔ پھولوں کے ساتھ یہی تو پریشانی ہے۔ آدمی کو شکنہ کرنے کے ساتھ ساتھ ادا اس بھی کرتے ہیں کہ ان کی خوشبو ماضی کی دور دراز گلکیوں سے حافظہ کی کسی عقیقی کو ہٹری سے، کہاں کہاں سے کھوئی ہوئی خوشبوؤں کو کھینچ کر لے آتی ہے۔ مجھے یاد آیا وہ میں حیران ہوا کہ اچھا وہ میں تھا، ایک خوشبو نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ پھر یہ یقینی کی ایک لہر کہیں سے آمٹہ آئی تھیں، میں تو یہ ہوں جواب ہوں۔ وہ کوئی اور تھا۔ کتنی دیر میں اس لہر میں بہتار ہا۔ پھر ایک اور خیال آیا کہ اپنے سے ذرا ہٹ کر اس کو دیکھنا تو چنانی جو شاید میں ہی تھا اور جیسے میں تھیں کوئی اور تھا۔ اسے دیکھنے کے لئے ذرا اپنا صیغہ ہی تو بدلنا پڑے گا۔ پرانی کہانیوں میں تو آدمی اپنا قاب بدل لیتا تھا۔ تم اپنا صیغہ نہیں بل سکتے۔ صیغہ واحد متكلم سے صیغہ واحد غائب میں منتقل ہونا، آنرا یہ کون اپنا سفر بے ان دلوں ٹیکب اس کا عالم تھا۔ اُبھتے بیٹھتے اسی کا دھیان۔ اس نے اپنی لکھی ہوئی ایک روانی کہانی اسے پڑھنے کے لئے بھجوائی۔ کہانی پڑھ کر وہ بہت سپشنائی۔ فوراً اسے

نوں کیا۔

”اخلاق، تم نے یہ کہانی مجھ پر لکھی ہے؛ اس کے لمحہ میں تھوڑی براہمی تھی۔

وہ بہت سپُنڈا یا ”تم پر ہے نہیں تو“

”نہیں کیسے۔ مجھ پر تو لکھی ہی ہے۔ تم نے میرے بارے میں کسی کسی باتیں لکھی ہیں یہ“

”تمہارے بارے میں ہے کونسی باتیں ہیں تمہارے بارے میں“

”بہت بھلوئے میں رہے ہو۔ تمہیں پڑھنے نہیں ہے کہ تم نے میرے بارے میں کیا کیا لکھا ہے“

”مگر یہ کہانی تو میں نے اس وقت لکھی تھی جب میں تمہیں جانتا ہی نہیں تھا اور اب بھی.....“

بات کاٹتے ہوئے ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

اس پر وہ لا جواب ہو گیا۔

پھر اس نے واقعی اس کے بارے میں ایک کہانی لکھی۔ اسے پڑھنے کو بھجوائی۔ اس کے بعد کہانی پڑھی اور فون کیا۔

”اخلاق، یہ کہانی تم نے کس لڑکی کے بارے میں لکھی ہے؟“

”تمہارے بارے میں“

”میرے بارے میں۔ کیوں مذاق کر رہے ہو۔ سچ بتاؤ۔ یہ کون لڑکی ہے؟“

”یہ تم ہوئے“

”میں ہے کسی کو بتانا تو تمہیں خوب آتا ہے۔ سچ پچ بتاؤ یہ ہے کون اور تمہارا اس سے اچھا خیر یہ میں نہیں پوچھتی۔ لیس اتنا بتا دو کہ لڑکی کون ہے؟“

”میں کیسے تمہیں لفظ دلادول کہ یہ تم ہوئے“

”میں کیسے تمہیں یقین دلاؤں کرے تم ہو؟“
 ”یہ میں ہوں۔ چہ خوب۔ میں کہاں سے ہو گئی۔ تم نے تو ابھی مجھے دیکھا ہی نہیں ہے۔“
 ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

اس پر وہ لا جواب ہو گئی۔ ٹیلی فون بند کر دیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد پھر فون کیا۔

بہت بے چین لگ رہی تھی۔ آواز سے پتہ چل دیا تھا کہ کتنی بیچن ہے ”اپھا یہ بتاؤ اخلاق۔“
 میرے بارے میں یہ باتیں تمہیں بتائیں کس نے؟“

”ٹوٹے نے“

”ٹوٹے نے یہ وہ چکرائی۔“

”ماں ٹوٹے نے“

پلوچنارا جہر تن سین کا ہیرا من ٹوٹے سے اور بیان کرناہ ہیرا من ٹوٹے کا
 رتن سین سے کہ یہاں سے سات سمندر پار ایک نگر ہے سراندیس پ راجہ ہے اس کا
 گندھر پ سین۔ بیٹی ہے اس راجہ کی پدمادت، نازک پدمی، بح کامنی، چند رکھی،
 بال سادن کی گھٹا جیسے، گردن صراحی ایسی، سینہ ہری بھری کھیستی، پیٹ صندل کی
 تختنی، کمر پتلی، کوہنے بھاری اور سن کے عاشق ہو جانا رتن سین کا اور تمہر پنا مچھلی کی طرح
 اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے۔

”یعنی کہ تم نے اسے دیکھا ہی نہیں ہے؟“

”نہیں“

”تم مجھے چلا تو نہیں رہے ہو؟“ حدا زنے شک بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”صحیح کہہ رہا ہوں ما جھی تک نہ ملاقات ہوئی ہے۔ نہ میں نے اسے دریکھا ہے؟“

”یعنی تمہیں پتہ نہیں کرو ہے کسی؟“

”جب دیکھا ہی نہیں ہے تو کیسے پتہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ہے؟“

”اپھا“، ممتاز تعبیب میں پر ڈگیا ”اخلاق، جب تم نے اُسے دیکھا ہی نہیں ہے تو تو تمہیں اس سے عشق کیسے ہو گیا؟“

”یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آتی“
”بکواس۔ یہ کوئی عشق و شق نہیں ہے۔“

وہ خود شکر میں مبتلا تھا۔ ہاں واقعی، جب میں نے اسے دیکھا ہی نہیں ہے اور کسی دیکھنے والے نے بھی کبھی نہیں بتایا کہ وہ کیسی ہے تو پھر مجھے عشق کہاں سے ہو جائے گا۔ شاید یہ بس ایک خلش ہے، ایک یہ جانے کی آمنہ و کوہ کیسی ہے۔

”خیر عشق تو یہ نہیں ہے۔ مگر یہ پوچھتا ہوں کہ جب تم نے اسے دیکھنا نہیں اس سے تمہاری ملاقات نہیں ہوتی تو وہ تمہارے چکر میں یا تم اس کے چکر میں آئے کیسے۔“

”یا، کوئی ایسی بات ہی نہیں تھی۔ میں دفتر اس روز فردا دیر سے پہنچا۔ دیکھا کہ میری میز پر ایک نازک سافاؤ نیشن پین رکھا ہے۔ میں نے اپنے چپر اسی سے پوچھا، رحمت یہ فاؤ نیشن پین کیسا ہے۔ صاحب جی ایک بی بی آتی تھی۔ کہنے لگی کہ مجھے ایک ضروری فون کرنا ہے۔ میں اسے یاں پر لے آیا کہ بی بی یاں سے فون کرلو۔ وہ بی بی ٹیلی فون پر باتیں کرتے کرتے کچھ لکھ رہی تھی۔ پھر حلی گئی۔ بعد میں میں نے دیکھا کہ وہ اپنا فاؤ نیشن پین چھوڑ گئی ہے۔ میں نے رحمت کی بات سن کر پین اپنی دراز میں رکھ لیا کہ آتے گی تو اس کے حوالے کر دوں گا۔ دوسرے دن اس کا فون آگیا کہ جی میں آپ کی میز پر اپنا پین بھول آئی تھی۔ میں نے کہا کہ محفوظ ہے۔ بولی کل میں بارہ ساڑھے بارہ بجے آ کر لے جاؤں گی۔ دوسرے دن ان اوقات میں میں نے اس کا انتظار کیا۔ آئی ہی نہیں نہ خود آئی نہ فون کیا۔ اس کے دوسرے دن فون پر صدرت کی کہ آنہیں سکی۔ اس پر میں نے اپنے فقرہ کہہ دیا۔ بس لائٹ موڑ میں کہا تھا:

”کیا فقرہ کہہ دیا۔ وہ بھی بتا دو۔“

”میں نے بس یوں ہی ایک فقرہ لگا دیا کہ دیکھنے آپ کا پس میرے نے شہزادی کی جوتی تو نہیں بن جائے گا۔ اس پر وہ چکرانی، جی میں سمجھی نہیں۔ میں نے کہا مطلب یہ ہے کہ جس طرح پُرانی کہانیوں میں شہزادیاں شادی بیاہ سے واپس ہوتے ہوئے ہیں۔ ہبڑد بُری میں اپنی ایک جوتی چھوڑ جایا کرتی تھیں اور پھر وہ جوتی بد نصیب شہزادے کے گلے کا ہار بن جاتی تھی۔ اس طرح تو نہیں ہو گا۔ اس پر وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنسی یا راس کا اس طرح کھلکھلا کر ہنسنا، بس میں توفنا ہو گیا۔“

”اچھا؟“

”لاہان۔ یا۔ کیا ہنسی تھی اس کی؟“

”پھر ہوا کیا؟“

”اس کے بعد میں کے لئے اس کا آنا تو ملتوی ہوتا چلا گیا۔ معذرت کا فون آجائتا تھا۔ لیس اس وقت سے یہ سلسلہ چلا ہوا ہے۔“

”اس پر ممتاز جی کھول کر ہنسا“ یا ر اخلاق، تم نے فقرہ غلط کہہ دیا۔“
”کیسے؟“

”تم نے اسے شہزادی کا ۵۴۷۸۲۹ دے دیا۔ اب وہ تمہیں شہزادی بن کر دکھاد ہی ہے۔ پیارے بہت ستائے گی۔“

”پھر کیا کیا جائے؟“

”اب تم اس کی اُٹ بات کہو۔ اب کے فون آئے تو کہو کہ یہ بین شہزادی کی جوتی نہیں ہے کہ میں اسے اپنے گلے کا جاندبنالوں۔ آپ اسے یعنے آرہی ہیں۔ یا میں اپنی ناپٹ کو پریذنت گردوں؟“

”یاں یہ صحیح ہے؟“

”اس نے کتنا مضموم ارادہ کیا تھا کہ اب کے وہ دلوں بجھ میں بات کرے گا۔ مگر

جب اس کا فون آیا تو بات کہیں سے چلی اور کہیں پسخ گئی۔ کتنی باتیں ہوئی تھیں۔ اس روز اور فون پر اس روز آواز کتنی صاف آ رہی تھی۔ جیسے بالکل قریب بیٹھی باتیں کر رہی ہو۔ باتیں کرتے گرتے جب درمیان میں ایک فردا و نفہ آتا تو اسے اس کے سانس کی آواز تک سنائی دیتی۔ آوازِ دھرمی ہوتی گئی۔ وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے کہ وہ اس کے گرم سانس کو اولاد اس کے بدن کی آپنے کو محسوس کر سکتا تھا۔ فون درمیان سے غائب ہی ہو گیا۔ کتنی دیر تک وہ مسروڑے باتیں کرتے رہے۔ ہستہ آہستہ کچھی اتنی آہستہ کر بات سرگوشی میں جاتی۔

جب فون سے فارغ ہو گروہ باہر نکلا تو دونوں وقت مل دیتے تھے۔ اے یہ تو شام ہو گئی۔ وہ حیران ہوا، اچھا آج انی لمبی بات ہوئی تھی۔ کمال ہو گیا۔ چلتے چلتے اس نے ہیرت سے آسمان کی طرف دیکھا جہاں اب ستارے نکل آئے تھے۔ آسمان کتنا نیچے آگیا تھا اور ستاروں سے کتنا بھرا ہوا نظر آ رہا تھا اور آج ستارے بھی کتنے بڑے بڑے نظر آ رہے تھے اور کتنے قریب کریں وہ ذرا ہاتھ بڑھائے گا تو منہ میں بہت سے ستارے آ جائیں گے۔

”آج کیا دفتر سے چھٹی لے لی ہے۔ مگر قسط تو جمع کرانی ہے یادوں بھی نہیں کرانی۔“ زبیدہ کی سرزنش بھری آوانہ اور اس کے ساتھ ہی ستارے غائب، والپس اپنے صیغہ میں۔ وہی صیغہ واحد مسلکم کا قید خانہ جہاں سے نہ آسمان نظر آتا ہے۔ نہ ستارے دکھانی پڑتے ہیں۔ ان دونوں میں اندر سے کتنا بھرا بھرا محسوس کرتا تھا، جیسے میرے اندر بہت کچھ ہے، جیسے میں بہت کچھ ہوں۔ خالی میں نہیں، میں سے بڑھ کر بہت کچھ، ستاروں سے بھرے آسمان کی طرح میرے اندر پچ پچ ستارے بھرے ہوئے تھے۔ میں تھا کہ جملہ اسے ستاروں سے لدا پھندا آسمان تھا۔ اور اب، میں نے سوچا، میں اندر سے کتنا خالی ہوں، کتنا تر بتھر ہوں۔ اگر چڑیوں کی یہ سجناء ہوئی اور پار سنگھار کا

یہ پسپڑ نہ ہوتا تو میں تو بانکل ہی گیا تھا۔

زبیدہ سر پر آن کفری ہوتی تھی۔ کس بنزاری کے ساتھ ہار سنگھار اور چڑیوں کی بھری بجا کو چھوڑ کر دباؤ سے اٹھا۔ بے دل کے ساتھ پڑے پدئے اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ باہر نکل کر کتنی رکشا والے کو رام کیا۔ رکشا کی مواری تو ویسے ہی آدمی کو توڑ کر کر دیتی ہے اور میں تو پہلے ہی سے ٹوٹا ہوا تھا۔

رکشا والے الامال کی طرف دوڑتے دوڑتے پھر لپٹ پڑا۔ والیں ہوتے ہوئے ایک رکشا والے نے اس سے اشارے میں کچھ کہا تھا۔

”کیوں اب کیا ہوا؟“

”آگے رستہ بند ہے۔“

”ادھر سے بھی رستہ بند ہے؟“

”ہاں ادھر سے بھی بند ہے۔“ یہ کہتے کہتے اس نے رکشا کا مُخ موڈا اور پھر رونا شروع کر دیا۔

”اب مجھے کہاں لئے جا رہے ہو؟“

”اے جی آفس کی طرف سے رستہ کھلا ہو گا۔ ادھر سے زکالتا ہوں۔“

اے جی آفس کے قریب پہنچ کر رکشا والا پھر مٹھٹک گیا۔ ادھر سے بھی رستہ بند ہے جی۔ میرے یاروں نے پوری مال ہی کی ناگہ بندی کر کھی ہے۔“

”یہ تو بڑی مشکل ہے۔“ میں بڑا ہیا۔“ مجھے تو بنک میں ضروری کام ہے۔ میں

ادھر اسی طرح بھٹکتا رہ جاؤں گا۔ ادھر بنک بند ہو جائے گا۔“

رکشا والے نے اچانک رکشا کو مورا اور ایک گھنی میں داخل ہو گیا۔

”بھتی یہ کہاں لئے جا رہے ہو مجھے؟“

”جی آپ کو بینک تو پہنچانا ہی ہے۔ یہ راستہ بینک کے قریب جا کے نکلے گا۔“
اس کے ساتھ ہی رکشا نے اچانکا شروع کر دیا۔ ہر جھنٹے کے ساتھ ہی اچھل

پڑتا۔

”بھائی رکشا والے مجھے تم بینک تو پہنچا دو گے۔ مگر یہ سیلوں سمیت پہنچا تو اچھا ہوئے“
”باؤ جی اللہ اچھا ہی کرے گا۔“

یہ رستہ میرے لئے بالکل نیا تھا اور میں حیران ہو رہا تھا کہ میں رونہ صبح شام
مال آتا جاتا ہوں۔ مگر مجھے کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ مال کی طرف اتنے رستے جاتے
ہیں۔ کتنے رستے آس پاس کی سڑکوں سے نکلتے ہیں اور مال کی طرف جاتے ہیں۔ مگر
کیا فائدہ۔ کوئی ایک واقعہ کوئی ایک اندریشہ دفتارے رستوں کو مسدود کر
سکتا ہے۔

گھنی سے رکشا کے نکلتے نہتے میں نے دیکھا کہ سامنے چند قدم کے فاصلے پر
مال نظر آ رہی ہے اور اس کے پر لی طرف بینک دکھانی دے رہا ہے۔ میں نے اٹھینا
کھانس لیا۔ مگر رکشا والے نے ایک دم سے بریک لگانے ”باؤ جی یہ رستہ بھتی بند ہے۔“
”کہاں بند ہے؟“ میں نے چھنجھلا کر کہا۔

درپاشا نور سے تو دیکھو۔ سامنے سڑک پر کانٹے دار تاروں سے رستہ رکا
ہوا ہے۔“

عزمیز و باقیز دا اسلاف کا ذکر کیاں تک کروں ۔ خاندان کی عظمت کتابیاں کروں

سفینہ چاہیے اس بھروسکیاں کے یہے

سو باہد کھینچا ہوں اور سوار قلم کو موڑ کر عرضہ حال میں لاتا ہوں ۔ خاندان کی عظمت و شوکت اب فسانہ ہے اسلاف کا دید پر طنطہ قصہ پار نہیہ ہے میں خاندان کی گستاخ عظمتوں کا مالم دار ہوں ۔ اپنے دجو در پر شرمدار ہوں بزرگ اچھے رہے کہ مجھے دشمنوں میں لگز رکھئے ۔ خاندان کے زوال کا منظر دیکھنے کے یہے نگاہ اسلاف مشائق علی رہ گی ۔

و نفع ہو کہ فقیر نے آنری ہی مجرمی کو سلام کر دیا ہے بھروسی میں حاضری دینے والوں کے یور بدے ہوئے تھے میرے فیصلوں پر نکتہ چینی کرتے تھے ہر بھر کر دہی ایک اعزازی کہ فیصلہ بر بنائے تحصیب کیا گیا ہے مسلمان فریق کی پاسداری کی گئی ہے یہ زندگی میں نے غافیت اسی میں دیکھی کہ لکھر صاحب بہادر سے ضعیفی کا عندر کر کے اس عہدہ جلد سے سبکدوشی حاصل کر لوں بس اب خالی خان بہادری رہ گئی ہے مسلمان شہر بنوز اس سے مرعوب ہیں سمجھتے ہیں کہ آفت آنے پر میری خان بہادری نہیں بچائے گی بھلا جب فرنگی کے قدموں نے کی زمین سرکی ہوئی ہے تو اس کے دینے ہوئے خطابات کی کیا وقت رہ گئی ۔ مگر میں ان سے صاف صاف کچھ کہتا بھی نہیں ۔ اگر ایک بے وقعت خطاب سے ان کی ڈھارس بندھی ہوئی ہے تو بندھی رہنے دو ۔ سو دیکھتا ہوں، سنا ہوں، مگر لب پر کوئی بات نہیں لاتا ہوں میرا حال سوائے میرے خداوند کے کوئی نہیں جانتا ۔ ایک

ایک پنڈت گنگا دت مسجد میں تھے ان سے دل کا حال کہہ دیا کرتا تھا اور جی کی بھڑاس نکال لیا کرتا تھا وہ بھی سورگ میں جا ب رہے۔ باسے پنڈت کیا ہیر تھا کہ مٹی میں مل گی اس کی کہی ایک بات مجھے ان دنوں رہ رہ کے یاد آتی ہے کہنے لگا کہ شری مشاق علی تمہیں پڑھے ہے کہ انت میں شیرا یہ درت غازی ارجمن کے س تھے کیا ہوا تھا۔ پنڈت کیا ہوا تھا۔ مشاق علی جی، جب حضرت سری کرشن کے دھال کے بعد ارجمن ہمارا ج ان کی ازدواج مطہرات کو سیکھ درار کا سے نکلے تو رستے میں بٹ ماروں نے ان پر لمبے بول دیا مگر وہ کس مل دالا اچانک اتنا نزل بیوگی کہ جھنش کو کھینچتا ہے۔ تو جھنش نہیں کھنچتی۔ جس مرد جرک نے بھارت درش کے نامی گرامی ساوتوں اسور مائل سے اپنی طاقت کا دوسرا منوا پا تھا اسے بٹ ماروں نے پیسا کر دیا۔ اس مرد غیر نے اس کا بہت شوك کیا حضرت دیاں جی کے حضور میں پہنچ کر گریہ کیا اور استفسار کیا کہ رشی ہمارا ج میر کس مل کہاں چلا گی۔ حضرت نے ارشاد فرمایا "میرے پیر اے فرزندِ احمد یہ سب کال کا چکر ہے۔

یہ سن کر اس گنہگار نے تھنڈا سائنس بھرا اور کہا کہ پنڈت تمہارے دیاں جی نے درست فرمایا وقت بدشیکی زور آؤ رہے اس کے سامنے آدمی ناطقت ہے۔ پنڈت سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر افسر دہ ہو کر بولا "صحیح کہا۔ بالکل صحیح کہا۔ کال بلوان ہے ہم نزل میں چپ ہوا۔ پھر بولا" مشاق علی، ہمارا تمہارا کے بیت گیا اب کشن لال کا زمانہ ہے۔"

میں نے کہا کہ پنڈت کوئی مجھے پتارا تھا کہ تمہارا کشن لال جن سنگھیوں کا یہ ڈین گیا ہے۔

پنڈت نے جواب میں سر نبوڑھایا۔ شرمندگ سے بولا" مشاق علی تم نے صحیح سن۔ جب ہی تو اس عاصی پر معاصی نے یہ عرض کیا تھا کہ ہمارا سمجھے بیت گیا اب کشن لال۔ کا زمانہ ہے باب پڑھے رہا ہے۔ بیٹا زور پکڑ رہا ہے"۔ پھر بڑھانے لگا۔

ڈوبائنس بکر کا جس اد بچیو پوت مکال

پنڈت مہجور واقعی ڈھنے رہے تھے پھر ڈھنے ہی چلے گئے۔ ایک دن باسکل ہی ڈھنے گئے۔ ہائے پنڈت تو کتن طوڑا چشم نکلا۔ دوست کو کیسے آشوب کے ایام میں چھوڑ کر گیا ہے دیکھ رہنا تو ان بھی اب ڈھنے لگا ہے بس اب گر اکہ اب گمرا مگر اس میں تسلیم کا پہنچنے ہیں ہے

ہبھجور سے ملاقات تو مرنے کے بعد بھی نہیں ہو گی۔ خالم تو نے میرا کہا مان یا ہوتا اور ایک دفعہ کلمہ پڑھ دیا ہوتا تو حشر میں ملاقات کی توقع ہو سکتی تھی کہ تیرا میرا ایک ہی حشر ہوتا۔ اب کس بھانے یہ توقع کر دیں۔ آخر امر مجھ گہنگار کو انہیں کے ساتھ اٹھایا جانا ہے جن میں سے میں ہوں۔ میرا حشر اگل تیرا حشر اگل تیرا حشر کی حشر پر دیکھی جائے گی۔ مگر میرا حشر تو اس وقت بھی انہیں کے ساتھ ہوتا نظر آ رہا ہے جن میں سے میں ہوں۔ ہبھجور تو اگر زندہ بھی رہتا تو کیا اپنے رفیق دیرینہ کو اس حشر سے بچاتا۔

داسے ہوائے زمانے تجھ پر کہ تو نے دفاتر کے باش میں نفاق کا بیح پو دیا۔ اور ہمسائے کو ہمسائے کا دشمن بنادیا۔ ہبھجور کا نور نظر کشن لال گلیں مکہ مجھے تادکپتا تھا اب مجھے دو پورے سلام کرنے کا روا دار نہیں۔ ہبھجور کے سودگیا شی ہونے کے بعد ایک مرتبہ البتہ میرے پاس آیا تھا مگر میرے ایک بوجھ آتارنے نہ کر از راہِ سعادت مندی۔ میں تو اسے دیکھ کر تصویرِ حریرت بن گی۔ نہ آنکھ میں بھاڑونہ ادا میں پاس اور ایک پلندا میرے ہاتھ میں پکڑا دیا اور روکھے پھیکے انداز میں کہنے لگا کہ "پتا جی فارسی اکثر وہ میں جانے کی لکھنے رہتے تھے تک تو ان کی بھت پڑھ نہیں سکتا۔ یہ اکثر ماؤ جی آپ ہی لوگوں کے ہیں آپ ہی انہیں سننگھو اہمی"

میں اس جوان عزیز کا منہ تکنے لگا۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ مختلطہ اس سے لے کر رکھ دیا۔ جب چلا گی تو سوئے آسمان دیکھا مگر قسم پاک پر در دگار کی کوئی شکون نہیں

کی شکوہ کرنے کا فائدہ مجھی کیا تھا۔ آسمان بہرے چال اس کی ٹیڑھی ہے شحرائے کرام نے بلا وجہ بلا سبب تو اس کی نہ مت نہیں کی تھی تجھ دیکھا تھا تب اسے فلک کوچ رفما، اور چرخ فتنہ پرور کہہ کر دل کا غبار نکالا تھا اور گیند و اڑگوں کہہ کر لکھا تھا۔

میں نے وہ مخطوط الف پٹ کر دیکھا۔ مہجور نے کیسی کٹھب زبان لکھی ہے ہاں یہ فسرد ہے کہ بیچ بیچ میں کوئی جواہر نیڑہ آگی پے جس سے بیان کی قیمت بڑھ گئی ہے کوئی حکایت لذیذ کوئی داستان یار نیڑہ کوئی بعیرت افراد زد دیا، کوئی حیکما نے قول۔ مہجور نہجنا نی کو عارفان مہند قدیم کے اقوال از بر میں ان کی دانش سے اس نے بس طبع استفادہ کیا ہے کاش اسے زبان پر بھی غبور حاصل ہوتا۔ شتر گربہ اس کی تحریر میں جا بجا ہے بہر حال فقیر نے بربانے رفاقت دیرینہ سوچا کہ اس تذکرے کو بھی اپنے مرتبہ کرے میں شامل کر دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے صحیح ہے کہ بیچ بیچ میں کلمات کفر آگئے ہیں مگر نقلِ کفر کفر نہ باشد۔ صوبجہ عنود تأمل کے تذکرہ مہجور سے تھوڑا جدا ہے بہاں نقل کر لیا۔

منقول از تذکرہ گنگا دت مہجور

آزاد ہوں نام سے رام کے ادر رحیم کے کہ وہی سنتیہ ہے اور ربی حق ہے اور وہی سند ہے اور اسی کی دیا اور کرم سے اس برہمند میں اور اس علم زنگ دلو میں ساری چیل ہیل ہے جو سنتیہ ہے وہ حق ہے جو حق ہے وہ سند ہے اللہ تعالیٰ "وَيَحْبُّ الْجَمَالَ حَتَّىٰ فَقِيرٌ گَنْمَادَتْ مُهَجَّرٌ حَمْدَ كَرَّتْ ہے اس پیدا کرنے والے کی جس نے گائے کو پیدا کیا اور جس نے کوئی کو کوک اور مور کو جھنکار عطا کی۔ اور گائے کو ماتا کا درجہ دیا، دنیز تھنوں میں اس کے دو دھن اتارا۔ اسی پاں مار کی دیا اور کرم ہے کہ اس علم

رنگ دبو میں بھن پر کار کے مختلف انواع و اقسام کے پشوپیچی و حوش و طیور چکتے ہوئے چنگھاڑتے ہیں اور الوان و انواع کے گل بوٹے کھدے ہوئے ہیں اسی رنگارنگی سے کائنات کو رونق ہے اور جگ میں اجیا رہے ہے۔ پوترم منگلم پرم۔ وہ پاک ذات ہے، مبارک ہے برتر و اعلیٰ ہے۔

سنوبھی مرد اور عزیز و با تمیز و ایک سچش نے شہنشاہ والا صفات حضرت یہ شری ہمارا جس سے کچھ ڈیر ہے میرے پرشن پوچھتے تھے اور سوالات عجیب کئے تھے ایک سوال یہ تھا کہ وہ کیا چیز ہے جو لگاس سے بھی زیادہ ہے اس رہشنا سی راجہ نے جواب دیا کہ وہ ہمارے دچار میں یہ بھی مرد عزیز و خیالوں دچاروں کی تنک سی لگاس میں نے بھی اکٹھی کی ہے میں نے بھگوت گیتا کا پاٹھ کی، قرآن مجید کی تلاوت کی فیض بیہود، پرانوں شاستروں ملفوظاتوں حدیثوں میں تانک جھانک کی، مزید برائی مہا کوی شری سحد کی اور حضرت بکر علیہ الرحمۃ کی حکایات و درد بآجات کا مطالعہ کیا۔ تب خیالوں دچاروں کی ریخواری لگاس جمع ہوئی ہے سو پہنچ ان گیان بھری پستکون اور مقدس لتابوں کو سنبھال کر تا ہوں فیض بوسہ دیتا ہوں۔ پھر عرض پر واز ہوتا چوں اس جگ کو نثار نے کے یہے اور بنی نوع انسان کی اصلاح کے یہے ایشور ائمہ کی اور سے سنتے سادھورشی منی اور پر پیغمبر مصلح اپدنشیک آئے اور منش جاتی کے پیچ برا جے اپدش دیئے، سیتھ پتھر بتایا، تبلیغ دین حق کی۔ مگر مرغے کی دہی ایک ٹانگ بھول چوک کا پیٹلا، آدم کا بیٹا جیا تھا ولیسا ہی رہا۔ مثل مشہور ہے کہ کتنے کی دم بارہ برس تک دبا کے رکھی، مگر وہی بیڑھی کا بیڑھی نہیں۔

صاجو سجنو، دلیسے تو یہ سنار اپنے پانیا کی کرپا سے بہت سند رہے پر ادھک بھیانکر بھی ہے ایک اور سے سند دوسری اور سے بھیانکر، ایک پر کار سے دیکھو تو یہ جیون ایک نغمہ شادی ہے، سکھ کی پیچ ہے دوسرے زاویت سے دیکھو تو یہ زندگی۔

دکھوں کی مالا ہے ذرا شادی و علم کے مقامات سے بلند ہو کر دیکھیں تو یہ عالم جگوں کا
سلسلہ ہے بہت ہانڈ میں کال کا چکر چلا ہوا ہے ایک جگ جاتا ہے دوسرا جگ آتا ہے فتح
ہو کہ جگ چار ہیں اسٹ جگ، ترتیا جگ، دواپر جگ، مل جگ۔ جب ایک جگ کا نت
ہوتا ہے تو محشر پاپوتا ہے صاحب العصر و از ماں حضرت مارکنڈے رشی اس کے عینی
شاہد ہیں کہ انہوں نے سنار کو اسار دیکھا اور چار سو میں ہو کا عالم مشاہدہ کیا۔ آپ نے
مشاہدہ کیا کہ بھومیث میں چاروں اور پانی ہی پانی ہے جیو جتو جاندار بے جان سب
تابود ہو چکے ہیں۔ نہ نزاری نہ پیشہ نہ شجر جمر نہ بکش نہ ڈال پات۔ ہر بشے نشہ ہو
چکی ہے حضرت مارکنڈے جی ورطہ حیرت میں غرق کہ بھومیث کہاں گیا، کائنات کو زمین
لکھ گئی یا آسمان نے نکل دیا، اور خود زمین و آسمان دھرتی آکاش کہاں ہیں، میں کہاں
ہوں اسی لگھری دیکھا کہ نیچے پانی میں ایک برش برگد کا لکھڑا ہے برگد تھے سنگھاسن بچھا ہے
سنگھاسن یا ایک بنت مسکاتا بالک کھیدتا لٹکا ریاں مارتا ہے مارکنڈے جی اسے دیکھ
کے موہرہ ہو گئے۔ سدھ بعد بھول گئے اسے تھک جاویں بالک بولا کہ مہامنی تمادھک
تھک گئے ہو تو نک میرے منگ آرام کرو۔ یہ کہہ کے بالک نے منکھ کھولا۔ مارکنڈے جی اس
کے سانس کے ساتھ تھینے چینے گئے اور پیٹ کے انداز تھگئے۔ اس پیٹ میں تو ایک دنیا
آباد تھی ہماوت پرست، گنگاندی، دوارکا، اجودھیا، کاشی، مارکنڈے جی نے لمبی
یاتر کی بھن بھن پرکار کے عالم دیکھے، دیس دیس کی خاک پھیانی، پرستوں کی چڑھائی کی، ہمدردی
میں پانچھ پیر مارے۔ پر عالم فانی کا اور چھپور نہ ملا۔ مارکنڈے جی تھک ہا کر بیٹھ گئے۔ پھر
گردگرد ائے کہ ہے نارائن دیا کرو۔ وفتحا باد نیم حلی اور حضرت مارکنڈے نارائن کے منہ سے
نکل پڑے۔ نارائن کے دشائی پیٹ سے باہر آئے تو دیکھا کہ وہی برگد کارکش ہے میں
سنگھاسن، دہی بنتا مسکاتا بالک۔ اس نے مسکا کے مارکنڈے جی کو دیکھا بس اسی آن
مارکنڈے جی کو نئی درشی مل گئی۔ کیا دیکھا کہ کائنات پھر سے ظہور کر رہی ہے اونہے

کے بیچ سے پر کاشت ہو رہی ہے پوتھم، منگلہم، پرم۔

بے متر و اور لے یار و سوچ اور وچار کر دکہ اب دنیا پر کون وقت آیا ہوا ہے
سنار میں باہا کار مچی ہے خلقت تراہ تراہ کرائھی۔ مگر حال ہو رہے ہے میں کوچے اجر ہے
میں انسانی رشتے بے وقت ہو گئے نہ مترتا کا پاس رہماں گی کا احساس۔ خون سفید
ہو گئے ہیں۔ بھائی بھائی کا بیری۔ اولاد مان باپ سے باشی مجھے دیکھو جو دیدہ عبرت نگاہ ہو۔
جیون بھر میں نے شانستی کا کلمہ پڑھا۔ ایک ہی اپدش دیا کہ بندہ مسلم سکھ عیاںی سب اپس میں
بھائی اور متر میں میرا بیٹا کشن لال اللہ وظیفہ پڑھتا ہے مثل تو یہ تھی کہ باپ پر پوت پتا پر
لگھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ مگر یہاں تو الٹی گنگا بہہ رہی ہے یہ سب کال کا چکر
ہے اور وقت کی کوششہ سذی ہے کتنے علوں کا اسی پر کار خاتمه بالغیر ہوا ہمارے جگ کا
بھی دیکھ لینا اسی طور انت ہو گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ بس ہونے کو ہے قرآن تو یہی کہتے ہیں
متر دیہ دنیا زمانوں کا مدفن ہے اور جگوں کا مر گھٹ ہے اور جہاں جگ جل رہے ہوں
وہاں آدمی کے تن کی گی بساط ہے میں اپنی بیویوں کی مالائی بیٹھا ہوں۔ مگر کب نہ لے سے
نکھواوں گا۔ آگ کی پیٹ آئے گی اور اسے بھسم کر دے گی جنم جنم سے یہی ہو رہا ہے
کتنی بار جل چکا ہوں، کتنی بار اور جلنے سے زماں آگ ہے اور ہم اس کا ایندھن ہیں۔

ہادر جلیں جیوں لا کڑی کیسی جلیں جیوں جیوں گھاس

ایہہ تن جلتا دیکھ کے بھیو بیڑا اور اس!

سنتو، خور کا مقام ہے اور وچار کی جائے ہے نکھوکھا بوس سے اس دھرتی پر یہی
ہو رہا ہے واپس جاتک اس مضمون کی اپنے آنہماںی پتا سوم دت کی پوختی سے
تفعل کرتا ہوں۔

دنیا شہستان بھومنی ہے

بدھر دیوجی نے ایک دن بھکشوؤں سے یوں سم بودہ کیا کہ ہے بختکوؤں، کان دھر کے سنو۔ اب سے لاکھ برس پہنچے کی بات ہے کہ ایک سادھونے چالہ پربت کی ایک اونچی چوٹی پر دھونی دمائی تھی۔ ایک دن اس نے کیا بیجا کہ اس سنان چوٹی پر دو جنے بھٹکتے پھرتے ہیں ایک بوڑھا کھوٹ اور ایک جوان۔ سادھونے اچڑھ کیا کہ اس اجڑ جگد یہ جتنے کہاں سے آئے۔ انہیں بدکر پوچھا کہ بچترم یاں پر کیا لینے آئے ہو۔ جوان نے کہا کہ یہ بورھا میر پتا ہے اس کی اچھا ہے کہ مرنے کے بعد اس کا کریا کرم ایسے استھان پر ہو جہاں پہنچے کسی کا کریا کرم نہ ہوا ہو۔ تو ہم ایسے استھان کے کھونج میں یاں پر آئے میں۔

садھونے پوچھا کہ بچر تمہیں ایسا استھان ملا جوان نے اُتر دیا کہ مل مل گی سادھو ہنا۔ کہا کہ بچر دہ استھان میں بھی تو دیکھوں۔ جوان نے کہا کہ اونچی دیکھو اور وہ سادھو کو ایسی جگد یہے گی جو تین پہاڑیوں کے پیچ میں گھری ہوئی تھی لگتا تھا کہ یاں پر کبھی کوئی مانو نہیں برا جا ہے۔

садھو اس استھان کو دیکھ کے ہنسا۔ بولا کہ مور کھہ، تجھ سے پہنچے بھی ایک شکستی شالی بی بیز اکر کے بڑے جو کھم کے بعد یاں پر آیا تھا باب کی اونچی اٹھا کے لایا تھا اسی استھان پر اس نے یہ سوچ کے باب کا کریا کرم کیا کہ اس اٹھ تھنگ جگہ پاس سے پہنچے کون مانو آیا ہو گا اس مور کھہ کو کب پتہ تھا کہ اس کے پتا نے چودہ ہزار جنم لیے تھے۔ اور چودہ ہزار بار اس کا کریا کرم اسی استھان پر ہوا تھا۔

جو ان یہ سن کے سٹپا یا۔ بولا، اچھا پھر میں دوسرا ایسا استھان کھو جوں گا جہاں پہنچے کسی کا کریا کرم نہ ہوا ہو۔

سادھو پھر نہ اور بولا کہ ہے پتھر اس دستال دھرتی پر ایسا کوئی استھان نہیں ہے جہاں کوئی لاش نہ دبی ہو اور کسی مردے کی بڑیاں نہ جملی ہوں ہے پتھر یہ سفار سارا شہشان بھومی ہے سوتواپنے آپ کو مت تھکا جہاں تیراب پر ان چھوڑ دے دیں پاس کا کریماگرم کر دے۔

بعد دیوجی اتنا سن کر چپ ہو گئے پھر ملکائے اور بولے کہ ہے بھکشو و بوجھو کروہ سادھو کون تھا۔ ہے اُنی تاجہ کون تھا وہ سادھو۔ ہے بھکشو وہ سادھو میں تھا۔ بھکشوؤں نے یہ سن کے اچنچھا کیا۔ پوچھا کہ ہے تھاگت اتنے سے تم کہاں سے بڑھ دیوجی پھر ملکائے اور بولے کہ پھر میں نے ملی کا جنم یا پریہ جانک میں تھیں پھر کسی اور دن سا دل گا۔

تو ہے سنتو اور اے بھلے مانسو، یہ سفار تو ہے ہی شہشان بھومی۔ پر ہم اگلی نیوں کو اس کا شعور نہیں ہے یاں پر موت کا دور دورہ ہے جنم دوت کا ڈیرہ ہے فرمتہ اجل ہر دم ہر سے ہمارے صروف پہنچ لاتا رہتا ہے باقی رہی زندگی تو حضرت کبیر علیہ الرحمۃ نے کیسے گیان کی بات کہی ہے۔

کبیر میرا جھو جرا پھوٹے چھیک بزار
ہوئے ہوئے تر گئے دُوبے جن پر بھار

تو سنتو ہم تو ٹوئے جہاز پسوار ہیں جس میں بزار جھیہ بیں مش کے جیوں کا کیا اعتبار۔ جھو جرا بھری ہے کا چاسوت ہے تارِ نفس جانے کب ٹوٹ جائے۔ فرد کی کیا بڑی ہے بھرے نجڑ حرف غلط کی مثال ہٹ جاتے ہیں ایک دن یہ بندہ عاجز مشاق علی کو بنانے لگا کہ ددار کا کیسے نشٹ ہوا۔ مشاق علی نے چھیٹ کی طرح اپنے چلنے کے ہجھ میں کہا کہ پنڈت ہمارے سر کی کرشن بھارا ج نے اپنے نجڑ کو نہیں بچایا۔

میں نے کہا کہ مشائق علی ہیں سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب نگر بسی پانی نرولی دریاچائی ف متن وفا جر ہو جاتے ہیں تو پریغیرتی ادوار کوئی اس نگر کو نہیں بچا سکتا۔ پرہاں تو ایک نگر ڈو با تھا یہاں نگر نگر آگ بھی ہے جانو کہ جو الٹھی پھٹ پڑی ہے اسی پر کار سب کچھ جل جاوے گا۔ اور سنار بھرم ہو جاوے گا۔ جو حضرت مارکنڈے رشی نے دیکھا تھا وہ ہیں دیکھنا ہے پر مارکنڈے جی نے تو نیا سنار کا سمجھ ہوتے بھی دیکھا تھا۔ ہمارے یہ بھاگ کیاں۔ ہمارے نصیبے میں تو خالی تباہی دیکھنی لکھی ہے۔

حضرت مارکنڈے رشی بھی کیا پر فقیر آدمی تھے نے غم دنیا نے غم کالا مرست قلندر تھے۔ بزرگوں برس جنہے نگر محابل ہے کہ ایک بال بھی سفید ہوا ہو رسدا پچیس برس کے شکستی شالی نظر آئے۔ پر بھی عمر کا زیادہ ہونا بھی آدمی کو بہت دکھ دیتا ہے میرے بزرگوں پتا پنڈت سوم دت آنہمہانی سورج گیاشی نے اس مضمون کی ایک حکایت اپنی پوچھی میں دیج کی ہے اسے ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

بھوسا گر میں اکیلا ماںو

پانڈوؤں نے ایک بار مارکنڈے رشی سے پرشن کیا کہ رشی ہمارا ج آپ سے زیادہ بھی کسی ماں نے عمر بائی ہے اتر دیا کہ ماں پائی ہے بھلاکس نے۔ اندر دمن رشی نے ہمارا ج اندر دمن رشی نے کتنی عمر بائی۔ پر داہنوں نے اتنی عمر بائی جس کی درشوں شاہدیوں میں گنتی نہیں ہو سکتی۔ ہمارا ج انہیں اتنی لمبی عمر کیسے مل گئی۔ پسرو، انہوں نے ایک بار لمبا جاپ کیا اس کا بچل انہوں نے یہ پایا کہ ماں لوگ سے نسل کر دیو لوگ میں جا براجے۔ ورنہ شاہدیوں کے جگرے نسل کر سنتے ہو گئے پر ایک بار ان سے کچھ چوک ہو گئی۔ پھر اس دھرتی پر ڈھکیل دیئے گئے۔ اندر دمن نے پیئے تو بہت شوک کیا پھر یہ دچار کر کے من کو بہل دیا کہ ہوں تو میں اس دھرتی ہی کا بآسی۔ اپنے دلیں چلتے ہوں اور نیکھیوں ساختیوں

سے ملتا ہوں۔ سودہ گھومنتے پھرتے اپنے نوجوانی پر اپنے سنگھیوں کو دُھونڈنے لگتے پر کسی سنگھی کا لکھوچ نہ پایا۔ سے بہت بیت چکا تھا۔ سب سنگھی ساتھی مرکھ پچکے تھے۔ انہیں پہت دلخی چوئے۔

ہے پانڈو اند دن یہ سوچ کے پہت دلخی ہوئے کہ اب کوئی انہیں پہچانا تھا بھی نہیں۔ اس لکھوچ میں کہ کوئی پہچاننے والے ملے وہ نوجوان گھومنتے پھرے پر کوئی ایسا زندگی نہیں پہچانا تھا۔ کہیں ان کی مدد بھیر بھجو سے ہو گئی بوئے کہے مارکنڈے میں نے سنا ہے کہ تیری اگر بہت لمبی ہے تو تو مجھے پہچانا ہو گا۔ میں نے کہا کہ رشی مہاراج میں اپنی دھن میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ نہ کسی استھان پہنچتا ہوں نہ کسی مانوسے ہستابوتا ہوں۔ میں بھلا کے پہچانوں گا۔ اند دن رشی میری یہ بات سن کے اور بھی دلخی ہوئے۔ پھر انہیں نے مجھ سے پوچھا کہ ہے مارکنڈے: تجوہ سے زیادہ غرداں بھی کوئی ہے میں نے کہا کہ ہاں ہے۔ ہمادت کی چوٹی پر ایک اتو بیٹھا ہے اس کی مدد مجھ سے زیادہ ہے بوئے کہ چل میرے سنگ چل کر اس اتو سے پوچھتے ہیں کہ تو مجھے پہچانا ہے وہ مجھے ادھیر پہچان لے گا۔ پتڑو، میں اند دن کے سنگ ہولیا ہم دونوں چلے انوکے پاس۔ چلتے چلتے ہمادت کی چوٹی پر پنچے دیکھا کر الو ایک لٹھنٹھہ پر آنکھیں موندے بیٹھا ہے میں بہت شتابدی پہلے یاں پر آیا تھا۔ اس سکے بھی وہ اسی پر کار آنکھیں موندے بیٹھا تھا تب سے اتنک اس نے آنکھ نہیں لکھوٹی تھی ہم نے جب اسے پکارا تو مشکل سے آنکھیں لکھوٹیں۔ اند دن جی نے پوچھا کہ ہے الہیں اند دن ہوں۔ تو مجھے جانا ہو گا۔

الہ نے اند دن جی کو دیکھا کہا میں تو تجھے نہیں پہچانا تا۔ اور پھر آنکھیں موندیں اند دن جی الہ سے یہ بات سن کے بہت دلخی ہوئے پہلے تو چپ ہی ہو گئے پھر انہوں نے الہ سے ایک پرشن کر ڈالا ہے اتو تجوہ سے بھی زیادہ غرداں کسی جنے کی ہے اونے مشکل سے آنکھیں لکھوٹیں کہا کہ ہاں ہے یاں ہے پچھم کی اور ہزار کوس پر ایک تیار ہے اس تیار

کے بیچ ایک سارس کھڑا ہے اس کی عمر مجھ سے زیادہ ہے۔

اندر دن رین کے بوئے کہ ہے اور تو میرے منگ چل۔ ہم چل کے اس سارس سے بات کرتے ہیں وہ مجھے ادشیہ پہچانے لگا۔

او منگ چلنے پر تیار ہو گیا تب اندر دن، او اور میں، میتوں مل کر جیسے سارس سے ملنے کے لیے بہیں بعد سارس چونچ پر دن میں دیئے آنکھیں موندے ایک ٹانگ پر مہینوں بعد اس تیلا پر پہنچے۔ دیکھا کہ بیچ تیلا میں ایک سارس کھڑا ہے۔ اونے بتایا کہ سارس ان شا بدیوں سے اسی پر کار آنکھیں موندے چونچ پر دن میں دیئے ایک ٹانگ پر کھڑا ہے۔

اندر دن نے پکار کے کہا کہ ہے سارس میں اندر دن ہرل سارس نے چونچ پر دن سے نکال، آنکھیں کھولیں اور بولا کون اندر دن۔ اس پر اندر دن نے کہا کہ ہے سارس کی تو اندر دن کو نہیں پہچانتا۔ میں اندر دن ہوں۔ سارس نے کہا کہ نہیں میں اپنی تپسیا میں کھوی جوا ہوں۔ مجھے کی معلوم کہ تو کون ہے اور اندر دن کون ہے۔

بیچارے اندر دن پر گھروں پانی پڑ گیا چپ کا چپ رہ گیا پھر تہمت کرنے کے پوچھا کہ ہے سارس تجوہ سے زیادہ عمر بھی کسی کی ہے۔

ہاں ہے بھلا کس کی ہے؟ ہے مانو۔ اسی جھیل میں ایک کچوا باس کرتا ہے اسکی عمر اتنی ہے کہ میں اس کے سامنے بائک کے سماں ہوں۔ ہے سارس، کچوا بھلا وہ اس سے کہھر ہے ہے مانو وہ کچوا تو سکھو کھا۔ برسوں سے آنکھیں موندے تیا کے اندر بیٹھا ہے اور ادم کا جاپ کر رہا ہے پر میں تیرے یہے اسے بلا تا ہوں۔

یہ کہہ کے سارس نے کچوے کو پکارا۔ کچوا سارس کے پکارنے پر تیا سے باہر آیا اور بولا کہ ہے سارس تو نے کس کارن میری تپ میں بھنگ ڈالی۔

سارس نے کہا کہ ہے کچوے ایک لمبی عمر والا مانو کا لے کو سوں چل کر آیا ہے میں تو اسے پہچانتا نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جس کی عمر تجوہ سے زیادہ ہو اس کا پتہ دے، وہ مجھے

بیچانے کا تو مجھ سے زیادہ تو تیری ہی عمر ہے تو بتا کہ تو اس مانو کو پہچانا ہے۔
پچھوئے نے پوچھا کہ "بھلا اس مانو کا کیا نام ہے؟"

اندر دم نے آگے بڑھ لی کہا کہ "ہے پچھوئے میرا نام اندر دم ہے میں اتنی
شتابدیوں کے بعد پیٹ کے میں پہ آیا ہوں کہ میرے نگھی ساتھی سب مرکھ پچکے ہیں
کوئی مجھے اب پہچانا ہی نہیں۔ شاید تو مجھے پہچانا ہو!"
پچھوئا اندر دم کا نام سن کر چونکا۔ غور سے اندر دم کو دیکھا اور ترنٹ پہچان
لیا۔ پہچان لیا وہ رویا اور بولا کہ "ہے اندر دم میں بھلا تجھے کیسے نہ پہچان کر تو نے
جو گستاخیں دان دی تھیں انہوں نے ہی تو بھر مار مار کے ریتیا بنائی ہے جس میں اب میں
باس کر رہا ہوں!"

پچھوئے کے یہ کہتے ہی دیلوک سے ایک رنگ اتر۔ ساتھ میں ایک پکارائی کہ ہے
اندر دم چل، چل کے دیلوک میں اپنا استھان بنھال۔

اندر دم رشی رنگ میں بیٹھے ہمیں بھی اپنے نگ لٹھایا۔ ہم میں سے ہر ایک
کو اس کے ٹھکانے پر آتا۔ بھر خود دیلوک کو سدھا رگئے۔

سو بھئی مترو، آدمی بھوساگر میں ایسا ہے یہ کائنات غیر جگہے اور ہم اس میں
اجنبی ہیں سویاں سے جلدی گزر جانے ہی میں عافیت ہے لمبی عمر کی آرزو میں خرابی
ہی خرابی ہے کچی بات ہے مجھے تو یہ حکایت پڑھو کے بہت عبرت ہوئی۔ میں دُرتا ہوں
اس دن سے جب یا ر عزیز شاق علی اس نگر سے ہجرت کر جائے اور عہد حاضر کی
شب دیجوار میں رنجود ہجود اکیلا رہ جائے بھر میں اندر دم کی طرح الوں سے
پوچھتا بھر دل گا کہ مترو تم مجھے پہچانتے ہو۔ اندر دم کو توانست میں ایک کچھوئے نے
پہچان لیا تھا۔ مجھے کون پہچانے گا۔ دیکھتے دیکھتے دنیا بدل گئی آگے لگتا تھا کہ سارا نگر

مجھے جانتا ہے اب لگتا ہے کہ یہ غیر جگہ ہے اور میں پر دیسی ہوں۔ خود میر بیٹا مجھے غیر جانا ہے جان پہچان والے ایک ایک کر کے سب ہی چلے گئے بس ایک مشتاق علی نے زین بخڑی ہے پرنتو وہ اس لکھڑی بتیں دانتوں کے یقین زبان کی سماں میں کل تک جوانہیں جھک کے ڈنڈوت کرتے تھے وہ اب انہیں پہچاننے سے انکاری ہیں جو دوستی کا دم بھرتے تھے اب وہ شترد بنے ہوئے ہیں۔ میری جاتی کے لوگوں کے ارادے ان کے مبارے میں پچھے نہیں ہیں اور تو میں کچھ لرنیں سکتا۔ بیٹا تک میرے کہنے میں نہیں ہے دوسرے کی سنیں گے خیر میں نے کچھ منتر جو میں نے آنہجہانی پتائی کی پوچھی میں لکھے دیکھیے تھے مشتاق علی کو بتا دیئے ہیں۔ ذیل میں چند ایک نقل کرنا ہوں۔

شتر و کوئی شر کرنے کا منظر

اوونگ، ہرینگ، سرینگ — یہ شبہ آکھ کے پتے پر لکھے اور گرم تندر میں جھونک دے۔ سات دن ایسا کرے شتر جل کر راکھ بوجاؤے گا۔

الضبا

اوونگ، بلوونگ، یک جنگ بجنگ جھے ہنومان کی — یہ شبہ بول کے کانٹے سے بھوج پتہ پر لکھے بکھ کے بازو پر باندھ لے شتر دیکھ کے ڈرے گا، کنی کاٹ کے نسل جادے گا۔

الضبا

مم، مکٹ، سکٹ، مم منور تھے پورنی، مم چننا چورتی۔ دہائی باسہ یور کی۔ دہائی بنا چماری کی — یہ شبہ پیل کی بخڑی کی سیکھنی سے پتہ پر لکھ کے دوپر کے سے

چو کھٹ تھے دبادیں۔ پھر اس گھر کے یئے کوئی جگھوں نہیں پہنچے لگھڑا بے بیرلوں سے
پڑھت رہیں گے۔

آنجھانی پتا جی کا بیان ہے کہ یہ منتر آزاد مودہ یا کو اپر متر و دوستو صب سے بڑا
منتر تو ادم کے جاپ کلہے۔ ادم کا جاپ روپلا ہے آدمی کیسے ہی سنکٹ میں ہو کیسی
ہی مشکل میں ہوا دم کا دردگرے، منکٹ نے سکل آدم کا مشکل دندہ ہو جاوے
گی۔ سمجھو، ہمارا من ماجس کی ڈبیا ہے ادم کا کلمہ ماجس کی تیلی ہے تیلی کو ڈبیا پھسو
روشنی پیدا ہوگی، سارا اندھیرا در ہو جاوے گا، متر و اور دوستو، میرا تو یہی ایمان
ہے میرا رد زانہ کا فظیفہ یہ ہے کہ سونے سے پئے سو فرا دم کا دردگر آہوں اور
تین دفعہ نا دعلی پڑھتا ہوں۔ ادم شانتی شانتی شانتی۔ یا علی۔ یا علی۔ یا علی۔

۸

اس بست پر وہ مجھے بہت یاد آئی تھی بھی تو اس اپنے نئے گھر میں یہ میری پہلی
بست - کتنے برسوں بعد میں نے بست کے اجلے نیلے آسمان کو دیکھا کہ دھوپ سے عبار
تھا اور پنگوں پرندوں سے جملہ رہا تھا - کرتے والے مکان ایک پہلے مکان کو تجوڑ کر
بیشہ اتنے تنگ میسر آئے کہ آسمان سے ڈھنگ کی ملاقات بی نہیں ہو پاتی تھی - اصل
میں آسمان بھی تو ہمارے رہنے سہنے کے حساب کو درکھد کر پنے درشن دیتا ہے - جتنا ان
آنسا آسمان - ابھی اپنے گھر کا آنگن اجلا اجلا تھا - چھٹت بھی بہت پھیلی ہوتی دکھانی
دیتی تھی - گھر کے اس اجلے اور کشاور گرد و پیش میں بست کا آسمان کتنا روشن کتنا
کشادہ نظر آ رہا تھا -

بست کی اس بھجملی میں حافظہ کے دریکے کتنی تیزی کے ساتھ کلتے چلے گئے
بیتے دنوں کی ہبک اپنے بیاؤ میں میرے تتر بر رینز دل کو بھی لے آئی - میں پھر سے
اکٹھا ہو رہا تھا - رگلا کہ وہی میں ہوں جو ہوا کرتا تھا اور وہی یہ دن ہیں - وہ باسکل
اسی رنگ کا بستی دن تھا - ہوا میں حرارت اور خشکی کا ایسا ہی گھاٹ میل تھا - فون کی
گھنٹی بھی - میں نے اٹھایا - وہ بول رہی تھی - بست کی ترنجک میں میری بھی زبان کھل
گئی - پہلی بار تکلف کو بالائے طاق رکھا ۔ شہزادی کی جوئی اپنا کام دکھا چکی ہے لے

اب والیس لے بی بیا جائے تو اچھا ہے؟“

”شہزادی کی جوتی ہی کیا مطلب ہے؟“

”مطلوب یہ کہ میں نے اس حسین قلم کو بہت سبھال کر رکھا۔ یہ امانت اب مجھے مجھے بحداری پڑ رہی ہے۔ اب تم آگر اپنی امانت لے جاؤ۔ یہ وقت بھی مناسب ہے۔“

”یہی کہ اگر یہ موسم گندہ گیا تو پھر ساون دُت تک انتظار کرنا پڑے گا۔ وہ کھلکھلا کر رہنسی۔ وہی بتاں ہن، ہنسی، ہیں ساری فقرہ بازی بھول گیا۔ پکھلتا چلا گیا۔ ایک مرتبہ پھر فون درمیان سے سرک گیا۔ بس وہ محنت اور سیں۔ وہ بالکل بینت کی طرف کہلی ہوئی۔“ اچھا کل،“

”کل؟... واقعی؟“ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

جیسے کھلکھلاتی ہنسی ایک دم سے سرگوشی بن گئی ہو۔

”ہاں کل؟“

”آج چھٹی کا دن اونچھ کر، ہی گزارہتا ہے۔“ زبیدہ کی آواز آتی اور اس کے ساتھ ہی وہ خود آن موجود ہوئی۔

”کیوں، کیا مسئلہ درپیش ہے؟“ میں یادوں کی اقلیم سے کتنی تیزی سے ہڈتا ہھڑتا دالیس آیا۔

”میں نے کہا کہ آج چھٹی کا دن ہے۔ ہاؤ سنگ والوں کا حساب آیا رکھا ہے۔ ذرا اسے چیک کر لیتے۔ یہ بھی پتہ چل جانا کہ ہماب تک کتنا ادا کر چکے ہیں،“

”کل پرسوں کسی وقت اطمینان سے بیٹھ کر حساب کریں گے؟“

”آج کیا بے اطمینانی ہے؟“

”بے اطمینانی تو کوئی نہیں ہے۔ میں اتنی بات ہے کہ آج بینت ہے۔ دیکھ

نہیں رہی ہو آج آسمان پر کتنی چھل بیبل ہے؟

”یہ بست سے زیادہ ضروری کام ہے۔ پتہ تو چلے کہ انہوں نے حساب میک
بھیجا ہے۔ کم زیادہ تو نہیں کیا۔ محکمہ والوں کا کوئی اعتبار تھوڑا ہی ہے۔ کیا پتہ ہے۔
ہمارے حساب میں کس وقت کتنی رقم نکال دیں۔ جو دنیا ہے وہ تو دنیا ہے ہی جفت
کی چٹی تو نہ پڑے؟“

بس جیسے آنگن میں اُتری ہوئی چڑیوں کو کوئی ہش کہہ کے اڑا دے۔ ان
چار فقروں نے یادوں کے جگہ کو تتر بر کر دیا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں ایسے ہو گیا
جیسے اندر سے بالکل خالی ہوں۔ غیر تھوڑی بھی دیر میں یادیں پھر اُترنے لگیں۔ آنگن
پھر بھرتا چلا گیا۔ اب میری نظر میں آسمان سے اُتر کر اس گیند سے پر ڈول رہی تھیں۔
جو لان کے ایک دھوپ سے بھرے گو شے میں کھڑا ہنس رہا تھا۔ یادوں نے اس گیند سے
سے اشارہ لیا اور، ہجوم کرنی چلی گئیں۔ ہر بھر کر دہی یاد جواں ہجوم میں سب سے
نایاں سب سے روشن تھی۔

”میک ہے کل سبھی۔ بست دُت تو کل بھی ہوگی۔ مگر یہ نہ ہو کہ کل کسی اگلی کل پر
جا پڑے۔ اس اگلی کل آنے پر بھر کوئی اگلی کل؟“

”بھر ہنس پڑی۔“ نہیں۔ کل کا مطلب ہے کل؛
”کل کس وقت؟“

”بس پنج ٹائم میں آ جاؤں گی؟“

میرے کان کھڑے ہوئے۔ ”اچھا تو کسی دفتر میں کام کرنی ہوئے۔“

یہ بات جیسے سنی ہی نہیں۔ صاف گول کر گئی۔ ”بس کل ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ
آ جاؤں گی۔“

”میک ہے، مگر وہ پنج کا وقت ہوتا ہے۔ دیے میرا توڈڑائی پنج ہوتا ہے۔“

کافی ہاؤس میں جا کر کرتا ہوں۔ اچھا ہے کافی کی پیالی پر ملاقات زیادہ بھلی لگتی ہے:

”تمہور ڈے تامل کے بعد“ اچھا ٹھیک ہے۔ وہیں آجائوں گی۔

”لہٰ مگر میں تمہیں پہچانوں گا کیسے؟“

”درستن نے پدم کو کیسے پہچانا تھا؟“

”اس نے تو پدم کو خواب میں دیکھا تھا۔“

”آپ نے ابھی تک مجھے خواب میں نہیں دیکھا تھا ساختہ ہی کھنکھناتی ہنسی۔ فوراً ہی ایک فقرہ اور لگا دیا۔“ اور ہاں طوطا بھی تو ہو گا۔

میں بالکل لا جواب ہو گیا۔

”لہٰ مگر میرا گائیڈ تو کوئی طوطا نہیں ہو گا۔ میں آپ کو کیسے پہچانوں گی؟“

”بہت آسان طریقہ ہے۔ کاڈنری میرا نام لے کر پوچھ لیجئے۔ میں بھی کہہ رکھوں گا کہ ایک بی بی ذکیرہ احمد نام کی آئیں گی۔ ٹھیک ہے نا۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔“

”میں نے کہا کہ کان بند کر کے بیٹھے ہونے ہو،“ نہ بیدہ کی آواز آئی اور ایک مرتبہ پھر تھپٹیاں بھرا کھا کے اڑ گئیں۔

”لہ کیوں کیا ہوا؟“

”در دارے پر کوئی ہے۔ بیل بھی ہے۔“

”اچھا۔“ میں اٹھ کفرٹا ہوا۔

جا کر در دار کھولا۔ کامریڈ کھڑا تھا۔ ”کامریڈ، تم اس وقت کہاں سے آئے چکے؟“ کامریڈ اندر آیا۔ اپنے پُرانے دستور کے مطابق کتابچوں رسالوں اخباروں سے بھرا تھیلا ایک طرف رکھ کر سی صوفہ سے کنارہ کر کے قالین پر گیا۔

”یہ وقت کی کیا شرط ہے۔ کیا غلط وقت پر آیا ہوں۔ دیے تو ہر وقت ہی

غلط وقت ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں سالاٹیک وقت کب آئے گا؟
”بہر حال آگئے۔ اچھا کیا؟“

”کیا کردے ہے تھے؟“

”بسنت منار ہا تھا۔“

کامریڈ نے اوپر سر سراق پینگوں پر نظر ڈالی۔

”بپر نومہیں تھت پہ ہونا چاہیے تھا۔“

”نہیں بس اپنے لان میں بیٹھا تھا۔ عصولتے گیندے کو دیکھ رہا تھا اور گذتے دنوں کو یاد کر رہا تھا۔ یاد، وہ اچھے دن تھے۔“

کامریڈ نے غصہ بن کر نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”اچھے دن؟ وہ کونے دن تھے؟“

”جن دنوں ہم اکتھے تھے۔“

”چار رجعت پسند اگر اکٹھے ہو جائیں اور بورڑا ادب پہ دھواں دھار بائیں کر کے وقت خاتم کریں تو وہ دن اچھے ہو جاتے ہیں؟“

”کامریڈ مت بھولو کر اس مندرلی میں تم بھی مجھے اور تمہارا کامریڈ ظہور بھی

تھا۔“

”کامریڈ ظہور“ کامریڈ نے دانت پکپائے ”ان سالوں ہی نے تو پارٹی کا بیڑا غرق کیا۔“ رُک کرڑا اور وہ سالا کامریڈ شوکت۔ ایکسپورٹ اپورٹ کے لائنس کے چکر میں پارٹی کا تیا پانچا کر دیا۔ انقلابیوں کا سرخیل بنا پھر تھا۔ اب سمنگلر کنگ ہے۔ میں نے کامریڈ کا ہاتھ پکڑا۔ ”ذرایا پہر چلتے اسے لے جا کر لان میں کھڑا کر دیا۔ اپنے گیندے کی طرف اشارہ کیا۔“ کامریڈ، آج بسنت کا دن ہے۔ میں تمہاری انقلابی بجواب سننے کے بالکل مود میں نہیں ہوں۔ آج اپنے گیندے سے میرے مرکالے کا دن ہے۔“

”کامریڈ، تم مرفیق ہو۔ اپنا علاج کرو۔ جو تو ام کے ساتھ مکالمہ کی ہمت نہیں رکھتے پھر وہ گیندے اور گلاب ہی سے مکالمہ کرتے ہیں۔ اس مکالمہ میں کوئی جو کھول جو نہیں ہے“

”اچھا تھیک ہے۔ تم آج زیادہ ہی کہیں سے پٹ کر آئے ہو۔ آرام کرو۔ فراش مہماز کے پاس چلیں گے۔“

”مہماز سے تمہاری ملاقات ہو گئی؟“

”ہاں ہوئی تو نہیں۔ یار وہ تواب یہت معروف ادمی ہو گیا ہے۔“

”جو سالا پیسر کی لیتا ہے اس سالے کا وقت پھر بہت قیمتی ہو جاتا ہے۔“

”بہر حال آج اس سے ملاقات کی محضیری ہے۔ کہنے لگا کہ پر د گرام کیا ہے۔ تک نے کہا کہ یاد کھلی ہم پہلے پر د گرام لے کر کے ملے ہتھے۔ لبس مل کر جیھیں گے یا تیس کریں گے۔ پہلانے دنوں کو یاد کریں گے۔ بقدر توفیق رنج گا کریں گے۔“

کامریڈ نے ایک مرتبہ پھر میری مرفیقانہ ذہنیت پر بھر لپڑ تبصرہ کیا اور اندر ڈرائیٹنگ روڈم میں جا کر قایم پے لوٹ لگانے لگا۔ وہ اندر خزانے لے رہا تھا اور یہاں میں گیندے کے رو برو دیپنے خیالوں میں گم تھا۔ سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا۔ وہاں سے پھر مل گیا تھا۔

”یار مہماز، آج کل مجھے ایک لڑکی ملکری ہوئی ہے۔“

”مہماز ہی سے میں دل کے معاملات کہتا تھا کہ اسی پر مجھے ان معاملات میں اعتبار تھا۔“

”جب تم اسے شروع گے تب ہم جائیں گے۔“

”وہ نہیں یار۔ یہ ایک اور لڑکی ہے۔“

”اچھا ہے کوئی نیا چکر۔ یہ چکر کیسے شروع ہوا؟“

”کوئی چکرو کر نہیں ہے۔ تمہیں پتہ ہے کہ آج کل میرا سکوٹر خراب ہے۔ ویگن سے دفتر آتا جاتا ہوں۔ تو جب میں صبح کونکلتا ہوں اور سینٹڈ پر جا کر ویگن کا انتصار کرتا ہوں تو وہاں ایک بے چین روح نظر آتی ہے۔ بار بار اپنی گھری دیکھتی ہے۔ جیسے اپنی گھری پر اسے اعتبار نہ ہو، میرے پاس آتی ہے۔ پہلے پوچھے گی کہ آپ کی گھری میں کیا وقت ہے۔ پھر پوچھے گی کہ ویگن کا تو یہی ٹائم ہے نا۔“ ”جی۔“ ”پھر کیوں نہیں آئی ابھی تک۔“

”پتہ نہیں۔“ ”کہیں آکر چالی تو نہیں گئی۔“ ”میرے خیال میں تو ابھی نہیں آئی ہے۔“ ”آپ یہاں کب سے کھڑے ہیں؟“ ”یہی کوئی اور گھنٹے سے۔“ ”اچھا، پھر ٹھیک ہے۔“ ”بہت سوال کرنی ہے۔“

”ابتدا تو اچھی ہے۔ دلیے شکل و صورت کیسی ہے؟“ ”یاد شکل و صورت کی تو بُری نہیں۔ مگر لو رہے یا اس کے سوالوں سے میں بو رہو گیا ہوں۔“

”اوہ تم کوئی سوال نہیں کرتے؟“ ”نہیں۔“

”کچھ نہیں پوچھتے؟“ ”نہیں، میں کیا پوچھوں۔“

”کوئی بھی بے معنی فضول لا یعنی سی بات پوچھی جا سکتی ہے۔ بات جو کرتی ہوئی۔“ ”نہیں، میری سمجھ میں تو کوئی بات آتی نہیں۔ سو میں تو اُس سے کچھ پوچھتا ووچھتا نہیں۔“

”پھر لو ر تو تم ہوئے۔“

”یار، میرے دماغ میں تو وہ بسی رہتی ہے۔ اب اس کے ہوتے ہوئے تو مجھے سب لڑکیاں بے معنی نظر آتی ہیں یہ“
 ”بھرا سمی کے متعلق کچھ کرو۔“
 ”کیا ہے۔ کل ملاقات ہو رہی ہے۔“
 ”اچھا ہے۔“
 ”ہاں ہے۔“
 ”لگدی ہے۔“

اور دوسرا دن لمح کا وقت ہونے سے پہلے ہی میں دفتر سے نکل دیا کہہیں یہ نہ ہو کہ وہ میرے پہنچنے پہنچنے آکر چلی جائے۔ منتخار کرنے والے بھی کتنے محبت پسند ہوتے ہیں۔ یوں پوری عمر انتظار میں گزار دیں۔ خیر لمح ٹائم سے پہلے ہی میں موقعہ وادا پہنچ گیا۔ ایسی میز سنجھالی اور ایسے زاویے سے بیٹھا کہ دروازہ کھول گر جو بھی اندر آتا وہ صاف نظر آتا۔ دروازے کے بر ابر کا ڈندر تھا۔ روز کی طرح آج بھی اشرف صاحب کے کافی ہاؤس کے میمنخر ہیں۔ کاڈنٹر پہ بیٹھے تھے۔

لمح ٹائم ہو چکا تھا۔ دروازہ بار بار کھلتا آنے والے آتے چلے جا رہے تھے۔ مگر مجھے باقیوں سے کیا لینا تھا۔ میں تو اس وقت چوتھکا تھا۔ جب کوئی لڑکی داخل ہوتی اور ہر خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر میں شک میں پڑ جاتا کہ شاید یہی وہ ہے۔ وہ قریب آتی جاتی اور میرے دل میں دھنکڑ پکڑ ہونے لگتی۔ مگر میرے قریب سے گزر کر وہ سڑھیوں پر ہو لیتی اور اپر کی منزل پر پلی جاتی۔ ایک خوبصورت لڑکی جب داخل ہو کر ٹھٹھکی اور کاڈنٹر پر کھڑے ہو کر اشرف صاحب سے پچھ پوچھنے لگی تو میں نے سوچا کہ یہ لڑکی ضرور وہی ہوگی۔ مگر اشرف صاحب نے سڑھیوں کی طرف اشارہ کیا اور وہ سونتی ہوئی اور پر چلی گئی۔

بھرا کیک لڑکی نے داخل ہو کر ادھر ادھر نظر دوڑائی اشرف صاحب سے

کچھ پوچھا اور فوراً ہی واپس چلی گئی۔ میں لپک کر کاونٹر پر گیا۔ "اشرف صاحب، یہ لڑکی کے پوچھد رہی تھی۔"

"معظیم صاحب کو پوچھد رہی تھی۔ آج وہ آئے ہی نہیں۔"

میں اپنی جگہ پر آبیٹھا۔ مگر جب ایک اور لڑکی اسی طرح داخل ہو کر کاونٹر پر اشرف صاحب سے بات کر کے چلی گئی تو میں بھرپور چیزیں ہوا جا کر بھرا شرف صاحب سے پوچھا۔ "یہ لڑکی کے پوچھد رہی تھی۔"

شرف صاحب مجھے دیکھ کر ہنسے: "اخلاق صاحب، جب آپ والی لڑکی آتے گی تو میں اسے آپ کی طرف ڈائرکٹ کر دوں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" میں بہت سپُٹھایا۔ "شرف صاحب، میری کوئی لڑکی نہیں ہے۔ میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔" پھر میں نے وضاحت کی "ہوا یہ کہ وہ ہمارے دفتر میں فون کرنے آئی تھی۔ میں تو اس وقت بتتا بھی نہیں۔ وہ جاتے ہوئے اپنا پین بھول گئی۔ اصل میں اسے اپنا پین لینے کے لئے آنا ہے۔"

"ارے اخلاق صاحب، آپ تو صفائیاں پیش کرنے لگے۔"

"صفائی پیش نہیں کر رہا، بتا رہا ہوں۔"

وہ شفیق ہے۔ آپ بیٹھے ہیں نا۔ وہ آئے گی تو مجھے ہی سے پوچھے گی۔ میں آپ کی طرف اسے ڈائرکٹ کر دوں گا۔"

میں نے وہیں کھڑے کھڑے بیٹھیں کے اپنی گھری دیکھی۔ "پنج ٹائم جا رہا ہے۔"

مجھے آخر دفتر واپس جانا ہے۔ ابھی تک آئی ہی نہیں۔"

"کیا اُسے دور سے آنا ہے۔"

"اب یہ تو مجھے پتا نہیں۔ ویسے دور ہی سے۔ آرہی ہو گی اور پھر اس وقت سواری بھی مشکل سے ملتی ہے۔" میں نے اس طرح اپنے آپ کو بھی سمجھ دیا اور واپس اپنی جگہ

آبیمہا اور اب میں ایک شک میں پڑ گیا تھا۔ پرستہ نہیں آئے گی بھی یا نہیں اور اس شک کے ساتھ میری بے چینی اور بڑھ گئی۔ آسی آن دروازہ کھلا۔ ایک لڑکی داخل ہوئی۔ مگر اس مرتبہ میں تھوڑا بورہ ہوا۔ اصل میں یہ وہی لڑکی تھی جو مجھے بس سینٹر پر نظر آیا کرتی تھی۔ میں نے بیزار ہو کر سوچا کہ لویریہاں بھی آن پسکی۔ اس نے کامڈیٹر پر کھڑے ہو کر اشرف صاحب سے کچھ پوچھا۔ انہوں نے اسی طرف اشارہ کیا جس طرف میں بیٹھا تھا۔ وہ لڑکی میری سمت آئی۔ میں ایسے بن گیا۔ جیسے میں نے اسے دیکھا ہی نہیں۔ پھر میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ شکر ہے کہ واپس چل گئی۔ پھر مجھے یونہی خیال آیا کہ آخر یہاں وہ کس سے ملنے آئی ہے۔ ہو گا اس کا بھی کوئی دلدادہ۔ جوان لڑکی کسی بھی ہو، چاہئے دالا کوئی نہ کوئی اُسے مل ہی جاتا ہے۔ یہ سوچ کر میں اسے ذہن سے رفع دفع کر دینا چاہتا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ اشرف صاحب اُسے ساتھ لے کر میری طرف آ رہے ہیں۔ ”دیکھئے یہ میں اخلاق صاحب“

”آپ“ اس نے مجھے حیران ہو کر دیکھا۔

”جی میں اخلاق ہوں یہ میں نے اپنی بیزاری کو چھپا تے ہوئے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

”وہ سپشائی“ آپ اخلاق صاحب ہیں۔ اپھا آپ ہیں۔ میں سمجھ رہی تھی کہ ”آپ کیا سمجھ رہی تھیں“ میں نے اب کسی قدر ترشی سے جواب دیا۔

”دیکھئے بات یہ ہے کہ میں نے آپ کو فون کیا تھا۔ مجھے آپ سے میں لینا تھا“ اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ ”پیں۔ آپ کو میں لینا تھا۔ تو آپ ہیں۔“

”جی“

”تشریف رکھیں۔“

وہ کسی قدر تماں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ادھروہ سپشائی ہوئی تھی۔ ادھر میں۔

”اچھا آپ کا وہ پین ہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ

”جی آپ کیا سمجھ رہے تھے؟“

”لگھ نہیں۔“ میں نے فوراً جیب سے پین نکالا اور پیش کر دیا۔ یہ لمحے۔ آپ کا

پین حاضر ہے۔“

اس نے قلم لیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تشریف رکھیں نا۔ کافی پیجھے۔“

”شکر ہے۔ میں اس وقت جلدی میں ہوں یا۔“

شام کو متاز ملا۔ میں نا اور استاد کیا جوا۔

”یار بہت بُری ہوئی۔“

”کیوں۔ نہیں آتی؟“

”آتی تو تھی۔“

”پھر؟“

”یار وہ تو وہی بور لڑکی تھی یا۔“

”کونسی بور لڑکی؟“

”وہی جس سے بس سینٹر پہ میری مدد مجیسٹر ہوتی رہی ہے۔“

متاز نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ ”اچھا وہ تھی۔ اچھا بتاؤ پھر کیا ہوا۔“

”میں نے اسے پین دیا اور چلتا کیا۔“

متاز ایک دم سے منجیدہ ہو گیا۔ ”چلتا کر دیا؟ کیا مطلب ہے؟“

”ہاں ادھر میں اسے دیکھ کر سپیٹایا۔ ادھروہ بھی مجھے دیکھ کے سپیٹا گئی۔ یہ

سچوالیں دونوں ہی کے لئے خلاف توقع تھی۔ میں نے پین اس کے حوالے کیا وہ چلی

گئی۔“

”تو کوئی بات ولت نہیں کی؟“

”اس سے کیا بات والت ہو سکتی تھی؟“

”کافی وافی سے تواضع کی ہوگی۔ آخر اس دو دن کیا کرتے رہے؟“

”میں نے کافی کے لئے پوچھا تھا۔ اُس نے کہا کہ میں جلدی میں ہوں۔ میں نے بھی سوچا کہ اب اسے جانتے ہی دوڑا۔

”متاز میری اس بات پر بہت بے ضرہ ہوا۔“ یار عجیب گھامڑ آدمی ہو۔ اپنی محلی آٹی ہوئی لڑکی کو گنوادیا۔

”یار تمہارا کیا خیال ہے وہ لڑکی بور نہیں تھی؟“

”کونسی جس سے غون پر تم لمبی لمبی باتیں کیا کرتے تھے؟“

”نہیں یار، وہ تو بہت سو سیت تھی۔ مگر جو بس سینند پر میرے لگے پڑگئی تھی۔“

”نادان آدمی، اب تو تجھے سمجھد آجائی جائے کہ لڑکی بیک وقت بور بھی ہوتی ہے سو سیٹا بھی ہوتی ہے۔ دیسے ایک بات میں تجھے بتائے دیتا ہوں۔“

”کیا؟“

”تم پچھتاو گے۔“

”کیسے؟“

”بس میں نے کہہ دیا۔ لڑکی اس طرح سے آکر چلی جائے۔ آدمی کو یہ توبعد میں پتہ چلتا ہے کہ ہوا کیا۔“

خیر اس وقت تو میں نے متاز کی بات سنی کر دی۔ پھر ایک دو دن میں نے بس سینند کا رُخ ہی نہیں کیا۔ سوچا کہ نہ بس سے سفر کرو گے نہ اس سے مدد مجھ سر ہوگی۔ رکشا لیا اور سیدھے دفتر۔

بات جب ذرا آئی گئی ہو گئی تو میں نے سوچا کہ رکشا کا کرایہ کب تک بھرو گے۔

اپنی منی بس ہی شھیک ہے ایک دن، دو دن، تین دن، وہ لڑکی نظر نہیں آئی۔ اب میرا تجسس بڑھنے لگا۔ روز وقت سے ذرا پہلے سینٹڈ پر پہنچ جاتا، وہاں کھڑی ہوتی مخلوق کا جائزہ لیتا اور حیران ہوتا کہ وہ لڑکی کہاں چلی گئی۔

”یارِ ممتاز، وہ لڑکی تو غائب ہو گئی؟“

”وہ کون لڑکی؟“

”یار وہی۔ اب وہ بس سینٹڈ پر نظر ہی نہیں آتی۔“

”فونِ بھی کوئی نہیں آتا ہے۔“

”نہیں۔ اس نے تو بالکل چپ سادھلی۔“

”پھر پیاسے وہ گئی۔“

”کامریڈ گیندے سے تمہارا مکالمہ ختم ہوا یا نہیں ہوا۔“

کامریڈ نے دھم سے آکر یادوں کے سارے سلسلہ کو درہم و برہم کر دیا۔

”بھیا، میں نے تو پوری نیند لے لی۔“

”کامریڈ، گیندے سے نہیں، اس وقت میں پانے آپ سے مکالمہ کر رہا تھا۔“

”اپنے آپ سے مکالمہ۔“ کامریڈ نے مجھے اس وقت کتنی تھیتر سے دیکھا۔ میں تم اپنکو مل

لوگوں کی جملی زبان سے بہت تنگ ہوں۔ میں پوچھتا ہوں کہ ممتاز کی طرف چلنا نہیں ہے۔

وہ سالا تمہیں گالیاں دے رہا ہو گا۔“

”چلتے ہیں یار، چائے تو پی لیں۔“ میں آٹھ کراندر گیا۔ زیدہ سے چائے کی فرماں ش

کی۔ پھر کامریڈ کے پاس آبیٹھا۔ چائے بھی جلدی ہی آگئی اور چائے بھی جلدی ہی آگئی

اور چائے پہنچتے پہنچتے پھر میں پڑی سے آئٹگیا۔ پھر وہی یادیں اور باتیں اور میں

سوچنے لگا کہ میں اس وقت آج سے کتنا مختلف تھا۔ جیسے وہ آدمی ہی کوئی اور تھا،

اب میں نے وہچان رہی دھیان میں اپنے اس روپ کو ایسے یاد کیا۔ جیسے وہ کوئی اور

شخص تھا، مجھ سے بہتر مجھ سے برتر۔
 ”رحمت، میرا کوئی فون تو نہیں آیا تھا“
 ”نہیں صاحب جی“

اب یہ سوال اس کا معمول بن گیا تھا۔ دفتر میں داخل ہو کر اپنی نشست پر مجھماں گھنٹی بجا کر رحمت کو بلایا۔ پہلا سوال ”میرا کوئی فون تو نہیں آیا تھا“ اور رحمت کا بندھاٹ کا جواب ”نہیں صاحب جی“ بے اعتنائی کے دن کتنی جلدی گزد گئے۔ بے چینی کے دن کتنی تیزی سے واپس آئے اور پہلے کی نسبت کتنی زیادہ شدت کے ساتھ واپس آئے۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جائے اُسی کا وحیان وہی ایک آواز نرم شیر میں اس کے سامنے میں گونجتی رہتی اور اب یہ پہلے کی طرح محض آواز نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک چہرہ بھی پڑ گیا تھا۔ وہ صورت جس سے وہ اتنا بزرگ رہا تھا۔ دھیر سے دھیر سے اس کے دل و دماغ میں کھبٹی چلی گئی۔ اسی حساب سے دلکش ہوتی چلی گئی۔ اب وہ پسکر اس ساعت کے ساتھ جب وہ کافی ہاؤس میں اس کی تلاش میں داخل ہوئی تھی اس کے تصور میں کتنا رچ لیں گیا تھا۔ وہ چھر ریا بدن، وہ سالوں کی صورت۔ وہ گھبرائے گھرائے ہجہ میں پوچھنا ”آپ ہیں اخلاق صاحب“ اور پھر پہلی جانتا۔ اس نے اپنے آپ پر کتنی ملامت کی کہ اسے روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ تھوڑا اصرار کیا جاتا تو وہ فرد رک جاتی۔ نہیں رکی، مگر اس کے بعد فون تو کرتی۔ فون اس نے پھر کیوں نہیں کیا۔ کتنی بار دل ہی دل میں یہ سوال اس نے دہرا�ا۔ میز پر رکھا ہوا ٹیلی فون اب اسے کتنا بے معنی نظر آنے لگا تھا۔ ابھی پچھلے دونوں تک جب اس کے فون آیا کرتے تھے تو یہ ٹیلی فون اس کے لئے ایک زندہ شے تھا۔ غونکی گھنٹی بھتی تو داتھی بولتا ہوا لگتا، جیسے اُسے پکار رہا ہے۔ اب وہ محض ایک مشین تھا۔ ایک ٹھیکرا جس نے میز پر خواہ مخواہ جگہ گھیر رکھی تھی۔ پھر مادھجک مار کر رحمت سے سوال ”میرے پیچے کسی کا فون تو نہیں آیا“

”نہیں صاحب جی“ اور عین لمحے کے وقت بیقرار ہو کر اُجھا کھڑے ہونا - کافی ہاؤس
الیے پہنچا جیسے ملاقات کا وقت بھٹرا ہوا ہو۔

دو شرافت صاحب وہ لڑکی پھر تو نہیں آئی؟“

”نہیں“

”عجب لڑکی ہے“ بڑا بڑانا اور چپ ہو جانا۔

روز وہی ایک سوال فتنی میں جواب سننا، بڑا بڑانا اور چپ ہو جانا۔ آخر شرافت
صاحب کی زبان کھل گئی ”اخلاق صاحب، آپ اس لڑکی کے لیے بہت پریشان
نظر آتے ہیں۔“

”نہیں پریشان تو میں نہیں ہوں مگر۔“ کچھ کہنا چاہتا تھا، پتہ نہیں کیا۔

”اسے بنیک ہی میں جا کر کروں نہیں مل لیتے۔“

”بنیک میں؟“ وہ چونکا جیسے ما نہ سے نکل ہوئی دُور کا سر امل گیا ہو“ مجھے
تو پتہ نہیں کونے بنیک میں کام کرتی ہے؟“

”واہ اخلاق صاحب، یہ بھی ہم ہی بتائیں آپ کو؟“

”شرافت صاحب، آپ کمال کرتے ہیں۔ میں کونسا اس لڑکی سے عشق کر رہا
ہوں کہ اس کا پتہ نوٹ کرتا۔ وہ خود ہی اپنا پیٹ میرے دفتر میں آ کر چھوڑ گئی۔
لبس اس کی سزا بھگت رہا ہوں۔“

”تو اس روز پین لے کر نہیں گئی ہے۔“

”وہ تو خیر لے گئی تھی۔ لیکن۔۔۔“ سمجھ میں نہ آیا کہ آگے کیا کہے اور بات کیسے

بناتے۔

”محیک ہے اخلاق صاحب محیک ہے۔ مگر وہ آپ سے تو بہت قریب ہے۔

آپ کے دفتر کے پاس کریشل بنیک ہے نہیں۔“

”ہاں ہاں“

”وہیں کام کرتی ہے“

وہ حیران رہ گیا۔ کہاں کہاں اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ بغل میں لڑکا شہر میں
ڈھنڈوارا۔ وہ تو بالکل اس کے بغل میں بیٹھی ہوتی ہے۔

”وہاں اس کا پتہ کیسے چلے گا؟“

شرفت صاحب بہت بہت ہنسنے کے مکالم ہے مالا مال ہے مالا مال۔ اپ تو بہت ہی
سیدھے آدمی ہیں۔ کسی سے پوچھ لیجئے کہ ذکیرہ احمد کو صریح تھی ہے۔ پہلے تو وہ
ادائیگروں کے کاؤنٹر پر ہوا کرتی تھی۔ مگر اب جو میں پھلے ہفتے چیک کش کرنے
گیا تھا تو وہاں وہ نظر نہیں آئی تھی۔ رک کر ”پنج ٹائم ختم ہو رہا ہے۔ اس وقت وہاں
جائے گی۔“

”نہیں مجھے اتنی عجلت نہیں ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے کافی کاہی آئندہ
دے دیا۔ وہ ایسے جتارہ تھا جیسے وہ اس وقت ادھر جانے کی کوئی نیت نہیں
رکھتا۔ اطمینان سے کافی پتار رہا۔ دیر بعد اٹھا۔ اطمینان سے دہاں سے نکلا۔ لیکن
باہر نکلتے ہی اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ چلا کر شیل بنیک کی طرف۔ چل کیا رہا تھا۔ دوڑ
رہا تھا۔ کتنا جلدی جلدی اس کے قدم اٹھ رہے تھے۔ اس کا بس چلتا تو اڑ کر وہاں
پہنچ جاتا۔

”دیکھئے یہاں ذکیرہ احمد کس طرف بیٹھتی ہیں۔“ پہلے ہی کاؤنٹر جو اسے نظر آیا
اس پر سوال داغ دیا۔

”ذکیرہ احمد، وہ تواب یہاں نہیں ہوتی۔“

”جی، وہ یہاں ہوتی ہیں۔“

کاؤنٹر پر بیچے کلرک نے اُڑتی سی ایک نظر اس پر ڈالی۔ ہوتی تھیں۔ یہاں

سے ان کا ٹرانسفر ہو گیا۔“

”ٹرانسفر؟“ اس پر اوس پڑ گئی ”اچھا؟“ سوچ میں پڑ گیا۔ مگر بھر فوراً ہی اُس نے حوصلہ پکڑا۔“ آپ بتاسکتے ہیں کہ کہاں ٹرانسفر ہوا ہے؟“
کاؤنسلر کلر کے کہاں کام میں مصروف ہو جیکا تھا بڑی بدلتی سے دھبڑ سے نظریں اٹھائیں۔ قریب بیٹھے ہوئے کلر سے پوچھا۔“ یارِ مس احمد کو نی براپ میں گئی ہے؟“

”چھوٹی مارکیٹ والی براپ ہیں؟“
”شکریہ ہے بس وہ فوراً ہی پلت لیا۔

لبے لبے دلگ بھرتا چلا چھوٹی مارکیٹ کی طرف بازار کی وہ بھیڑ وہ شریف اس کیلئے کس قدر بے معنی بن گیا تھا۔ چورا ہے پر پہنچ کر اس نے ستر سرخ بیتی کا بھانڈ کئے بغیر کتنی تیزی سے سڑک کو عبور کیا۔ کتنی تیزی سے بنیک کی عمارت میں داخل ہوا۔

”دو یکھتے، یہاں ذکیرہ احمد ہوتی ہیں؟“

”ذکیرہ احمد؟“ کاؤنسلر بیٹھا کلر اس نام سے آشانہ نہیں آتا تھا۔ قریب والے سے پوچھا۔“ یار ذکیرہ احمد کون ہے؟“

”مس احمد۔ ہاں وہ نئی نئی آئی تھی۔ مگر آتے ہی اُس نے سچھی کی درخواست دے دی۔“ پھر اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔“ مسٹروہ تو لانگ لیوپر میں؟“
”لانگ لیوپر؟“ جیسے اس کے قدموں تکے سے زین نکل گئی ہو۔

”یار چاہئے ختم کرو نا۔“ کامرید کی آواز۔

”ہوں۔“ اور ایک دم سے پھر میں اپنے صیغہ میں تھا۔“ ہاں یار میں واقعی دور

چلا گیا تھا۔“ اور میں نے سوچا کہ وہ دن اب واقعی کتنی دوچلے گئے ہیں۔

میں اب اسے اس طرح یاد کیوں نہیں کرتا۔ اب تو وہ لب ایک خوشگوار لیکن

جادی یاد بن کر رہ گئی ہے۔ میں اب اسے یاد کر کے نہ بتاب ہوتا ہوں نہ اذیت
محسوس کرتا ہوں۔ اس یاد میں بے تعلقی کارنگ کتنا آگیا ہے۔ ان دنوں وہ تصور
میں کتنا زندہ تھی۔ ہر دم ایک خیال کہ اب فون کی گھسنٹی بھی اور اب اس کی آواز آئی اور
میں کتابے قرار پھرتا تھا۔ ہر دم ایک دیوانگی طاری رہتی۔ کسی کے ساتھ وابستگی بھی
آدمی کو کیا سے کیا بنادیتی ہے۔ بس جیسے جوں بدل گئی ہو۔ مگر شاید آدمی کی اصلی جوں
وہی ہوتی ہے۔ یا شاید میری اصلی جوں وہی تھی۔ وہ دیوانگی کی گئی کہ میں بھی چلا گیا۔
اب میں کہاں ہوں۔ اپنے گھر اور گھروالی کے ساتھ کھاتی پیتی زندگی بسر کرنے والا ایک
دنیادار آدمی۔ یہ بھلا میں ہوں۔ یہ تو کوئی اور ہے۔ میں تو وہ تھا جو اس وقت تھا۔
اب میں کوئی اور ہوں۔ جبکی میں چل اٹھ کامریڈ، میں پانے جبکی میں سے خالف فروڑ
ہی اٹھ گھر ڈا سپوا۔

”مساز یار، تم تو بہت بے صروت نکلے۔ کتنے دن تمہیں آئے ہوئے ہو گئے۔ آنے
کے بعد اپنی رسید تودی ہوتی“

”مبت پوچھو یار، آنے کے بعد مجھے کیا کیا پڑیں گے پڑے ہیں۔ اب کہیں جا کر
مختور ڈالیناں کا سانس لیلے ہے۔ کامریڈ سے کتنی مرتبہ کہا کہ اخلاق کی طرف چلنا ہے۔
مگر اس کی تو اپنی مونج ہوتی ہے“

”جانے بھی دے یار، کیوں گپ ہا نک رہا ہے؟“

”اچھا خیر اور سناو۔ میرے ہوتے ہوئے تم مرکان بنانے کے چکر میں پھنسے ہوئے
تھے۔ اب کیا حال احوال ہے؟“

”یار ہم تو مکان بنائے مشکل میں بھنس گئے“
”کیوں کیا ہو گیا؟“

”یار ہاؤس بلڈنگ والوں کا قرضہ تو بڑی جان لیوا چیز ہے۔ میں مہینے کے مہینے باقاعدہ قسط ادا کرتا ہوں۔ اس کے باوجود نوٹس آگئیا کہ اتنی رقم پندرہ دن کے اندر انداز کر دو رہ مکان نیلام کر دیا جائے گا۔ میری بیوی کے توہوش اڑ گئے ہیں۔“

فاروق نے مجھے تعجب سے دیکھا۔ ”ہر مہینے قسط دیتے ہو؟“

”ہر مہینے طے شدہ تاریخ پر ایک دن ادھرنے ایک دن ادھر“

”من رہے ہو ممتاز یا اُس نے ممتاز کو مخالف کیا؟“ یہ میرا یار مہینے کے مہینے باقاعدگی سے قسط ادا کرتا ہے۔“

”لگوئی تعجب کی بات نہیں ہے، ممتاز بولا“ اخلاق کو تم جانتے نہیں ہو۔ اس سے تم اور کیا توقع کر سکتے ہو؟“

”پھر اُستادشکایت کس بات کی کرتے ہو۔ مشکل کو تو تم نے خود دعوت دی ہے۔ ہم نے بھی مکان بنایا ہے اور تم سے زیادہ لمبا قرضہ لیا ہے۔ آج تک تو کوئی قسط ادا کی نہیں ہے۔“

”لگوئی نوٹس نہیں آیا؟“ میں نے تعجب سے فاروق کو دیکھا۔

”لگنہیں“

”اکھا آئے گا“

”بیشک آجائے“

”بہت سو روپیا پوڑھاتے گا“

”پہلے وہ اصل تو مجھ سے وصول کر لیں“

”کیا فراد کیا ہے تم نے؟“

”بس طریقے ہوتے ہیں۔ آدمی اگر مکان بناتے تو اسے یہ طریقے بھی معلوم ہونے چاہئیں۔ درنہ مکان تو پھر آدمی کو کہیں کامنیں رہنے دیتا ہے“

”یاد پھر ہمیں بھی یہ طریقے بتائے ہوتے۔ یہاں تو روز بیپر رہتا ہے۔ آج ہاؤ بلڈنگ والوں کی طرف سے نوٹس پرسوں کسی بھی قرضہ دینے والے کا تعاضاً“
فاروق اس پر بہت ہمہاں۔ کہنے لگا۔ ”امستاد ہماری شاگردی کرو۔ پھر ہم تمہیں قرضوں سے بچنے کے گرتباہیں گے“

میں پریشان ہو کر کسی فاروق کو دیکھتا تھا۔ کبھی ممتاز کو۔ دونوں اس وقت مجھے کتنے دانا بینا نظر آرہے تھے اور کامریڈ۔ وہ اس گفتگو سے لا تعلق سکریٹ پینے میں مگن تھا۔ آخر بولا۔ ”یاد باتیں ہی کئے جاؤ گے۔ وہ سالی چائے شائے کہاں ہے؟“
”کامریڈ۔ تھوڑا صبر اڑور دیا ہوا ہے۔“ ممتاز نے اسے دلاسہ دیا۔

”خالی چائے کا اڑور؟“

”اور کیا چاہتا ہے یار؟“

”کامریڈ، اتنے بڑے ہوٹل میں لا کے بھاڑیا اور خالی چائے پر مڑخاؤ گے۔ وہ سا تم شیخ کے بوٹ چاٹ کے جو دولت کما کے لائے ہوا سیس سے کبھی فیکروں پر بھی خرچ کیا کرو۔“

میں نے کامریڈ کو رشک سے دیکھا۔ ”یار کامریڈ، تم مزے میں ہو۔ نے غم دنیا نے غم کالا۔ نہ شادی کی نہ مکان بنایا۔“

”مکان؟“ کتنی تحریر تھی کامریڈ کے لہجہ میں۔ ”آدمی نے مکان بنایا اور کام سے گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اُسے اپنی پارٹی کے کامریڈ بیاد آگئے۔“ سالوں نے پلات چکر کرائے اور مکان بنالئے۔ کوٹھیاں بنگئے، موڑ کار، بیوی۔ دلے کے بچے چلے تھے انقلاب لانے کے لئے۔ ”تھوڑا اڑک کر“ وہ سالا اپنا کامریڈ خوشیدھ کر چکوئے۔

اور ایک تدویری روٹی، یہ اس کا نام قورمہ ہوا کرتا تھا اور کم جی کم جی لیں ایک بند ایک چائے کا کوپ۔ مگر اب پورچ میں دودو کاریں کھڑی رہتی ہیں۔ ایک کار صرف بچوں کو سکول سے لاتے جانے کے لئے ہے۔ سال انقلابی بنتا تھا۔“

”کامریڈ ظہور؟“ میں نے لفغم دیا۔

”کامریڈ ظہور؟“ کتنا منہ بگار کر کامریڈ نے اس کا نام لیا۔ اس کا سو شلنگ تو کتابوں کے نیچے دب کر رہا گیا۔ پتہ ہے۔ میرے یار کا کیا پرد گرام ہوا کرتا تھا۔ صحیحی صحیح دند پسے اٹھک بیٹھک کی۔ پھر سی کایہ لمبا گلاس غُاغٹ چڑھا۔ پھر مارکس کو لے کے بیٹھ گیا اور اس کے بعد وہ سالا فرانس کا بورڈ واشا عرب باولیٹر۔ دُسر، اسی کا گلاس مارکس، بادلیٹر۔ بھلا پوچھوان کا آپس میں کیا جوڑ ہے۔ میں نے کہا کہ کامریڈ، اس وقت ہمیں کتابوں کی ضرورت نہیں ہے۔

انقلابی ایکشن کی ضرورت ہے۔ کہنے لگا کہ میں نے ایک انقلابی نظم لکھی ہے۔

میں نے کہا کہ درستہ ہو، اس سالی تمہاری شاعری نے تمہیں بے مثل بنادیا ہے۔“
میں نے کہا کہ ”کامریڈ، کیسی باتیں کرتے ہو۔ اس غریب نے کونسی غزل کہی تھی۔

انقلابی نظیں ہی تو کسی نہیں۔“

”ہوں انقلابی نظیں۔ پانی میں چار قطرے دودھ کے ڈال دیئے جائیں تو وہ دودھ بن جائے گا۔ ربے گا تو پانی ہی۔ یہ سالی شاعری ادلب، یہ سب بورڈ والی چکر ہے۔ لفظ، لفظ، لفظ کامریڈ انقلاب میں تو گولی کام دکھاتی ہے۔ لفظوں سے تو پھلی بھی نہیں بھوٹی اور ہمارے گریٹ کامریڈ سید صاحب کی سنو؛ کامریڈ کو اسی رو میں کامریڈ سید کلب حیدر کا خیال آگیا۔ مشرق وسطی میں بادشاہوں کے تختے اٹھ رہے تھے، امریکی سامراج کا سامراج کا جنازہ نکل رہا تھا۔ میں گیا سید صاحب کے پاس کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ بتانے لگے کہ آج کل میں داش پر کام کر رہا ہوں۔“

میں نے پیران ہو کے کہا کہ وہ رندھیوں کے کوئی شاعر۔ انقلاب سے اس کا کیا تعلق ہے۔ سید صاحب مسکرائے۔ بولے، اس پر بات کریں گے۔ اس وقت تو ہم مجلس میں جا رہے ہیں مجلس، میں ہر کا بکارہ گیا۔ بولے کہ ماں قبلہ و کعبہ نفیں صاحب آئے ہوئے ہیں۔ میں نے دبے لفظوں میں کہا کہ سید صاحب یہ مذہب کا جو بھجیں ہے۔ بات کاٹ کے بولے، نہیں بجائی، یہ مذہب نہیں کچھ ہے۔ میں نے جل کے کہا کہ سید صاحب، یہ تو لکھنؤ میں کا DECADENT VIRILE کچھ ہے۔ اس کا دھرتی کے کچھ سے کیا تعلق ہے۔ سید صاحب جھینپ گئے۔ مسکرا کے بولے کہ کامریڈ آج تم انحریزی میں بہت روائی ہوئی۔

”پار کامریڈ، اس کر، لقریب بہت لمبی ہو گئی“ آخوندزادے بیزار ہو کر کہا۔
”انقلاب کی رام کہانی بہت ہو گئی۔ اب کوئی اور بات ہونی چاہیئے“ فاروق نے تائیدی لہجہ میں کہا۔

مگر کامریڈ تو خود ہی چپ ہو گیا تھا۔ ایک دم سے چپ اور پھر جیسے گھرے خیال میں ڈوب گیا ہو۔ پھر لمبا ٹھنڈا سانس بھرا۔ پارٹی میں بس ایک نگ تھا۔ دادا منصور۔ کیا نرآدمی تھا۔ لیسن بھی اس کا لوہا مانتا تھا۔

”لیسن؟“ ہم سب چونکے اور مختوظ ہوئے۔

”ہاں لیسن۔ دادا کی لیسن سے ملاقات ہوتی تھی۔ پھر بعد میں لیسن نے دادا کو خط بھی لکھا تھا۔ ان سالوں میں سے کے لیسن نے گھاس ڈالی تھی۔ یہ اس کے سامنے جاتے تو ان کی تو گھنگھی بندھ جاتی اور لیسن بھی انہیں ٹھٹھے مار کے نکال دیتا کہ دفعہ ہو جاؤ، دلو کے بھو۔ تم لاو گے انقلاب یا تم نے دادا کو دیکھا تھا؟“

”میں نے دیکھا تھا“، ممتاز نے کہا ”خل خل اچکن، میں اور پرے سے نیچے بکھلے ہوئے، ملا دلا پا تھا میر۔ وہاڑھی بڑھی ہوئی“

"باکل ہٹھیک" کامریڈ نے تصدیق کی "باکل یہی حلیہ تھا۔ وہ تو فیر آدمی تھا ان میں سے کس نے ایسی درویشانہ زندگی گذاری ہے؟"

"یاد وہ زمانہ ہی ایسا تھا۔ ممتاز کہنے لگا۔ لوگوں میں ابھی درویشی باقی تھی۔ ایک دفعہ کی سنو، رات کے کوئی تین بچے ہوں گے۔ میں میرڈ سے کیسرے دیکھ کر اپنی سائیکل پر گھر جا رہا تھا۔ لوہاری دروازے کی طرف سے گزرا۔ یہاں سے دہل تک اندھیرا۔ فٹ پاٹھ پر ایک چائے والا بیٹھا تھا۔ اس کے ارد گرد تانجے والے میٹھے پالوں میں چائے پی رہے تھے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بچے میں ناصر کا ظمیں بیٹھا ہے اور دوال ہے۔ یہ سحران کہ یاد ابھی تو یہ بندہ میرڈ میں ایجاد کا کیسرے دیکھ رہا تھا۔ بھی مجھ سے پہلے یہاں پہنچ گیا۔ کیا اور کر آیا ہے؟"

"ایجادلا۔ واہ سیحان اللہ" فاروق بیساخرہ بولا۔

"ولیں اس کے جانے کے ساتھ یہ شہرویران ہو گیا"

کامریڈ نے جھر جھری لی "کامریڈ ہعورت اس شہر میں لیں ایک بھتی۔ تم سالوں نے دادا کو نہیں دیکھا۔ اسے کہاں دیکھا ہو گا؟"

"کون بھتی ہے؟" فاروق نے پوچھا۔

کامریڈ نے کالوں کے قریب منہ کر کے اس کا نام لیا۔ فاروق نے فوراً تزوید کی کی "نہیں یاد۔ آج کل تو میں روز اُسے دیکھتا ہوں"

"اب اسے کیا دیکھنا ہے۔ ان دنوں دیکھا ہوتا۔ میں یوں تو انہیں کے جلسوں میں جاتا نہیں تھا۔ سالوں کو انقلاب کے لئے جو ورک کرنا چاہیے تھا وہ تو کرتے نہیں تھے۔ ادب پر بے فضول بحثیں کرتے رہتے تھے۔ لیں اسے دیکھنے کے لئے میں ادھر جانکھتا تھا۔

"یاد ہم میں سے کسی نے قائدِ اعظم کو سمجھی دیکھا تھا؟" ممتاز نے چانک سوال

اُٹھایا۔ "اخلاق، تم نے تو دیکھا ہو گا؟"

"نہیں یار۔ میں نے تو ہوش سنبھالنے کے ساتھ فیلڈ مارشل ایوب خال ہی کو دیکھا۔ پھر بھی خال کو دیکھا۔ پھر۔"

"مگر داومنسور کو نہیں دیکھا ہے" کامریڈ نے بات کاٹتے ہوئے سوال کیا۔
"لہنہیں؟"

"کامریڈ، تم نے دادا کو دیکھ لیا ہوتا تو آج تم اتنے بے فضول قسم کے رجعت پند نہ ہوتے"

"یار وہ زمانہ اچھا تھا" ایک مرتبہ پھر اس زمانے کو ممتاز نے ایک ٹوٹل جیانی گفتگو کے ساتھ یاد کیا۔

"لبس جب تک دادا زندہ رہے۔ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی ہمارا تو پچھا بیٹھ گیا۔ سالانہ بھی بدل گیا"

"کامریڈ، اب کون ساز ماں جا رہا ہے؟"
"یار یہ پوچھو کر کون ساز ماں آنے والا ہے"
"مال تباو"

"بھم جبل بھوسا"

"اور کامریڈ، تمہارا القلب؟"

"القلب کون لائے گا؟" فاروق نے طنز ریکھا۔ سالے تمہارے کامریڈوں نے تو سو شلزم کو زیج کھایا۔

"کامریڈ تم مت بولو"

"کیوں نہ بولو؟" فاروق نے تھوڑی برسی سے کہا۔

"اس لئے کہ تم اسلام کو زیج رہے ہو"

فاروق فوراً ہی گرم ہو گیا۔

”کامریڈ اس میں گرم ہونے کی بات ہے“ کامریڈ نے فوراً ہی نکھل گایا لیکن

تو اپنا اپنا کار دبایا ہے۔

دونوں میں گرمی سردی ہونے لگی تھی۔ میں نے اور ممتاز نے تو تمہیوں کی تباہی میں جا کر دلوں چپ ہوئے ورنہ اس شام کا مزہ بالکل ہی کر کر اہوجاتا۔ مزہ کر کر ایوں بھی ہوا۔ اس کے بعد فاروق جتنی دیر بیٹھا اکھڑا اکھڑا رہا۔ جوبات کی تکنی کے لیے ہی میں کی۔ آخراً اُنھوں کھڑا ہوا۔

”کیوں جا رہے ہو؟“

مدھاں یا رہا اس وقت میں موڑ میں نہیں ہوں۔“

میں نے بہت احتیاج کیا۔“ یار اتنے دلوں بعد تو، ہم اکٹھے ہوئے ہیں۔ اتنی جلدی اکھڑنے کی نہیں بھثبری تھی۔ میں تو ایک بھروسہ رنجکے کی نیت سے آیا تھا۔ ”تم رنجکا کرو۔ کون روک رہا ہے۔ مگر میری طبیعت رنجکے کے لئے حاضر نہیں ہے۔“

اس کے بعد ہم تینوں نے اس بات کو یکسر نظر انداز کر کے ادھر ادھر کی بہت سی باتیں کیں۔

کامریڈ چاٹے کی فرمائش سے شروع ہوا تھا۔ دھیر سے دھیر سے کر کے وہ ممتاز کو ڈنر تک لے آیا۔ ”کامریڈ، اب تو کافی کا وقت ہو رہا ہے۔ کچھ کھایا پیا جائے۔“ ”کھائے یار جو کھانا ہو۔“

”یوں نہیں پورا ڈنر ہو گا۔“

ممتاز نے کامریڈ کی یہ تجویز بھی مان لی مگر بھر بھی سمجھا جس طرح جب تک چاہئے۔ جم نہیں سکی۔ گئے دن والیں نہیں آیا کرتے اور جو سمجھا ایک مرتبہ اکھڑ جائے وہ دوبارہ

نہیں جا کرتی۔ ہم کھانا کھانے کے بعد ہوٹل سے نکلنے کے باہر کی تازہ ہوا اور رات کی ٹھنڈگی کے اثر سے طبیعت روایت ہو گی۔ یہ ہمارا آنے مودہ نسخہ تھا۔ ان دنوں یہی ہوتا تھا۔ کافی اور چائے پی پی کر جب ہم حال سے بے حال ہو جاتے اور ادھر کافی ہاؤس عجیب بند ہونے لگتا تو ہم نکل کھڑے ہوتے۔ بے طے کئے کہ کہ صریحانہ ہے اور کہاں جا کر دیکھنا ہے۔ اپنی ہر میں کبھی اس راہ کبھی اس راہ۔ کبھی لمبے فٹ پاتھ پر اہل گھے، کبھی بیچ سڑک پر خرماں خراماں رات بھیگنے کے ساتھ رٹلیک یوں ہی پھردا رہتا چلا جاتا، رفتہ رفتہ نہ ہونے کے برابر رہ جاتا۔ دکانیں یہاں سے وہاں تک بند۔ منور کھمبوں تے جنگ جنگ کرتی خالی خاموش سڑک۔ فٹ پاتھ پر کچھ اندر ہرا کچھ اجala۔ ذرا موڑ مڑے تو منور کھبے غائب۔ جیسے شہربے چرائی میں چل رہے ہیں۔ کسی متغیر دکان کے آگے سڑک کے کنارے کوئی پان سگریٹ والا اپنی مٹھاتی دھوئیں سے رچی لا لیٹن کی روشنی میں اونچتا جاگتا کسی شب بیدار گاہک کا منتظر۔ آگے تھوڑا اندر ہیرا۔ پھر موڑ آتے ہی روشنی کا ایک جزیرہ کہ بازاں یہاں جاگتا ہے۔ گویا دن نکلا ہوا ہے۔ کوئی پان سگریٹ کو کا کو لا کی رنگ برلنگی دکان کوئی تکے کباب کا ہوٹل، کوئی چلتے خا دھوئیں سے اور چائے کے دھیوں سے بھرا ہوا، فلمی ریکارڈوں کے شودے سے گونجتا ہوا آگے چار قدم جل کر پھر اندر ہیرے کا دور دورہ۔ خاموشی کا دیکھا۔ خالص رات کا ظہورہ

”یار میں چلا“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ میں نے ممتاز کو تعجب سے دیکھا۔

ممتاز نے کلائی پر لگی گھری کو دیکھا۔ بولا۔ ”یار بات یہ ہے کہ اس وقت ایک اور سیز کال آنی ہے۔ مجھے جلدی گھر پہنچا چاہئے۔“

”سالے تم تو پکے بزرگ میں ہو گئے۔“

”بعانی زندگی میں سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔“

اور مزید بحث میں آجھے بغیر ممتاز تیزی سے ہوٹل کی طرف چلا۔ کار میں بیٹھا اور تیزی سے ہمارے قریب سے موڑنکال کرنے لگا۔ ہمارا آزمودہ نسخہ اپنی تائیر کھو بیٹھا تھا۔ معلوم ہوا کہ رات کا جادو ان راتوں تک تھا۔ دنوں کی طرح راتوں کی رنگت بھی تواب بدل لگی تھی۔ ابھی تک رٹنک کی اتنی بی ریل پیل تھی۔ اتنا بھی بے سینکم شو روکشاوں کا سکوڑوں کا، بجادی بھر کم روکوں کا۔ اس شور نے کوک بھی اطمینان سے نہیں پہنچنے دیا۔ اس پر دکان میں دسکو کے کیست کا شو مستزد۔

”ہاں یار، اب چلتا ہی چاہئے“ بھر منہ ہی منہ میں بڑا بڑا فردیا۔ سمجھتا ہے کہ کسی کو کچھ پتا ہی نہیں ہے“
”کے کہہ رہے ہو؟“

”فاروق کو اور کے“ اور بھر منہ ہی منہ میں کچھ بڑا نہ لگا۔

”شکر ہے تمہیں گھروالیں آنا یاد تو آیا“

”زیادہ ایسی زیادہ رات تو نہیں ہوتی۔ مگر اتنے دنوں بعد چار دوست اکٹھے ہوتے تھے۔ بہت جلدی بھی واپس نہیں آیا جا سکتا تھا“

”ہاں تم تو وہاں دوستوں کے ساتھ بے فکر بیٹھے ہو گے۔ یہاں میرے دل میں ہو لیں اٹھ رہی تھیں“

”ہو لیں اٹھ رہی تھیں؟ — وہ کیوں؟ — شہر کے حالات ابھی ابتنے تو خراب نہیں ہوئے ہیں؟“

بوچان کے نماز کی چوکی پر بیٹھی تسبیح پھیر رہی تھیں تسبیح اور دعا سے اک عجلت کے ساتھ

فارغ ہو کر آئیں اور جلدی سے زبیدہ کو ٹوکا "بس بھی کرو دہن۔ پھر وہی ذکر نہیں۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ اللہ بُری گھری سے بچائے رکھے اور دہن سے تو میں نے کتنی مرتبہ کہا کہ دہن جب دونوں وقت مل رہے ہوں تو انگنانی میں کھلے سرست پھر اکردا اور آج تو ویسے بھی تجارت تھی۔ بھلا بچپواری سے والی دیوار کی طرف جانے اور اس طرف جانکنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"کیوں، کیا بات ہوتی؟" میں نے چکرا کر بوجان کو اور پھر زبیدہ کو دیکھا۔
"پچھے نہیں ہوا۔ میں تو کہتی ہوں کہ یہ سب دہن کا وہم ہے۔"
"بوجان، آپ اسے وہم کہہ رہی ہیں۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔"
میں حیران تھا کیا دیکھا ہے آنکھوں سے یہ
بیکم کچھ کہنے لگی تھی کہ بوجان نے زیغ میں بات کافی۔ اے دفع کرو دہن۔ رات زیادہ ہو رہی ہے۔ جاؤ آرام کرو۔ جو بات کرنی ہے صبح کو کرنا۔
بوجان نے ہمیں ہمارے کمرے میں دھیکلا۔ خود جانماز کی چوکی پر جا کر جانماز لیٹھئے لگیں۔

بستر میں آرام سے لیٹھئے کے بعد میرے پوچھنے پر زبیدہ نے رکتے رکتے دڑی کی آواز میں اپنی واردات سنائی۔ میں نے بچپواری سے والی دیوار کے ادھر جو جانکا تو نظر وہاں جا پڑی جہاں پھانسیاں پڑی تھیں۔ کیا دیکھتی ہوں کہ برابر برابر میں آدمی کھڑے ہیں۔ یہ لیے، بانس کے بانس۔ سفید کفنیاں پہنے ہوئے اور جیسے انہوں نے تار لیا ہو کہ میں ان کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ میرا دم ہی تو نکل گیا۔ بجاگی صبح مارکے بوجان پھر اکے باہر نکل آئیں۔ کیا ہوا دہن۔ میرا دم ہی تو نکل گئی۔ بوجان نے قرآن کی ہزادی۔ آیتہ الکرسی پڑھ کے دم کیا؛ تب کہیں مجھے ہوش آیا۔ نہیں تو میں حکیٰ تھی۔"

اس کے بعد زبیدہ چپ جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔

ایک وقٹ کے بعد میں نے پوچھا "بس؟"

"ماں بس؟"

"مگر ایک بات تو بوجان نے صحیح کی۔ آخر اب ادھر جا جا کر جانکرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب وہاں کونا تماشا ہو رہا ہے؟"

"میں کہاں ادھر جا جا کے جانکرتی ہوں۔ مجھے تو ادھر جانے کا کبھی خیال بھی نہیں آتا۔ مگر پتہ نہیں آج شام کو مجھے ہوا کیا۔ بس ایسا لگا جیسے کوئی مجھے کہنے کے ادھر لئے جادہ ہے۔"

اسی گستاخی باہر سے تالی کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر لنظر دالی۔ بوجان پیغ صحمن میں کھڑی کچھ پڑھنے پھونکنے کے ساتھ تالی بجا رہی تھیں۔ باری باری چاروں سمتوں میں منہ کر کے پہلے کچھ پڑھا، پھر پھونک ماری، پھر تالی بجا لی۔ پھروارٹے والی دیوار کی طرف رُخ کر کے زیادہ زور سے پھونکا، زیادہ زور سے زیادہ دیر تک تالی بجا لی۔

"جائے رہو" — دور سے آتی جیل کے پہریدار کی آواز سے مجھے احساس ہوا کہ رات بہت گزر گئی ہے۔ زبیدہ بے خبر سوندھی تھی، لیکن ہلکے خراٹوں کے ساتھ۔ یوں ہی مجھے خیال آیا کہ وہم زبیدہ کو ہوا تھا اور جاگ میں رہا ہوں۔ اسی آن پر اب کرے سے بوجان کی پریشان آواز سنائی دی۔ "ارے امرے یہ کیا کر رہے ہو؟" میں پیک کر ان کے کرے میں گیا۔ دیکھا کہ سوتے سے اُنہوں کرنیجھی ہوئی ہیں۔ ارے کیا کر رہے ہو؟"

”بوجان کیا بات ہے؟“ میں نے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔

بوجان نے بھی پہنچنے سے مجھے دیکھا۔ ایک دم سے چپ ہو گئیں۔ مجھے دیکھتی رہیں۔ پھر لیت گئیں ”کچھ نہیں“

”بوجان؟“

”نہیں، کچھ نہیں“ اور فوراً ہی سو گئیں۔ فوراً ہی خرکٹے بھی لیئے لگیں۔

واپس اپنے کمرے میں آیا۔ دشمنی بھیجاتے بھیجاتے زبیدہ پر ایک نظر ڈالی۔ اسی طرح بے خبر سو رہی تھی۔ لیٹ گیا۔ کروٹیں بدلتے لگا۔ یوں ہی خیال آیا کہ اس وقت کیا بجا ہو گا، کتنی رات گندگتی، کتنی رات باقی ہے۔ مگر پتہ کیسے چلتا۔ اس وقت قریب میں گھر دی بھی نہیں تھی۔ دور کی آوازوں پر کان لگائے کران سے رات کے اوقات کاشا پر کچھ اندازہ ہو جاتے۔ مگر اس وقت کوئی آواز ہی نہیں تھی، پھر پیدار کی آواز بھی نہیں۔

لبس ایک سناٹا۔ مگر پھر اپن لگا کہ جیسے دور بہت دور بہت سے لوگ غل مچا رہے ہوں۔ جیسے شہر کی ساری خلقت گھروں سے نکل کر باہر گئیوں بازاروں میں امند رہی ہو۔ کیا واقعی شہر میں کوئی بلوہ یوگیا ہے۔ کیا واقعی ہے مگر جب دوبارہ کان دور کی آوازوں پر لگائے تو کوئی آواز نہیں تھی۔ پھر ایک سناٹا اور بس۔ میں دم سادھے پڑا۔ پڑا رہا اسی طور دم سادھے۔ کتنی دیر بعد اچانک کہیں دور سے مرغے کی بانگ سنائی دی۔ یہ بانگ سن کر کس طرح جان میں جان آئی۔ ایک اطمینان سا ہوا کہ اب تو صبح ہو رہی ہے۔

پھر حیران ہوا کہ اچھا صبح ہونے لگی ہے جیسے یہ خلافِ توقع واقعہ ہوا اور اس کے ساتھ رہی کہیں قریب کی سڑک پر تانگوں کے چلنے کی آواز سنائی دی اور اس آواز میں ملی جلی کسی موڑ کے ہارن کی آواز۔ کہیں بہت دور سے رکشا کے تیز دوڑنے کی آواز پھر تو آوازوں کا ایک ریلاسا آگیا۔ موڑوں کے ہارن، تیز دوڑتی رکشاوں کا شورہ تانگوں، ریڑھوں کے پستوں کی گڑگڑا ہے۔ واقعی یہ تو صبح ہو رہی ہے اور اچانک

چڑیوں کا ایک سینھا میمھا شور اُٹھا۔ شاید ہمارے گھر کے آس پاس کے درختوں میں بسرا کرنے والی سب چڑیاں ایک دم سے جاگ اُٹھی تھیں۔

اُٹھ کر ستر میں بیٹھ گیا۔ کمرے میں باہر سے بہت بُلکا اجلا اچن کر کر ہاتھا زبیدہ پر ایک نظر ڈالی کہ اسی شان سے بے خبر سورہ ہی تھی۔ اسی طرح بُلکے ہٹکے خراش۔ پھر مجھے خیال آیا کہ عجائب بات ہے۔ وہم زبیدہ کو ہوا تھا، رات آنکھوں میں میری کٹ گئی۔ جماہی لی اور لیٹ گیا۔ میری آنکھوں میں نیند پھونلنے لگی تھی۔

جب میں نے ڈیورھی سے قدم انکالا تو شہر بدل چکا تھا۔ میں نے دیکھا اور میں حیران ہوا کہ دہشت نے ڈیپا تو میرے گھر میں کیا تھا، یہ شہر کو کیا ہو گیا۔ شہر کسی کبھی آنا فانا بھی بدلتے ہیں، اس زندگ سے کہ کہنے کو کچھ بھی نہیں بدلتا اگر سب کچھ بدل جاتا ہے۔ اور میں ایک ہی لمحت میں دو دفعہ حیران ہوا۔ میں نے ڈیورھی سے دھڑکتے مل کے سانققدم اباہر کھا۔ مل کو ایک دھڑکا کہ ہوانٹا کہ جانے باہر کی نقشہ ہو۔ شاید سب کچھ تپٹ ہو چکا ہو۔ میں نے ار گرد نظر ڈالی اور حیران ہوا کہ سب کچھ اسی طرح تھا۔ زندگی کا کاروبار معمول کے مطابق جاری تھا۔ ما بوئی ہونی کریں قلم سارے ہی اندریستے باطل ہو گئے۔ اطمینان ہوا کہ سو بھی اچھا ہوا کہ کچھ نہیں ہوا۔ رفتہ رفتہ میں نے دیکھا اور حیران ہوا کہ یہ تو سب کچھ بدل گیا ہے۔ اور میں حیران ہوا کہ اچھا شہر یوں بھی بدلا کرتے ہیں کہ انکی آن میں سب کچھ بدل جائے اور یوں کچھ بھی نہ بدلتے۔ میں نے ایک بار پھر ار گرد نظر ڈالی جیرت سے اور دہشت سے۔ یہ تو وہ شہر ہی نہیں ہے جو ہوا کرتا تھا۔

زندگی کا کاروبار معمول کے مطابق چل رہا تھا۔ بسیں، منی بسیں، ہوڑ، سکوڑ، رکش، تانگے، ریڑھے، سب سواریاں اپنی اپنی چال چل رہی تھیں۔ سوار اپنی راہ پیدا سے اپنی راہ۔ پھر بھی مجھے ایک نیک ہوا کہ کہیں چال میں کچھ فرق آگیا ہے۔ یا شاید فضا میں کچھ ہے۔ شاید ایک تناد کرنے چہرے صاف تھے، ہوئے نظر آ رہے تھے۔

میں ڈر گیا۔ دل میں کہا کہ شہر غصے میں ہے۔ پتہ نہیں کب اُپ پڑے۔ ڈر سے ہوئے دل کے ساتھ میں نے ایک ایک چہرے کو غدر سے دیکھا اور آس پاس چلنے والوں کی چال کو۔ میں رنجیدہ ہوا۔ دل میں کہا کہ شہر کرب میں ہے مگر گھٹری نہ گز ری تھی کہ میں نے چہروں پر خوف کی ایک لکیر دیکھی۔ میں افسردہ ہو گیا دل میں کہا کہ شہر اصل میں دہل گیا ہے۔ اپنے آپ کو ظاہر نہیں کر رہا ہے۔ اندر سے ہل گیا ہے۔

ایک ضمیمہ والا سائکل تیزی سے دوڑتا ہوا آیا صدائگاتا ہوا۔ مجھ سے چار تہ مسٹر کے جا کر رک گیا۔ کتنے لوگ تیزی سے پس کی طرف لپکے۔ اس ضمیمہ نے تو شہر کی کایا پٹ دی تھی اور صحیح سورپرے نکلنے والے سب اخباروں کو دم کے دم میں بے معنی بنا دیا تھا۔ میں نے بھی بڑھ کر ایک ضمیمہ خرید لیا۔ یہ ضمیمہ میں صحیح پڑھ چکا تھا مگر اس وقت رواردی میں پڑھا تھا۔ رات بھر کا جا گا ہوا تھا۔ صحیح کوڑا آئندگی تھی۔ زبیدہ نے آکر جھنچھوڑا:

”اخلاق انہو۔ دیکھو تو سی یہ ضمیمہ والا کیا چلدا رہا ہے؟“

اور میرے اٹھنے کا منتظر کیے بغیر دیکھی کی طرف لپکی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں الجی تک نیند بھری تھی۔ زبیدہ ایک ورق کے کرائی۔ سخت بوکھانی ہوتی تھی۔

”دیکھو تو سی یہ کیا لکھا ہے؟“

میں نے زبیدہ سے ضمیمہ لے کر پڑھا۔ آنکھوں سے ساری نیند ایک دم سے غائب ہو گئی۔ زبیدہ اس تو قع میں میرے باہل پاس آن بیٹھی تھی کہ میں کچھ کہوں گا، تبھرہ کر دل گا۔ میں خاموشی سے اٹھ کر با تھر دم چلا گیا۔ کلی کی، دانت ہانجھے، غرارے کیے، نہایاد ہو یا۔ با تھر دم میں آج کچھ زیادہ ہی وقت صرف ہوا۔ نہاد ہو کر نکلا تو ناشستہ کی میز پر جا بیٹھا۔ ناشستہ کرتا رہا۔ زبیدہ میرے سلمنے بیٹھی تھی۔ اس وقت کتنا بول رہی تھی۔ مجھے چپ دیکھ کر اسے بھی چپ گئی۔ ماں جب میں چلنے لگا تو آہستہ سے ایک ہدایت کی:

”دفتر میں کسی سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور دفتر سے سیدھے

گھر آنا۔

بوجان جودی سے تیس پڑھنے میں مصروف تھیں اٹھ کر قریب آئیں۔ سر پر ہاتھ کو
کر کرچھ پڑھا، بچوں کا:

”جاو۔ اُند کی امان میں دیا۔ گھر جلدی آ جانا۔ اور دلھن بھیک کہہ رہی ہے کسی سے
کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

میں خود ہی کسی سے بات کرنے کی ضرورت خسوس نہیں کر رہا تھا۔ گھر میں کسی سے
کوئی بات نہیں کی تو باہر آگز کرتا۔ اور دفتر میں تو فضائی تھی کہ ججھے اور چپ لگ گئی۔
فتر میں کس دن دفتر والی فضا ہی نہیں تھی۔ کسی میز پر فال کھلا ہوا نہیں تھا مایسا۔ بھی
نہیں تھا کہ چال میں چل رہی ہو اور گپ شپ ہو رہی ہو۔ جو بھی تھا اکھڑا اکھڑا سبھا تھا۔
کسی نے منہ سے سگر بیٹ لگائی بولی ہے اور بس منہ سے دھوکا اڑلئے جا رہے ہے۔ بھی
بڑے انہاک سے ضمیر پر نظر میں گاٹے ہوئے۔ کوئی کوئی قریب کی پیٹ دالے کے
ساتھ سر گوشی میں باشیں کرتا ہوا۔ ایک میز کے قریب انہاٹ کی ایک لمبی چھوٹی۔ کسی نے
بلند آواز میں کہا:

”خس کم جہاں پاک۔“

کتنی غصیل نظر میں اس طرف اٹھ گئیں دقتہ۔ کوئی غصیل آواز میں دانت پکھاتے ہیئے
بڑھ لیا: ”حرامزادے۔ خاموشی۔ فضا میں اچاہک ایک تباہاگی تھا۔
میں سوچ رہا تھا کہ تھوڑا دفتری کام بٹا دیا جائے مگر اس کی شدھ ففلا سے میں اکھڑ گیا۔
بس فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

”رجحت۔ اگر ماں کی طرف سے بلادا آجائے تو کہہ دینا کہ ان کی طبیعت خراب ہو
گئی۔ گھر چلے گئے ہیں۔“

”اچھا صاب۔“ بھر قریب اکر آہنہ سے بہت براہما صاب۔

ہاں۔ میں نے بے تعلقی سے کہا اور دفتر سے نکل بیا۔

دفتر سے نکل تو آپا بیکن مسجد میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جانا چاہیے۔ تم گھر کی طرف اٹھنے کے لیے باکل تیار نہیں تھے۔ بس یوں ہی چلنے لگا۔ اس وقت سڑکوں کا عجائب نقشہ تھا۔ لوگ غائب، پر چھائیاں چل رہی تھیں۔ براہم سے کئی رکشا میں گزریں، خالی، اپنی برق رفتاری سے محروم۔ دیر بعد ایک بس گذری گمراہی پر نہ مام سوار یوں کے ساتھ۔ کتنی بھی ہلکی نظر آ رہی تھی۔ میں کہاں جا رہا ہوں؟ میں نے چلتے چلتے سوچا اور ممتاز کے دفتر کی طرف ہو بیا۔

اد۔ ممتاز نے کتنے بچھے لمحے میں میرا خیرت مکیا۔ مگر یہ کسی ذہنی میری طرف خاموش سے بڑھا دی۔ اسی خاموشی سے میں نے مگر بیٹھ گئی اور لمبے لمبے کش لیے۔

باہر کیا حال ہے؟ دیر بعد اس نے بڑھ رہا ایک سادگی سے پوچھا۔

حال میں گزر بڑا گیا۔ یاد کچھ مسجد میں نہیں آیا۔ پچھلے دنوں کی تباش و رہا ہے کہ پتہ نہیں کیا ہو چکے گا اور آج اتنی خاموشی۔

دو شور جھوٹا تھا۔ یہ خاموشی سمجھی ہے۔

لوگوں کا اس طرح چُپ ہو جانا.....

اور میں نے دیکھا کہ ممتاز میری طرف پوری طرح متوجہ ہے جیسے وہ بچھے کچھ سنا چاہتا ہے لیکن میرے لیے تو یہ ایک فقرہ پورا کرنا ہی دو بھر ہو گیا تھا۔

یاد رات اپنی صحبت اچھی رہی کتنے دنوں بعد تم اکٹھے ہوئے ہیں؟

میں نے اپنیان کا سانس لیا کہ دوسرا ذکر نکلا:

مگر یار تم لوگ جلدی اکٹھ گئے۔ میں تو رنجکے کی ہوچ کر آیا تھا۔

”رنجکا۔ ممتاز تھوڑا افسوس ہو گیا۔“ ہاں یار۔ اپنے دہ رنجکے تو خواب دخیال ہو گئے۔

مگر خیر اکٹھے ہونے کی ایک تقریب تو پیدا ہوئی۔ بہت لطف آیا۔

ہاں۔ لطف تو آیا۔ بکہ کل بہت دلوں کے بعد مجھے رات خوبصورت نظر آئی۔ اور شہر بھی۔
تمارے چلنے کے بعد بھی میں اور کامریڈ کچھ دیر تک آوارہ پھرتے رہے۔ مجھتی رات
کے اندر سے اجلے میں شہر اچاگ رہا تھا۔ اگرچہ اب اس شہر میں اندر عیراک توارہ گی
ہے۔ ان سالی روشنیوں نے رات سے اس کا جادوجہ بین لیا ہے۔ پھر بھی

..... خیر... مگر یار جب صبح میں گھر سے نکلا تو شہر بدل چکا تھا:

”ہوں۔“ ممتاز سوچ میں پڑ گیا۔ شہر کا اس طرح اچانک بدل جائے۔ . . .
میں انتظار کرتا تھا کہ ممتاز آگے کچھ کئے گا۔ مگر وہ چپ ہو گیا تھا۔

”ہاں۔ اس طرح شہر کا اچانک بدل جانا۔ . . .“

پھر میں بھی چپ ہو گیا۔ گفتگو کے مطہر پر آکر تم دونوں پھر الجد گئے تھے۔
ایک دم سے کامریڈ داخل ہوا۔ مگر سے سے تھیلا اتا کہ میر پر پختہ ہوئے بولا:
”یار چلئے پواڑ۔“

ظور بھی کہ تھوڑا ایچھے رہ گیا تھا منہ سے گئے اپنے پائپ کے ساتھ داخل ہوا:
”نہور تم.... نہ کہا؟“

”یہیں۔ جہاں تم دیکھ رہے ہو۔“ ظور نے اپنی پرانی اس پکھوٹل بینیدگی کے ساتھ
جواب دیا۔

ممتاز نے بیل دے کر چپ راسی کر دیا:

”صادق۔ چالئے لاڈ۔ اور سناؤ باہر کیا حال ہے؟ یہ کہتے کہتے اس نگریٹ
کی ڈیا اور ماچس کامریڈ کی طرف کھسکا دی۔

”مت پوچھو۔“ کامریڈ نے سکریٹ سکلتے ہوئے دھنیلے لمبھ میں کہا: ”لوگ غصے
میں ہیں۔“

”غصے میں؟“ میں نے حیرت سے کامریڈ کو دیکھا۔ ”مجھے نوگتے ہے لوگ سہم گئے ہیں۔“

کامریڈ نے غصے سے مجھے دیکھا: "تم سے سدا کے بورڈا ٹریننگر دموں میں بیٹھ کر اس پلکھوٹ لفتگوگرنے دالے۔ تم لوگوں کو کتنا سمجھتے ہو؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ۔" خور نے زبان کھونے کے ساتھ ہی پائپ کو کریڈ کر سدگانے کا عمل شروع کر دیا۔ اور میں اور ممتاز دونوں کامریڈ کو نظر انداز کر کے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پائپ کا ایک گھونٹ لینے کے بعد چھبیس رجہ میں بولا: "آج کی کیفیت دیکھ کر اخذ حق کو جو معاملہ ہوا ہے وہ کل نیک ڈر ہو جائے گا۔"

"کل ہے؟" ممتاز نے تعجب سے خور کو دیکھا۔

"ہاں۔ کل ہے۔" اور ایک سینیر ان شان کے ساتھ اعلان کیا: "یہ تاریخی وقت ہے۔

ہم انقلاب کی دلیل پر کھڑے ہیں۔"

استنسنے میں فاروق آن پنکا۔ روایتی علیک ملیک۔ اور فوراً ہی شروع ہو گیا:

بیار عمران خان نے توکال کر دیا۔"

کتنی دیتک بھلے چلا گیا اور پس پر جوان دونوں جاری تھا بھر پور تصور کر ڈالا۔ پاکستانی یہم کی کارکردگی پر وہ کتنا مسرور تھا۔

"کامریڈ، تم کچھ نہیں بول رہے ہے۔" ممتاز نے کامریڈ کو تھوڑا چھپرا۔

"آج فاروق کا دن ہے۔" کامریڈ کے الجہیں کتنا غصہ تھا۔

فاروق نے ایک قلمہ لگایا: "کامریڈ کیا بولے گا۔ یہ اس کامیڈ ان نہیں ہے۔" اور

وہ چھپ کر کٹ پر رواں ہو گیا۔

"چلو کامریڈ چلیں۔" کامریڈ نے خور کو ٹھوکا دیا اور کھڑا ہو گیا۔ ان دونوں کو جانتے دیکھ

کر میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم بھی جا رہے ہو؟"

"میں بھی۔" فاروق کی بیٹے نکان لفڑی سے بور تو میں بھی ہو گیا تھا۔

ہاہر نکل کر کامریڈ اب پڑا: "حرام کا پیسہ آگیا ہے۔ دونوں سالوں کی آنکھوں پر چبی
چڑھ گئی ہے۔ ضمیر زیع کھایا ہے۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوا: "کامریڈ، تم بیان کیا لیئے آئے
تھے؟"

"تم بھی تو آئے تھے۔ تم کیا لیئے آئے تھے؟"

"میں تو انہوں کا پیٹھا ہوں۔" کامریڈ نے غصے سے کہا۔

"یہ تو کوئی انکشاف نہیں ہے۔"

کامریڈ میرے اس فقرے کو پی گیا۔ ہپراس نے دوسری ہی بات کی: "کوئی بات نہیں
ان سب سالوں سے حساب لیا جائے گا۔ کسی مالے کی گرفت پر سرحدات نہیں رہے گا۔
مستقبل ہمارا ہے۔"

"یعنی مستقبل کے غالم نہم ہو۔"

کامریڈ نے مجھے لال پیلی نظر دی سے دیکھا: "کامریڈ، کبھی کبھی مجھے تم پہ بھی شبہ
ہوتا ہے کہ سالے تم بھی کہیں پک تو نہیں گئے ہو؟"

"یار کامریڈ، تمہیں تو اپنے سوا ہر آدمی پہ کا ہوا نظر آتا ہے۔"

"ہاں۔ میں صرف اپنے بارے میں جانتا ہوں۔ باقی کسی کے بارے میں اٹھناں سے
کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ دہ دقت ہے کہ آدمی اپنے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔"

"اپنے سوا۔" اولاب میں بھی کسی قدر سمجھدگی سے کامریڈ سے مخاطب ہوا: "اپنی ذات
کے بارے میں اتنے ثائق سے صرف تم کامریڈ لوگ ہی بات کر سکتے ہو۔"

"اس لیے کہ۔ ظہور بخنا۔" ہم تم لوگوں کی طرح مرتضیانہ و اخوبت کی الحجنوں میں گرفتار
نہیں ہیں۔"

"بالکل صحیح۔" کامریڈ نے پھر زور لجہ میں تاثید کی۔ آج ان دونوں میں کتنا اتحاد نظر سارا
تھا۔ کامریڈ نے ظہور کے خلاف اپنے بارے شکوک کو دفعتاً معطل کر دیا تھا۔

ٹھوڑے نہ میری بنت کا جواب دیتے دیتے کامریڈ کی طرف رکھ کیا: "مگر کامریڈ۔ یہ مت بھولو کہ ایسے حالات میں آدمی کو کسی کبھی خود پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہ چکا ہے۔" کامریڈ ٹھوڑا منہ تکنے لگا۔ "بھنسنجل بھوسا۔" آہستہ سے کہا اور چپ ہو گیا۔

پھر ہم کتنی دیر تک چپ رہے۔ نہ بیٹھ پار ہے تھے نہ بات کہ پار ہے نہ۔ پہلے کتنی کتنی دیر تک بیٹھتے تھے اور باقی میں کرتے تھے۔ لیں جہاں جس ریستوران میں جا کر بینجھ گئے سو بیٹھ گئے۔ شخصوں کے حساب سے بیٹھتے تھے۔ اور چل کھڑے ہوئے تو بس پڑے جا رہے ہیں۔ نہ پاؤں رکھتے تھے نہ زبان رکھتی تھی۔ اور اب جب میں اس نانے کو یاد کرتا تھاں طرح تو جیکر یہاں کلسا زمانے میں آج کا ساثور اور ہنگامہ نہیں تھا۔ نہ ایسی گنور دل تھی کہ آدمی پر آدمی گراپٹہ تا ہے نہ اتنا ٹرینک ہڈتا تھا کہ سواری سے سواری بھڑی نظر آئی ہے۔ مال کتنی خاموشی مشرک ہوا کرتی تھی۔ صحیح معنوں میں ٹھنڈی مشرک۔ مگر آج بھی توال خاموش تھی۔ پھر ہم سے بات کیوں نہیں ہو پار ہی تھی۔ اور تب مجھے یہ احساس ہوا کہ خاموشی اور خاموشی میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اس خاموشی نے تو ہمارے دل و دماغ کے سکون سے جنم لیا تھا۔ اور یہ خاموشی، مگر خیر۔ ویسے شہر بھی کبھی کبھی کس طرح اچانک سے بدل جاتے ہیں کہ یہ کہ کچھ بھی نہیں بدلتا مگر سب کچھ بدل جاتا ہے۔

"یار۔ آج تو شاہی سے اُو بولنے لگا۔" ٹھوڑے چلتے چلتے کہا۔

"ابھی تو اُو بولے گا۔" کامریڈ کاغذیلا الجہابی تک برد برد برقرار تھا۔

تب مجھے احساس ہوا کہ واقعی یہ تو شاہ بگئی ہے۔ شاہ سے بات۔ جو تھوڑا بہت ٹرینک تھا وہ بھی رفتہ رفتہ معدوم ہو گیا۔ لیں کوئی کوئی کار بغیر لہرنا دیے بغیر شور کیے تیزی سے گزری چلی جاتی۔ وقفہ و قفسہ کے بعد کوئی سکوٹر، کوئی خالی سکشا۔ فٹ پانچھپہ چلتا ہوا ایکاڑ کا آدمی۔ آہستہ آہستہ یہ سلسہ بھی ختم ہوتا نظر کرنے لگا۔

"مال آج اتنی جلدی خاموش ہو گئی۔" جیسے میں نے اپنے آپ سے کہا ہو، آہستہ سے

اپنے ہی کان میں۔ اور کامریڈ نے اتنے ہی زور سے اور غصے سے کہا، خبردار کرنے کے لمحہ میں،
کامریڈ، اس خاموشی سے ڈر د۔

ہم پلے ہی اکھڑے ہوتے تھے۔ کامریڈ کی اکھڑی اکھڑی باتیں نے اور اکھڑ دیا۔
کامریڈ میں چلتا ہوں۔ ظور نے ایک بیزاری سے اعلان کیا اور ایک دم سے بغیر
عیک سیک کیے اپنی راہ ہولیا۔

”دتے کے بچے۔“ کامریڈ منہ ہی منہ میں سخت غصے کے عالم میں بڑ بڑ لئے گکا۔ یہ
سکے انقلاب لائیں گے۔

”کامریڈ، تمہارااظہار تو گیا۔ اب کیا الاد سے ہیں؟“

”تم بھی جانا چاہتے ہو۔“ کامریڈ نے غصیل نظر وہ سے مجھے دیکھا۔

”پھر کیا کریں یار۔ بورپت ہونے لگی۔“

میرے لمحے کی بیزاری کو کامریڈ نے محسوس کیا اور فوراً ہی ہاتھ ملا یا:

”اچھا سلام علیکم۔“

”اور تم؟“

”میرا سترہ تمہارے راستے سے الگ ہے؟ اور فوراً ہی وہ بھروسے منہ ہوڑ کر دوڑی
مرٹک پہنچا ہے۔“

ایک خال رکشا کتنی دیر سخالی خاموشی مرٹک پر بجکسم ہی تھی۔ اشارہ کرنے
کی دیر تھی۔ فوراً آن پہنچا۔ میں اس میں بیٹھ گھر کی طرف ہو یا۔

رکشا دالا پورے دستے خاموش رہا۔ مگر جب میں گھر کے دروازے پہ پہنچ مر
رکشا سے اتنا ادراستے پیے دینے لگا تو اچانک بولا:

”ایک بنت کھوں جی؟“

”کھو۔ کیا بات ہے؟“

قرب آگہ رازدارانہ الجہ میں بولا: "یہ سب ان لوگوں کا ڈریاہ ہے۔ وہ تو یاں پہ تھا ہی نہیں۔"

"کون یاں پہ نہیں تھا؟" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہے۔

"وہ جی؟"

"کون وہ؟"

"سمجھ جاؤ جی۔" پھر فراز قرب آگہ کرنے لگا: "میرے پوپا کا بھتیجا کل ہی سعودی عرب سے آیا ہے۔ داں پہ جی اس کی ٹیکری اسٹر کی دکان ہے۔ شہزادوں کے کپڑے دہی پیتا ہے جی۔ بتاوے تھا کہ میں شہزادے سے صاحب کے کپڑے لے کر محل میں گیا تو یہ دیکھوں جوں کہ دو ماں بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے۔ میں حیران ہوا کہ اچھا یاں پہ ہے۔ جو کہ پھر مرگوں شی میں بولا: "کسی کو بتا یوں مت۔"

پھر تیزی سے رکشہ سارٹ کی۔ یہ جاؤ دجا۔

سوتے سوتے آنکھ کھل گئی۔ لب آپ ہی آپ۔ اور ایسے جیسے پوری نیند لے چکا ہو۔ گھری دیکھی۔ لا بھی تو ہفت رات پڑی ہے۔ مگر مجھے جتنا سونا تھا سو چکا تھا۔ اٹھ کر میں بھی کچھ کرنا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی میرے ساتھ یہ ہوتا ہے۔ بیک رات میں آنکھ کھل جاتی ہے۔ احساس ہوتا ہے کہ پوری نیند لے چکے۔ پھر میں پنگ سے بندھا بستر سے چیکا نہیں رہ سکتا۔ اٹھ کھڑا ہوتا ہوں کہ کچھ کرنا چاہیے۔ تو میں تھوڑی دیر تک بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا کر کے چٹختی کھیل آہستہ سے باہر نکل گیا۔ پچھوار سے کی دیوار پر ٹھٹھا تا چڑائے اب بھجنے کو تھا۔ لب آخڑی دھوں پہ تھا سگر میں بیٹھا کر کے حیران ہوا کہ ابھی نہیں بھجنے بھولے ہے۔

زبیدہ کو ادالہ استہری میں یہ ڈر پڑا تھا کہ لبکا بے بجھا اور اب بجھا۔ میں دن سے یہی ہو رہتا۔ جس شاکر زبیدہ ڈری تھی اس کے دوسرا سے ہی دن جب میں نے شام پڑے گھر میں قد مر کا تو بجھا کہ بچپن اڑ سے والی دیوار پر ایک دیا ٹھارا م ہے۔

"بوجان، انہوں نے تو کہا تھا کہ چراغ بجھنا نہیں چلے ہے۔ یہ تو بجھا جا رہا ہے۔"

بوجان نے چراغ کو تسلیش بھری نظر دل سے دیکھا۔ پھر جیسے زبیدہ کی ٹھارس بندھا رہی ہوں، بولیں:

"نہیں دیں۔ اللہ چاہے تو نہیں بجھے گا۔ کے گاہی کہ بجھے لگا ہے۔ آخر شیاطین سے مقابلہ ہے کوئی کھلی تو نہیں ہے۔"

میں نے چکرا کر پوچھا: "یہ کیا سلسلہ ہے؟"

"بیٹے، آج مولوی غلام رسول آئے تھے۔"

"مولوی غلام رسول..... کس سلسلہ میں ہے؟"

"دہن کو دکم ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ انہیں بلکے کچھ پڑھا پھونکو ایجاد کرنے میں نے پڑھ پڑھ کر دیا ہے اور سات دن چراغ جلانے کو کہا ہے۔ ہے ایت کی ہے کہ بجھا نہیں چلے ہے۔"

"اوہ اگر بچھو گیا تو؟"

"میرے لال بدر شگنی کا کلمہ منز سے نہیں لکھنا چاہے۔ اللہ چاہے تو نہیں بجھے گا۔" چراغ تب سے اب تک ہوا سے لڑ رہا تھا اور لڑتا۔ مگر شاید تل ختم ہو گیا تھا کہ لاواتھی دھیمی ہو گئی تھی۔ چراغ سے گزر کر میری نظر جیل کی بُرجی پر گئی جہاں پر یہ ایک لاٹھ میں لائیں، ایک لاٹھ میں لٹھ لیے ساکت کھڑا تھا۔ مجھے یہ ساخت کرنے میں کہ کوئی کھڑا ہے دیر لگی۔ وہ تو لاٹھی پہنچتا رہتا تھا اور لاٹھیں ہلا کارہتا تھا۔ سا تھیں اور پھر پکار جائے گتے رہو۔" مگر اس وقت وہ بُٹ کی مثال کھڑا تھا۔ میں نے بہت غور سے دیکھا تب اندازہ ہوا کہ کتنے

کھڑا ہے۔ وہی مبارٹ نگاہی آدمی اپنی دار الحی اور والیں کے ساتھ آج اس کے اس طرح ساکت صامت کھڑے رہنے نے مجھے ڈرایا۔ فوراً ہی اس طرف سے نظریں ہٹالیں۔ ایسا لگا کہ وہ بہت قریب کھڑا ہے باکل ہماری دیوار کے برابر اور میری نعل و حرکت کو دیکھ رہا ہے۔ ایسے بن گیا جیسے میں نے اسے دیکھا، یہی نہیں ہے اور جیسے مجھے پہتہ ہی نہیں ہے کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ مگر اب میں وہاں زیادہ دیکھنا نہیں رہ سکتا تھا۔ داپس اپنے کمر سکھنے۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بوجان کے کمرے میں جانکا۔ بے سدھہ سوہنی تھیں۔ ایسی بے سدھہ کہ خڑلے بھی نہیں لے رہی تھیں۔ یہ بھی عجیب ہی بات تھی کہ بوجان سورہی ہوں اور خڑلے نہ لیں۔

کمرے میں آکر خپر بستر پر دن انہوں گیا۔ ذہینہ اسی طرح بے خبر سوہنی تھی۔ اونھر انہیں میں دور دوڑتا ہے۔ کر دیں بدلتا۔ او بڑھا بڑھ خیالات یلغار کرتے رہے۔ قصور میں انہل بے جوڑ شسلیں جنتی رہیں گہر قریں رہیں۔ دن کے دوران دیکھے ہوئے کتنے لفٹنے باری پار کی دھیان میں آئے اور محو ہو گئے۔ کافی ہاؤس میں بتول کی مثال گم سم لوگ۔ رکشہ والے کی راز بھری سرگزشی۔ وہ تو یاں پہ تھا ہی نہیں۔ وہ کون۔ وہ۔ کامریہ کھانے سے تمنتا تما چپڑہ۔ جلا جھنا ففرہ جیسے خبردار کرو ہا ہو، اس سٹائے سے ڈرو۔ اس وقت تو نہیں مگر اس وقت پنگ پر لیٹے لیٹے رات کے اس سٹائے میں ڈر گئے رگا۔ تعجب الگ کر کیسی رات ہے کہ سرے سے گرنی آواز ہی نہیں ہے۔ سنا ہٹی راتوں میں بھی زیع پیع میں کرنی آواز تو گوئی بخوبی ہے۔ بے خاک بے تنکی بے محل ہی ہو۔ سوتے سوتے اچانک کسی کا پنکار اٹھنا۔ کسی پرندے کا دھنعتا چکا کر چپ ہو جانا۔ درست کہ ایسی بے تنکی بے محل آواز دل سے سنبھٹے کا احسان اور گھرا ہو جاتا ہے۔ بہر حال وہ آڑان تو ہوئے ہے۔ لیکن اس رات جب سے میری آنکھ کھلی مرے سے کوئی آواز ہی سنا نہیں دیکھی۔ جیل کے پر بیدار کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ بھی گم سم تھا۔ اتنی سنا ہٹی رات میرے دل میں دہشت اترنے لگی۔ اسی ہنگامہ کی پڑھتے

خیالات کے بیچ مجھے پھلی شام کا دھیان آیا کہ جب میں گھنی سے گزر کر گھر میں داخل ہوں گا تا
تروہ کون تھا جو میرے پاس سے تیزی سے گزر گیا تھا۔ کون تھا وہ جو میرے برابر سے
شام کے جھپٹے میں اس تیزی سے گزر اکہ میں اس کی صورت بھی نہ دیکھ سکا۔ اتنی عجلت میں
وہ کیوں تھا۔ کیا عجلت اس کی وجہ تھی یاد انشتاں نے گوشش کی تھی کہ میں اس کی
صورت نہ دیکھ سکوں میں قسم کے کتنے شک ایکم سے میرے اندر پیدا ہو گئے۔ ایک شک
کو دفع کیا تو کسی دفعے شک نے سرا اٹھایا۔ دوسرے شک کا قلع قلع کیا تو کوئی تیسرا
شک پیدا ہو گیا۔ میں نہ اپنے آپ کو سمجھایا کہ آخر ہماری لگلی ایسی سنان تو نہیں ہے۔
یہاں لوگ رہتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں، آتے جاتے رہتے ہیں۔ آدمی کو سو طرح کے کام
ہوتے ہیں، سو کسی کا عجلت میں گذرنا ایسے کرنے اچھنے کی بات ہے اور شام کے اتفاقات
میں تو آدمی یوں بھی عجلت میں ہوتا ہے۔ جب دلوں وقت مل رہے ہوں تو قدم خواہ مخواہ
تیز تیز اٹھتے ہیں۔ مگر اپنے آپ سے میرا کوئی استدلال میرے کام نہ آیا۔ میں نے اپنے
شکوں کی جتنی تردید کی اتنی ہی وہ طاقت پکڑتے گئے۔ اور اچانک میں مجھے ایک اور شک گزدا
کہ کہیں وہ میرے در داڑے پر دستک دے کر تو نہیں پیٹھ رہا تھا۔ میرے در داڑے پر
مگر کیوں؟ میں ایکم سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ سمجھو میں نہ آیا تھا میں نے سٹول پر رکھی ہوئی
سگریٹ کی ڈبیا اور ماچ پس اٹھائی اور سگریٹ سلگاں۔ حالانکہ اس دقت مجھے سگریٹ
کی کوئی طلب نہیں ہو رہی تھی۔ مگر شک کی روایی طرح امندی ہوئی تھی۔ میرے
در داڑے پر؟ مگر کیوں؟

”ابھی تک جاگ رہے ہو؟“ زبیدہ توبے خبر سورہی تھی۔ جانے کیسے اس کی
آنکو کھل گئی۔

”ماں۔ نینز نہیں آرہی۔“

زبیدہ اٹھ کر با تھر دم گئی۔ واپس آئی۔ لیٹی ہی تھی کہ میں نے پوچھ دیا: ”آج شام

کوئی آپا تو نہیں تھا؟ ”
”نہیں۔ کیا کسی کو آتا تھا؟ ”

”نہیں تو۔ دیسے ہی پوچھ رہا تھا کہ شاید کوئی مجھے پوچھنے آیا ہو۔ ”

”نہیں۔ کوئی بھی نہیں آیا۔ اور یہ کہتے کہتے ذبیحہ پھر سننے لگی۔

میں اسی شش درجے میں کہ آخر وہ کون شخص تھا، اس وقت جب وہ میرے برابر سے گزرنا تھا میں نے اس پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ کیا دھیان دیتا۔ دن بھر میں چلتے چھرتے کتنی چھوٹی موٹی باتیں ہوتی ہیں جن پر تم ذرا دھیان نہیں دیتے۔ کتنے لوگوں سے مدد فہریٹ ہوتی ہے، اکتوبر سے محروم عیک سلیک ہو کر رہ جاتی ہے، اکتنے پاس سے گزر جاتے ہیں اور ان کا تم ذرا سا بھی نوٹس نہیں لیتے۔ تو اس کے معاملہ میں بھی یہی ہوا۔ ذرا جو اس کاؤٹس بیا ہو۔ مگر اب رات کے سنتے میں وہ میرے دھیان میں آیا اور میرے دل و دماغ پر چھاتا چلا گیا۔ اس کا پاس سے یوں گزر جانا کہ اس کی صورت نظر نہیں آئی، اس وقت کتنی غیر اعمیب و قعده بات لگی تھی اور اب اسی غرامہ، بے وقعت بات میں کتنے معنی، کتنے سنبھیں امکانات پوشیدہ نظر آرہے تھے۔ آخر وہ کیوں اتنی تیزی سے میرے قریب سے گزر اکہ میں اس کی صورت نہیں دیکھ سکا۔ اسے یوں منہ چھپانے کی خرد رت کیوں پیش آئی۔ ” جا گتے رہو۔ ” جیل کے پر پیار کی آوازا چانک بلند ہوئی، اس طرح نہیں کہ دُور سے آرہی ہو، اس طرح جیسے قریب سے آرہی ہو۔ لب ایسا گاہ کہ وہ برجی سے اڑ کر تھوڑا ہمارے گھر کے قریب آگیا ہے، چھوڑا شکی دیوار کے برابر۔ دل میرا دھڑکنے لگا۔ مگر پھر فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال۔ خود کو تو کا اڈ رہے ہو۔ اس کے ساتھ ہی دھیان کہیں سے کہیں چلا گیا۔ میاں جانا پسندالہ کے حضور۔ میرے بیٹے، آدمی تین حالتوں میں بچپانا جاتا ہے:

جب وہ سرخوشی کے عالم میں ہو؛

جب وہ خوف کے عالم میں ہو؛
 جب وہ نشہ کے عالم میں ہو؛
 اور اسے میرے بیٹے، نشہ کی تین قسمیں ہیں،

ام المخاشر کا نشہ،

ظاقت کا نشہ،

عشق کا نشہ،

اور جاننا چاہیے کہ اہلِ بصیرت نے نشوں میں سے صرف نتھے عشق کو جائز جانا ہے۔ باقی نشوں کو باطل بھرا رکھا ہے۔ میاں جان کا تذکرہ جو میں نیچپلے دنوں پڑھتے پڑھتے پچ میں بچوڑ دیا تھا اس گھرداری میں اپنی طرف کھیخ رکھتا تھا۔

سوائے صاحبو، یہ ہے ہمارے خاندان کا احوال اور اب ضرور آپسا ہے کہ جتنہ جتنہ ابا�انی کے اور اق پریشاں سے نقل کر دیں کہ یوں اجداد کا ذمہ بھی بزیانِ ابا�انی فیکر کے تذکرے میں شامل ہوا کہ اس کے لیے باعثِ شرف بن جائے گا اور گذرے زماں کا ایک نقشہ بھی حسب میں عبرت کے گوناگون پڑو ہیں، انظر دیں کے مانے آجائے گا۔

منقول از مذکورہ حکیم چراغ علی کہ پدرم بود

اس کیجئی بیان چراغ علی نے سنانے پنے ابا حضور سے، ابا حضور نے سنانے ابا حضور سے، اور ابا حضور کے ابا حضور نے سنانے پنے ابا حضور سے کہ اس بزرگ نے وہ حال تباہ اور وہ ماجرا شے جان کاہا اپنی آنکھ سے دیکھا تھا، دیکھ کر منہ اشکوں سے دھیا تھا، یوں بیان کیا اس جانب نے کہ ایک دن یہ خبر گام ہوئی، زبانِ زدِ خواص دعوا گہری کہ باغی ایک تنخت کا پکڑا گیا ہے، ازنجیدن میں جکڑا گیا ہے۔ کل شہر میں اسے بچرا یا

جادے گا؛ تہاشا خلقت کو دکھایا جادے گا۔ دیکھنے والے ماموت کریں گے، قصے اس نکے عبرت پکڑیں گے، خیالِ فاسد بغاوت کا اگر کچھ اور سرپھرود سرکشون کے دماغوں میں پک رہا ہے تو وے اس سے بازآدیں گے۔

تو اگلے دن بھر فخر کا بجتے ہی خلقت گھروں سے نکلی۔ کوچہ دبازار میں امنڈی۔ میں بھی فخر کا دو گاہنا ادا کر کے مسجد سے نکلا تو گھر جانے کی بجائے طرف چاندنی چوک کے ہوڑی۔ تہاش یوں کا اڑ دہا آتھا۔ مجھے خاص دعا آتھا۔ آدمی پہ آدمی گرتا تھا۔ کھو سے سے کھرا چلتا تھا۔ چشم تہاشہ ایک نئے تہاشے کی منتظر تھی۔ زانے ایک نظارے کے لیے مصہب تھی۔ خدا خدا کر کے سواری باغی کی آئی تہاش۔ یوں کی جان میں جان آئی۔ ہتھنی ایک بد رنگ نظر آئی۔ ہر دا غائب۔ نیکی پیٹھ پہ اس کی ایک شخص باحال تباہ بیٹھتا تھا۔ سراس کا جھکتا تھا۔ دو شالہ ایک میلاد دوش پہ اس کے پڑا تھا۔ دیکھنے والوں نے تھڑی تھڑی کی۔ اواز سے کے کہ نظریں کیوں نہیں انھاتا ہے۔ صورت اپنی کیوں نہیں دکھاتی ہے۔

نگاہ ایک فتیہ صفوں کو چرتا، تہاش یوں کو دھیکتے پاس اس کے پہنچا اور یوں گویا ہوا کہ اے وہ کہ کل یہک صاحبِ جاہ و حشمت تھا، ماںک طبلِ علم تھا۔ تیری سواری بادی بھاری اس راہ سے گزرتی تھی تو تو مجھے عطا کیا کرتا تھا، دامن اشتر فیروں سے بھردیا کرتا تھا۔ آج تیر پاس کیا ہے کہ اس سائل کو عطا کہے۔ یہ سن کر اس شخص نے نظریں انھا کر ملکنے والے کو دیکھا اور دو شالہ دوش سے اتار کر اس کی سخت پھینک دیا۔ تب خلقت نے قبور اس کی دیکھی اور سنا تھے میں آگئی۔ کتنی زبانوں سے ایک دم نکلا:

”ولیعہد بہادر“

اوہ پھر ایک دم سنا تھا۔ دیکھنے والے دنگ، زبانیں گنگ۔ سب حیان کہ یا الہی یہ کیا ماجرا ہے۔ ہم بیداری ہے یا خواب کی سحر کاری ہے۔ پھر دیکھتے دیکھتے حیرت کی جگہ غضبناکی نے لے لی۔ مجھ بھرا اٹھا۔ کب جیون پر کہ ولیعہد بہادر کو کب فشار کر کے ڈرم خان بنانا ہوا تھا،

ٹوٹ پڑا۔ شاہی پریمیار حرکت میں آئے تھے تو تمہو کہ ملک جون کو بچالے گئے۔

میں حیران و پریشان گھر لوٹا۔ رات پھر کر دیں بعد تارہا۔ گرم بیان سحر کا جب چیز کا
ہوا اور قصہ رات کا پاک ہوا تب میں اٹھ سمجھ کی سوت چلا۔ نماز سے فراغت پاکر مسجد
سے نکلا تو دیکھا کہ چھوٹے بڑے سے جوان بوڑھے خاص دعا کم شریف درفعہ سب پیک جپک
چلے جلتے ہیں۔ چاندنی چوک کی ہلف ڈھلتے ہیں۔ میں بھی اس نوٹ میں بہلیا۔ اس نجت میں
میں کہ دیکھیں آج نیرنگی زمانہ کیا رنگِ دھانی ہے، کونسا کل کھانی ہے۔ جہاں خلقت تھا۔
اندر قطعہ کھڑی تھی اور کسی آنے والے کی راہ سمجھتی تھی وہاں میں بھی جا کھڑا ہوا۔ ابھی زیادہ دیر
نہ ہوئی تھی کہ دہی خوست ماری بد رنگ سمجھنی ندوار ہوئی۔ اب رنگ دگر تھا۔ نقشہ دوسرا تھا
ایک لکھنے بے مریضت پراس کی دھراتا۔ لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو سہم گئے۔ دل انکے
دہل گئے۔ آج پھر میک جیون طزم خان بنا چل رہا تھا۔ کمال اتارہا تھا کہ پورا شاہی دستہ
اس کی لگک پڑتا۔

دل کہ دہل گئے تھے رفتہ رفتہ گداز ہوئے۔ آنسو آنکھوں سے جاری ہو گئے۔ حق یہ ہے
کہ خلقت جہاں آبادی اس دن بہت روئی۔ میں نے غبیط کا دامن تاویر تھا میں رکھا مگر
گھر آتے آتے بند ٹوٹ گیا۔ یہ دوستیوں میری گنگا جہاں کیسی طبیعت کی بحث پر بھی نہ
بنپھلی۔ تب میں پدر گرامی قدر کی خدمت با بر کرتے ہیں حاضر ہوا۔ دوناؤ ہو مودب ایک طاف
بیٹھا۔ اس صاحب نظر نے چہرے پر میرے نظر کی، ہمال کیا۔ پھر بند گویا ہوئے:
”جان پدر! ہم دیکھتے ہیں کہ چہرے پر فرزند کے ملال کی گرد ہے اُنگت
زرد پسے آخر وجہ ملال کیا ہے؟“

میں عرض پر ہاذ ہوا کہ: ”پدر بزرگوار کی اور آج میں ہو دلخراش منظر
ان گنگہ کا رہ آنکھوں نے دیکھے ہیں اور ایسے دہشت اثاثا خبار ان کا ذون نے
ٹوٹے ہیں کہ جگر کھتا ہے، کلیجہ منہ کہہ آتا ہے۔ کیونکہ عاجز گوش گذار کرے کے کہا

زبان کو بیان کا یار انہیں ہے، ضبط کی تدبیح نہیں۔

میں یہ کہہ کر جپ ہوا۔ پھر دل کو سنبھالا، حواس درست کیے اور جو مشاہدہ کیا تھا وہ بے کم دکا است بیان کیا۔

پڑھاں قدر نے یہ اجرائیں تاویر مکوت اختیار کیے رکھا۔ پھر فرمایا کہ: ”جان پدر، ایک سانچہ کی دید نہیں ہلا دیا۔ اوسان کو تمہارے نگم گردیا غور کی جاتے ہے اور نکر کا مقام ہے کہ تمہارے اجداد نے کتنا کچھ دیکھا کہ اس کے دیکھے سے ثیریں کا جگر پھٹ جائے مگر کسی ماحرے نے انکے حوصلہ کو پست نہیں کیا۔ کسی سانچے سے ان کی کشتمی ہمت ڈالنے والوں نہیں

ہوئی۔“

یہ کلام سن کر میں حیران ہوا اور استفسار کیا کہ وہ کیسے ماحرے تھے کہ اجادہ نے دیکھے اور جن کے ساتھ یہ اجراء جذاب گور دنظر کرتا ہے۔

پڑھاں مقام نے تامل کیا۔ پھر یوں گواہ ہوئے کہ:

”اے فرزندِ لبند، ہم اصلًا اسفہان لصف جہان کی مٹی ہیں۔ ہمارے جدیاں خلداشت یہاں احمد بالله عزیز دہمت کا پیکر تھے، وجود دسخا کا سمند تھے ان کا مسکن کہ بیت الہبین کہتا تھا اس فہمان میں مر جمع خلائق تھا۔ قریب دُور سے حاجتمنہ آتے تھے اور دامن پھر کر جاتے تھے مگر تمہاری غصب کی آمد ہی ایسی چلی کہ بھرا اس فہمان اجڑ گیا۔ سیہ سختی نے بیت الہبین میں ڈیرا کیا اب وہاں سنا پہلا تھا۔ جواناں جری کہ میدان کی طرف گئے تھے واپس نہیں آئے۔ سب کٹ گئے۔ ایک ایک کر کے بٹ گئے۔ سران کے کھو پڑیوں کے معیناً کی زینت بن کر بلند ہوئے۔ تب ہمارے عالیٰ قدر جد نے بعد وقار لپنے گھوڑوں اور سُتھیاروں پر ایک نظر ڈالی۔ خالی ایک تلوار

کمر سے باندھی اور اس اسپ باونا پر سوار ہوئے جو راؤں کے پیچے آگئی۔ بھلی کی
مانند تڑ پتا تھا اور ہوا سے باشیں کرتا تھا۔ زوجہ محترمہ کو ٹیکھے اور کس فرزند کو
آگے بھایا۔ بیت الابین کے درودیوار پر حضرت سے نظر کی اور نکلی کھڑے ہوئے۔
جده عالی مریت کرنے دنی خاک ببر بھرتے پھرے صحراؤں کی خاک چھافی۔ جنگل کو
کھندا۔ رات بھی کسی کھومیں گذاری۔ کبھی کسی جھاڑی تلمے خاک کے بستر پر بسکی۔ آڑ کے
ٹیکس مرنے بوم قز دین پر قدم رکھا۔ اس زمین نے قدم اس جانب کے پکڑ لیے اور دل کو
موہ لیا۔ لب پھراسی دیار میں ڈیڑا دلا اور اس لاثانی قریبے کو اصفہانِ ثانی جانا جو لعل
اسفہان کی مٹی نے انکھا تھا وہ قز دین کی خاک میں آسودہ ہوا۔ پھر انگلی نہیں اسی دیار میں
پرداں چڑھیں۔ بیٹے پوتے پڑ پوتے خوب پھلے پھولے ان میں سب سے بڑھ کر ہمارے
جدید امجد حکیم علی شیر ریحان تھے کہ مسکن اس گھرانے کا اس جانب کے نام سے منسوب
ہوا اور قصر ریحان کے نام سے قریب دوسرے شہر ہوا۔

قصر ریحان علماء فضلا کا مر جمع تھا۔ دکھیاروں کا ملیخا تھا وہ افسح ہو کر قز دین میں
آکر ہمارے اجداد نے شمشیر و سنان سے رشتہ تڑپا یا تھا۔ شمشیر آبدار کہ جید عالی وقار،
احمد بالله ذیب کر کر کے بیت الابین سے نکلے تھے اس فہان سے قز دین تک "رفیق و رساز"
رہا۔ راہ میں کتنی مرتبہ تاتاری رسالوں سے مدد پھیڑا ہے۔ ہر مرتبہ اس شمشیر نے اپنے جو پر
دکھائے۔ مگر جب اس بجناہ نے قز دین کی زمین پر قدم لکھا تو توار کو کھول کر اگر دکھاول
بعد افسوس فرمایا کہ یہ توار اصفہان کی حفاظت نہ کر سکی اور بیت الابین کو برباد ہونے
سے نہ بچا سکی۔ سواب تو قیسہ اس کی کیا رہ گئی۔ اس کام کے ساتھ شمشیر و سنان کو سلام
کیا اور علم و فضل سے رشتہ استوار گیا۔

آگے اس گھرانے کا ہر فرد شجاعت میں فرد تھا۔ توار کا دھنی تھا۔ اب ہر فرزند خلذان
علم و فضل میں یکتا نے روزگار تھہڑا۔ سب سے بڑھ کر جید امجد حکیم علی شیر ریحان تھے کہ

طب و حکمت کے مجر کے شناور تھے۔ بھیثیت طبیب جالینوس نے اس کے لئے بھی خلائق میں دیکھتی تھی۔ اس کے ظلم کی وجہ سے نفور تھا اور وہ زمانہ پر فتوڑ تھا۔ حاکم وقت کے ظلم سے خلائق نہ اپناء نمکن تھی۔ اس کے ظلم کی وجہ سے اندھا دھنڈتی تھی کہ اپنے پرانے کو بھی نہیں دیکھتی تھی۔ اس مردِ شرم کے چار بیٹے تھے۔ خلفت میں مقبول تھے۔ یہ دیکھ دہ ان سے خلاف ہوا۔ ایک کو زہر دلوادیا۔ دوسرے کی آنکھوں میں گرم سلاٹی پھیر دی۔ تیرے کی آنکھیں ثابت نکال لیں۔ چوتھے کو فرشتہ تھا نے اچک لیا۔ اس کی دستبرد سے پچ گی۔

واضح ہو کہ انہیں ایسا میں جدیز مگوار نے اس طبیب بے شان نے ایک سرمه تیار کیا تھا کہ بینائی کسی صورت بھی زائل ہوئی ہو، اس کی ایک سداٹی سے بحال ہو جاتی تھی۔ پہنچن کی آنکھیں نکلوانی جاتی تھیں، ان پر یہ سلاٹی کیسے پہنچتی کہ ان کے مقدار میں تو پھر سہ بندی خانے کی تاریکی کھوی جاتی تھی۔

یہ حالات دیکھ کر جدید عالی مقام کی بعیدہ خاطر ہوئے۔ آبدیدہ ہو کر بولے کہ افسوس ہے ہم پر کہ بے بصر حاکم وقت کے ہاتھوں خلفت چشم بینا سے محروم ہوتی چلی جا رہی ہے اور ہم بیٹھے دیکھتے ہیں اور اپنی ایجاد پر فخر کرتے ہیں۔ پھر آگے دھری ہوئی سرمه دافی سے مخاطب ہوئے کہ اسے سرمه دافی اگر تو قریبی کیجیے آنکھوں کو روشن نہیں کر سکتی تو پھر کس کام کی؟ یہ سماں کہ سرمه دافی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ چار مخطوطہ دربارہ طب بغل میں دلبے، ابی خانہ کو ہمراہ یادِ قصرِ بیجان کے درود پوار کو ایک نظر دیکھنے نکل کھڑے ہوئے۔

اس صاحبِ والصفات نے اس نواحی میں جس قریبے میں قدم رکھا یہی دیکھا کہ خلائق محتسب و مقتول ہے۔ آنکھوں میں ان کے گرم سلاٹیاں پھیری جاتی ہیں۔ پتیاں نکلوانی جلتی ہیں۔ ایک بدجنت حاکم نے بندی خانہ کے داروغہ کو بحالت غضب حکم دیا کہ جتنا باغی پاہ زنجیر ہیں اتنی پتیاں کے جوڑ سے مابدال لت کے حضور گن کر پیش کیے جائیں۔ ایک جوڑا بھی کم ہوا تو پیری پتیاں نکلو اگر کہنے پوری کر دل گا۔

یہ نقصہ دیکھ جدِ امجد نے اس نواحی سے منہ مڑا اور دیا رہنڈ کی راہی۔ جان پدر، یوں ہمارے احمد اصفہان سے نکلے اقریب قریب پھرے اور جہاں آباد میں اگر کوئی بے ڈالے پدر غال قدر یہ کہہ کر خاموش ہوئے۔ پھر افسوس سے بولے: ”جیف ہے اس بستی پر کہ یہ بھی اسی راہ پر چل نکلی ہے۔“

میں نے استفسار کیا کہ باعث اس فساد کا کیا ہے؟

فرمایا: ”انسان ظالم ہے اور جاہل ہے۔“

تب میں نے بُعد ادب یہ سوال کیا کہ اے میرے پدر، ایسا کیوں ہے کہ ظالم اور جاہل سب سے بڑھ کر امتِ مرحوم کے بیچ غوردار ہوتے ہیں۔ اس پر پدر بزرگوار نے سکوت اختیار کیا، پھر تین بار کہا:

”افسوس، افسوس، افسوس۔“

پھر آنکھیں موند لیں اور سحرِ سکوت میں غرق ہو گئے۔

عاسی پر معاہی چراغ علی اس باب میں یوں کہتا ہے کہ جدِ امجد نے بھافرمایا بیٹھ کامی ظالم اور جاہل ہے۔ لکھنا کچھ دیکھتا ہے مگر عربتِ حاصل نہیں کرتا ہے۔ ایک داقعہ اس باب میں یہ تسمیہ دان تواریخ سے اخذ کر کے نقل کرتا ہے۔

روایت کیا ابو جعفر نے ابنِ ندیم سے اور ابنِ ندیم نے سنا احتی زیتون فردش سے کہ زیتون کی اس کے شہرت دور دور تھی۔ دیانت اس کی قریب قریب مشہور تھی۔ اور احتی زیتون فردش نے نقل کیا حارث عطاء سے کہ مرد با صفاتِ حاصلِ صاحبِ زید و اتعال تھا۔ اور حارث عطاء نے اسے تقدیر کیا بیان سے ابو بکر جدابی کے کلم کا سمندر تھے۔ احادیث روایات کے شناور تھے اور ابو بکر جدابی نے شنبید کیا زید بن عثمان زرگر سے کہ مردان الہا قتل ہوا اور سر اس کا قلم کر کے طشت میں سجا کے عبداللہ بن علی کے دربار پیش کیا گیا اور بعد اس کے دہ طشت ایک طرف رکھ دیا گیا۔ اسی ہنگامہ ایک بی بی حرام پیش کر

اس سر کے پس آپنی اور کسی ترکیب زبان اس کے نیچے سے نکال کر چاہئی۔ دیکھنے والوں نے یہ دیکھا اور ششدہ رہ گئے اور اس پر کہا عبد اللہ بن علی نے کہ خدا کی قسم: میں نے زمانے کی عبرت ناکیوں اور وقت کی سفاکیوں میں اس داقعہ کو سب سے زیادہ بہتر تناک اور سفاک پایا۔ اور نفیر چراغ علی اس نیچے یہ کہتا ہے کہ بے شک تسلی جتنی مسکین ہوتی ہے اتنی ہی سفاک بھی ہوتی ہے۔ جلتے غور ہے و نیز جاتے عبرت کہ بنی امیہ کو جتنا گھمہ اپنی حملہ نہ پر تھا اتنا ہی غرہ اپنی خطابت پر تھا مگر ایک گردہ مسکین مروان الحمار کی زبان چبا کر ان کی خلافت اور خطابت دونوں کو چاٹ گئی کہ بعد اس کے کسی امری کو تخت خلافت پر بیٹھنا نیب نہ ہوا۔

العقلہ دنیا میں زق زق بوق بغاوت ہے، شور و غوغائی غیاثہ بے نہایت ہے، بھانی کو بھانی سے عداوت ہے۔ زن زنادر زمین کے لیے خون خرا بہ، شور شرابہ، نفسی دھینگا کشتی، دل نصل، جنگ دجل، چنجم دھاڑ، دانتا کلکل۔ مگر زندگی کا کیا اعتبار ہے دنیانا پائہ ار ہے۔ یہاں کس چیز کو قرار ہے۔ ابھی تخت پر بیٹھے ہیں، ابھی تباوت میں لیٹے ہیں۔ زمانہ ابوق ایا ک پر سوار بجھٹٹ دوڑتا ہے۔ نیک و بد کوئیں دیکھتا ہے۔ بلا تحریز سب کو رومندتا ہے۔ حوت کی گرم بازاری ہے۔ آج ہم کل تمہاری باری ہے۔ قصہ مخفر دنیاٹ دل میں حالت سب کی ذبوں ہے۔ زنگ بگر دل ہر دم دگر گوں ہے۔ کبھی یوں ہے کبھی دل ہے۔ یہ بیچ پوچ چراغ علی اپنی مثال لاتا ہے۔ ان دو آنکھوں نے اس عمر میں کیا کیا کچھ دیکھیا۔ جو جا کے نہ آئے دہ جوانی دیکھی۔ جو آکے نہ جلسہ پادھتی ہیں، تیموری بساط کو پہنچتے دیکھا۔ جہاں آباد کو اجرتے دیکھا۔ تایا حضور کو دار پر بلند ہوتے دیکھا اور اہل جہاں آباد نے ذیر آسمان کیا کیا دیکھا۔ جس بادشاہ کو تخت ہی پر بس تھا نہ میں بوق افز دیکھا تھا اسی کی ننگی لاٹش جتنا کریمی پر پڑی دیکھی۔ تایا حضور نے ایک روز یہ احوال بیان کیا اور اتنا رد ہے کہ ریش مبارک ان کی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ ایسا ان پر اثر ہوا

کہ جیسے سے جی سرد ہوا ارنگ چیرے کا زرد ہوا۔ دنیا کے قسم بھیڑوں سے منہ مورا، علیش و عشرت کی مغلوبوں کو، یار و احباب کی صحبتوں کو بچوڑا۔ خانہ نشین ہو گئے مہمیں پہ بیٹھ گئے ہر دم کیا دخدا میں مستقر۔ طبیعت میں نہ شو خی رہی نہ خوشی کی ریق۔ مراجیں غم بس گیا تھا، لم رچ گیا تھا۔

تاپا حضور نے جب دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں تو کسی اور عالم میں جا کر ان کی آنکھیں گھل گئیں۔ آنے والے واقعات کی خردیدیتے تھے۔ پیش گوئی میں درک رکھنے تھے اور خوابوں کی تعبیر میں تو انہیں یہ طولی حاصل تھا۔ اس کم فہم نے ان سے تعبیر میں گھن کرایک تعبیر نامہ مرتب کر لیا تھا۔ مشترے نمونہ از خردار سے کے طور پر تحریر انقل کرتا ہوں:

انجیر کا پتہ دیکھنا:

باعث پریشانی ہے۔ انه بشر کی نشانی ہے۔

اناج خشک کھانا:

منظی میں مبتلا ہو دے، ار سخ کا سامنا ہو دے۔

ادنچی جگہ سے اترنا:

غم و غصہ کھاتا رہے۔

آنہ تھی دیکھنا:

ملال بیش ہو دے۔ فتنہ و فساد پیش ہو دے۔

بلبل دیکھنا:

حاکم سے نفع کی دلیل ہے مگر قتلیل ہے۔

پیسہ پڑا پانا:

غم کی نشانی ہے۔ نہایت پریشانی ہے۔

بچوں دیکھنا:

کسی گل روپِ عاشق ہو دے۔ مبتدا تے فعلِ فاسق ہو دے۔

پستان دیکھنا:

دل شاد ہو دے۔ اولاد ہو دے۔

پیاسا آپ کو دیکھنا:

حرص بڑھے۔ نیک کاموں میں خل پڑھے۔

حتمہ پینا:

معشوق سے تمہارا کلام ہو وے۔ غم سے بخات پاوے۔

شربے دهار دیکھنا:

بدر کاری کرنے میں بے باک ہو دے۔ آخر غنماں ہو دے۔

طاذہ دیکھنا:

عشق میں مبتدا ہو دے۔ جذون کا سامنا ہو دے۔

ہنسنا:

ننم کی دلیل ہے مگر قدر سے قلیل ہے۔

تا یا حضور نے اپنی مت کی خبر بھی پہنچی دیدی تھی۔ ایک دو ز پیسے گریہ کیا، پھر تسم فرا پایا۔ اپا حضور نے مدبب گریہ اور تسم کا پورچھا تو فرمایا کہ جان برا در۔ رویا میں خلقت کی یہ آنے والی آفت کا تصور کر کے اور تسم ہوا یہ جان گر کہ وصال کا وقت اب قریب آن پسندی ہے۔ ابا حضور نے استفسار کیا کہ یہ آپ نے کیونکر جانا۔ فرمایا کہ جان برا در، پہلی بات میں نے اس طور جانی کہ رات خواب میں دیکھا کہ آندھی کے جگڑ چلتے ہیں۔ تناور درخت گرتے ہیں۔ دوسرا بھر اس طریق سے پائی کہ آج صبح میں سورج کی سمت منہ کر کے کھڑا ہوا اور آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو دھیان میں لایا۔ دیکھا کہ تن سے ہمارے سر غائب ہے۔ یہ کہہ کر چپ ہو گئے۔ پھر چہرے پر ملاں کی کیفیت طاری ہوئی۔ تامل کیا،

پھر گویا ہوئے کہ جان برا درا یہ سر تو دیسے ہی دبال بنا ہوا تھا۔ تن سے جدا ہو گیا تو خوب ہوا۔
لگر کونسی گھٹری آنے والی ہے کہ حس روشن ضمیر کو دھیکا میں لاتا ہوں تن سے اس کے سر
جدار بیکھتا ہوں۔ بعد اس کے آپ نے تین بار فرمایا: "افرس، افسوس، افسوس"

"اے بیٹے، رات کو تم سوئے ہنہیں تھے؟"

میں نے سڑ بڑا کہ بوجان کو دیکھا کہ جائے کس وقت میرے قریب آن گھٹری ہوئی تھیں
میں نہ کرے کے اور اق اگ رکھے:
"بوجان، آج ذرا جلدی آنکھ کھل گئی۔ میں نے سوچا کہ میہاں جان کے تذکرے کے جو
اوراق پڑھنے سے رمگئے تھے انہیں بیشاد دیں۔"

بیٹے سلات کے کمیں بچ میری آنکھ کھلی تھی اس وقت بھی تم جاگ رہے تھے خدا خدا
کر کے تمہارے جلگنے کی عادت چھٹی تھی۔ اب پھر تم نے دمی طور پر کھڑا یا۔" یہ کہتے کہتے بوجان
باہر برآمدے ہیں نکل گئیں۔ دعو کیا۔ پھر نماز کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

بوجان دوبارہ میرے پاس اس وقت آئیں جب میں ناشرتہ کرتے کرتے انجام
پڑھنے میں غرق ہو گیا تھا:

"اے ہے انجام ہوا بلائے جان ہو گیا۔ کیوں چلے گوئے کو ٹھنڈا کر رہے ہو؟"
میں نے انجام سے ذرا انقدر ہٹا کر سامنے رکھی چائے کی پیالی پر نظر ڈالی۔ پیال منہ سے
لگائی۔ واقعی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

"اوہ آج تم اپنی چڑیوں کو سبی بھول گئے۔ غریب چگے کے انفارمیں سوکھ رہی ہیں۔"
ہاں واقعی چڑیاں تو میرے ذہن سے آج اتر ہی گئی تھیں۔ فوراً انجام اگ رکھنے
کے پیچے ہوئے ٹھنڈے جلدی جلدی ریزہ کیے اور آج تو س کے لگنے سے نیادہ ہی بچ گئے
تھے۔ ایک تو س تو پورا بچ گیا تھد ناشرتہ کو طبیعت لے لی نہیں رہی تھی۔ ریزے لے کر
ہار سنگھار کے پاس پہنچا تو چڑیاں جا چکی تھیں۔ ان چڑیوں کے بیٹھی بیجی نخزے تھے۔

رینے والے میں جس صبحِ ذرا مانیر ہو جاتی وہ اڑ کر جانے کے طرف نکل جاتیں۔ جیسے روٹھ
گئی ہوں۔

بس ایک چڑیا پتھرے بھکتی دہ گئی تھی۔ وہ نخواز سے تامل کے ساتھ شاخ سے اڑ کر
آئی۔ چند رینے سے چکے مگر کچھ زیادہ شوق کے ساتھ نہیں۔ پھر وہ بھی اڑ گئی۔

۱۰

”دردانے پر کوئی ہے؟“ یہ کہنے کے ماتھ ساتھ میں نے گھٹی کی آداز پر کان لگائے۔
 کچھ ایسا گمان ہوا تھا کہ کسی نے درداز سے کی گھٹی بجائی ہے اور میں نے اس موقع پر
 کان لگائے کہ اگر کوئی ہے تو پھر گھٹی بجائے گا مگر پھر کوئی آداز ہی نہیں آئی۔
 ”کوئی بھی نہیں ہے“ زبیدہ بولی۔ ”کوئی ہوتا تو درداز سے کی گھٹی بجاتا۔“
 ”میرا خیال ہے کہ کسی نے بجائی تھی۔“

”مجھے تو سنائی نہیں دی تھی۔ تمہارے تو کان بختے ہیں۔“

میں تھوڑا اکھیانا ہو کر چپ ہو گیا۔ آگے دھری ہوئی پیالی اٹھانی اور خاموشی سے چائے
 پینے لگا۔ مگر اندر ایک خلش سی تھی کہ کیا واقعی کوئی نہیں تھا اور کیا واقعی کسی نے گھٹی نہیں
 بجائی تھی۔ پھر مجھے یہ کیسے گمان ہوا۔ کیا یہ مخفی وہم تھا۔ مگر پھر میں نے جلد ہی اس خلش کو
 رفع دفع کر دیا۔ یہ سوچ کر کہ آخر یہ کونا ایسا بڑا سند ہے۔ نہیں ہو گا کوئی میرا وہم
 ہو گا۔ اور ایسا وہم ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ یوں بھی تو ہوتا ہے کہ کوئی آس پاس نہیں
 ہوتا اور لگتا ہے کہ تمہیں کسی نے پکارا ہے، تمہارا نام یا ہے۔ تو کیا الجب ہے کہ وہ وقت
 بھی ایسا ہی ہوا ہو۔ تو اس ہڑت سے ذہنی فراغت کے بعد میں نے اطمینان سے چائے دُختم
 کی، سگریٹ مل گائی۔ زبیدہ چائے کی ٹرے لے کے باور چیخانے کی ہڑت چل گئی۔
 اب شام ہو رہی تھی۔ میں اطمینان سے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ سگریٹ پیتے پیتے

بس یونہی ایک رو میرے اندر اٹھی کہ مگن ہے کوئی آیا ہی ہو کہ گھٹی کی آداز تو میرے کان میں آئی تھی مگر کون تھا وہ؟ اور اس آن مجھے اس شخص کا خیال آیا جو شام کے چھینپے میں میرے پاس سے گزرا تھا ایسے کہ میں اس کی صورت بھی نہیں دیکھ سکا اور جس کا خیال اس عصاٹی طاقت میں میرے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ وہ شخص ایک رجہ بھر میرے قصور میں زندہ ہو گیا۔ تو کیا وہی شخص آیا تھا؟ مگر اس طرح کبھی آتا ہے؟ آنے کا اچھا وقت چلتا ہے اور کیا خوب بلوا پتا لیا ہے کہ شام کے چھینپے میں آگر دروازے پر دستیک دیتا ہے اذکرنی آہستگی سے دستیک دیتا ہے کہ میں شک میں پڑھتا ہوں کہ کسی نے دستیک دی بھی ہے یا نہیں اور بھر دم کے دم میں اڑنچھوڑ جاتا ہے۔

ابہ میں سچھتا رہا تھا کہ فوراً جا کر دروازے پر دیکھا کیوں نہیں؟ بھر زبیدہ پر منصہ آیا کہ اس نے بے سوچے سمجھے فوراً ہی میری بات کی تردید کر دی۔ خود پر بھی جھنجھلا ہٹھ ہوئی کہ میں نے زبیدہ کی بات کبھی مان لی۔

"ایک بات بتاؤ۔ آج میں نے فال نکلوائی تھی۔" زبیدہ نے والیں آگر قریب میثقت ہرنے کے بعد رازدارانہ سے لبھ میں اظہاع دی۔

"وہ کس سلسلہ میں؟" میں نے چونکہ زبیدہ کو دیکھا۔

"اس شیانے کے سلسلہ میں۔" زبیدہ تمہوراً ہچکیا تھا۔ بیرونی: "فال میں نکلا ہے کہ یہ زمین تھیں را اس نہیں آئی۔ پسچ ڈاؤ۔"

"کیا؟" میں کچھ بول کھدا گیا۔

"فال میں زیسی نکلا ہے۔"

بہ بات اتنی اچاہئے تھی کہ پہلے تو میری سمجھد میں کچھ نہ آیا کہ کیا کھوں۔ رفتہ رفتہ میں نے اپنے آپ کو جمع کیا، کہا: "zbیدہ، ستو۔ میں تو اس جھنجھٹ میں پڑھی نہیں رہتا تھا۔ تمہاری صد تھی کہ مکان اپنا ہونا چاہیے۔ تمیں معلوم ہے کہ کئی مصیبتوں سے پلاٹ حاصل کیا۔ پھر کیا کیا

جن کر کے مکان بنوایا۔ اس کے قرضے ابھی بھک جان کے ساتھ گئے ہوئے ہیں۔

”یہ سب نہیں کہے۔ مگر مکان تمہاری جان سے زیادہ پیارا تو نہیں ہے؟“

”میری جان سے پیارا؟ میری جان تو اس کے لیے جتنی گھُنٹی تھی گھُنٹل چکی۔ اب یہ مکان میری جان کو کیا کہتا ہے؟“

”خیر میں نے تو فال میں جونکلا تھا وہ بتا دیا۔“

”تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ یہ مکان جو آخری مصیبتوں سے بنا ہے نیچ ڈالنا چاہیے۔“

میں نے چڑک کر کہا تھا اور زبیدہ نے کس کو دن کے ساتھ جواب دیا: ”مکان جائز سے زیادہ تو نہیں ہے۔ کافی دلے ہاتھ سلامت رہیں مکان تو اور ہمیں بن سکتا ہے۔“

استثنے میں بوجان برآمد ہوئی۔ میں نے فراؤں کے سامنے مقدمہ پیش کر دیا: ”بوجان۔

آپ نے سننا۔ زبیدہ کی تجویز یہ ہے کہ آشیانہ نیچ دیا جائے۔“

”ماں۔ سن چکی ہوں۔“ بوجان نے گھٹے سے لبکھ کر میں کہا اور اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ زبیدہ بوجان سے یہ ذکر پہلے ہی کہ چکی ہے اور بوجان اس پر اپنی ناپسندیدگی کا انہاد کر چکی ہیں۔ بوجان تھوڑا چپ ہوئیں پھر زبیدہ سے مخاطب ہوئیں:

”اے دہن۔ ہوش کی دوالو۔ مکان کوئی گھٹے گھڑیا کھیل ہے کہ آج بنایاں۔ سچ دیاں بی بی مکان تو ام کا پیڑ روتا ہے۔ نہیں پہل کھاتی ہیں۔ خیر سے سہاگ بنار ہے۔ آج تم دو ہوں گئی اللہ چلے ہے تو میں ہو جاؤ گے اور پھر تین سے چار ہوں گے۔ بڑا کو کھاں لیے لیے پھر ڈگی؟“

”اوہ گھر بنالیں گے۔“

”اوہ گھر بنالیں گے۔“ بوجان نے کتنا منہ بگاڑ کر کھد دہن، مکان زندگی میں ایک مرتبہ بنتا ہے پھر پشتیں چلتا ہے۔ ہماری چدائی یا پانچ پشتیں پہلے بنی تھی۔ اللہ رکھے اس نے پانچ پشتیں دکھیں اور ابھی تو اسے اور پشتیں دیکھنی تھیں۔ جو یہی تو گھر دی تھی۔ جو یہی داہی اکھڑ گئے۔“

”بوجان، خوشی سے تو میں نے یہ بات نہیں کی۔ فال میں جو نکلا ہے وہ میں نے کہلہ ہے۔“
”اے دلمن کسی بات میں کرتی ہو۔ فال نکالنا ہر ایرا غیرا کا تو کام نہیں ہے کسی ٹھٹ پوچھنا
مولوی سے تم نے فال نکلوائی اور یقین کر لیا۔ ارے فال ہی نکلوانی تھی تو مولوی غلام رسول
سے نکلوائیں۔ ادر میں تو گھوڑے ہوں کہ انہیں بلوا کے کہا جائے کہ گھر کو کیل دد۔ بس پھر گھر
محفوظ ہے۔“

پھر وہی گمان کہ جیسے دروازے پر کوئی ہے جیسے کسی نے گھنٹی بجانی ہے میں نے
چائے پیتے سامنے بیٹھی زبیدہ پر ایک نظر ڈالی۔ اسے دیکھ کر تو نہیں لگتا تھا کہ اس نے
کچھ سنا ہے۔ زبیدہ اونچا سنتے لگی ہے یا سنی ان سنی کر دیتی ہے۔ خیر میں زیادہ اس سوال سے
نہیں الجھا۔ سو چاکہ اٹھ کر دیکھ ہی لو۔ کیا جھر ہے کوئی ہو۔ نہ بھی ہو تو دیکھ لینے میں کیا حرج
ہے۔ کم از کم شک تر فتح ہو جائے گا۔ کل کی ستارہ مجھے یاد تھی۔ ایک ذرا سی الگاہت
کی وجہ سے کتنے شکوں میں گرفتار ہو گیا تھا۔ چلتے یچ میں چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔
”اخلاق یہ تھماری کیا بُری عادت ہے کہ چلتے یچ میں چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہو۔“
”جَا کہیں نہیں رہا۔ ابھی آتا ہوں۔“

کس تیزی سے میں دروازے پر آیا۔ دہل تو کوئی بھی نہیں تھا۔ کوئی آیا بھی تھا، یا
محض میر دہم تھا۔ اگر آیا تھا تو کیا خالی دلیز چھوڑنے آیا تھا۔ گھنٹی بجانی اور چھوڑ ہو گیا۔ محض اپنے
المیناں کے لیے میں نے دروازے ہے نکل کر یچ گلی میں کھڑے ہو کر اس کی آخری حد
سمک نظر ڈالی۔ گلی یہاں سے وہاں تک خالی۔ مگر جب مرڑ کر اندر جانے رکا تو میں نے گلی کے
آخری کنارے پر ایک ہیولی دیکھا جیسے کوئی گلی سے نکل کر مرڑ پر مرڑ گیا ہے۔ دیکھایا ایسا

لگا کہ دیکھا ہے فیصلہ نہیں کر پایا کہ سچ پچ کسی کو دیکھا تھا یا شک ہوا تھا۔ موجا کہ آگے بڑھ کر دیکھے یتے ہیں۔ تیز تیز قدم اٹھاتا گئی سے نکلا اور مرٹک پہ ہولیا۔ مرٹک پہ نظر دوڑائی کہ کہاں گیا وہ۔ چند قدم کے فاصلے پر پان گریٹ کی دکان کے سامنے سے گذرتے ہوئے دیکھا کہ دہاں ایک شخص اطمینان سے کھڑا کوکا کولا پی رہا ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے۔ یا ممکن ہے مجھے نہ دیکھ رہا ہو کہ میرا اسکس ہو کر دہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ دہ بھر کے لیے مجھے خیال آیا کہ کہیں بھی تو وہ آدمی نہیں ہے۔ اس خیال کے ساتھ میں مرٹک کراحتیاں سے اس کا جائزہ لیتا چاہتا تھا مگر میں نے سوچا کہ اسے جو پر ایسا کوئی شک نہیں ہونا چاہیے کہ میں نے اسے شناخت کر لیا ہے۔ تھوڑا آگے جا کر داپس آڈل گا اور سادگی سے لیے جیے کوئی بات سی نہیں ہے اس پر نظر ڈاول گا۔ اگر وہی ہے تو میں اسے کسی نہ کسی طور تاثر لوں گا۔ لیکن ابھی میں چند قدم بڑھا تھا کہ میں نے دیکھا کہ میرے آگے ایک چورا چکلا آدمی لمبے لمبے ڈگ بہتر ہوا جا رہا ہے جیسے اسے اندیشہ ہو کہ اس نے چال سست کی تاز میں لسے جاؤں گا۔ میں نے فوراً ہی اپنی چال تیز کر دی لیکن وہ تو اتنے لمبے ڈگ بھر رہا تھا کہ میری چال میں تیزی آجائے کے باوجود میرے اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ آگے چورا ہا نہیں۔ چورا ہے پر میرے پہنچتے پہنچتے وہ مرٹک کو عبور کر چکاتا۔ اور بتی سرخ ہو چکی تھی۔ مجھے ٹھہرنا پڑا۔ بتی کارنگ بدلتے ہی میں نے تیزی سے مرٹک کو عبور کیا اور زگاہ دوڑائی کہ وہ کہیں نظر دیں سے او جمل نہ ہو جائے۔ مگر یہاں مرٹک پر آنا نجت تھا کہ خدا کی پناہ۔ گھٹاتھا کہ جیسے کئی حادثہ ہو گیا ہے یا کوئی مجرم پچڑا گیا ہے۔ میں حیران کہ یا اللہ اس مرٹک پر آج اتنی خلقت کہاں سے امنہ پڑی۔ یہ مصروف سڑگ بے شک تھی مگر اتنی بھیر تو یہاں نہیں ہوا کرتی تھی۔ مگر میں یہ جانے کے لیے کہ ہوا کیا ہے، رک نہیں سکتا تھا۔ یہ جو فکر تھی کہ کہیں وہ آنکھوں سے او جمل نہ ہو جائے۔

بھیر بھیر کا پیچھے رہ گیا۔ اب مرٹک خالی اور خاموش تھی۔ خاموش سی خاموش جیسے

ہو کا عالم ہو۔ بس جیسے میں خالی ڈھنڈار کی بستی میں چل رہا ہوں۔ مگر وہ کہاں گیا۔ دُور دُور تک نظر درڈاتی۔ وہ تو کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کیا، وہاں تو چڑیا کا بچہ بھی نہیں تھا۔ سرکے پہٹ کر ایک گلی میں مڑ گیا۔ بس شک ساتھا کہ وہ میری نظر وہ سے پچھے کی نفر من سے کسی گلی میں مڑا ہے۔ ایک گلی سے دوسرا گلی میں، دوسرا گلی سے تیسرا گلی میں۔ ہر گلی خلی ہر گلی خاموش۔ میں جیران کہ یہ گلیاں تو میری دلکھی بھالی میں۔ اتنی اجنبی گیوں نظر آ رہی ہیں، اور انہی بے آباد کپوں دکھائی دے رہی ہیں۔

کتنی مرتبہ اپنے ہی قدموں کی چاپ پر چونا کا۔ کتنی مرتبہ شک، ہوا کہ کتنی دبے پاؤں میرے پیچے آ رہے۔ مگر کون؟ میں اس کا پیچھا کر رہا ہوں۔ وہ میرا پیچھا کیوں کرے گا۔ مگر کیا خبر ہے؟

شک ہار کر واپس ہو یا۔ اپنے گیٹ میں قدم رکھا تو سامنے برآمدے میں کوئی بیکھانظر آیا۔ وہ یا کوئی اور۔ بہرحال کوئی اجنبی تھا۔ خجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ علیک سدیک ہوئی۔

”فرمایئے۔“

”میں نے سنا ہے کہ آپ اپنا مکان پیچنا چلا ہتے ہیں؟“

”جی۔“ میں چکر لاس گیا۔

”جی بات یہ ہے کہ میں پر اپنی ڈلیہ ہوں۔“ ذرا اس نے اپنی حیثیت کی دعا صحت کی۔ میں نے آج آپ کو فتر میں بھی فون کیا تھا۔ دو مرتبہ فون کیا اور دونوں مرتبہ آپ نہیں ملے۔“

نجھے یاد آیا کہ چپراسی نے مجھے بتایا تھا کہ کسی نے آپ کو فون کیا تھا۔ میں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ یہ سوچ کر ہو گا کوئی؟ اب کون ایسا فون کرنے والا ہے جس کے لیے میں تردید کر دیں۔ اچانک ایک خیال بھلی کی طرح میرے ذہن میں آیا：“اچھا اس سے پہلے بھی آپ بیاں لکھئے تھے۔“

”جی۔ اب پر اپنی ڈیکر کے سپنانے کی باری تھی۔“

”میرا مطلب ہے کہ آپ کل بھی آئے تھے اور انہی تھوڑی دیر پہنچے۔“

”نہیں۔“ وہ چکر اسکیا۔

”اچھا کمال ہے۔ وہ آپ نہیں تھے۔ پھر کون تھا؟“ میں یہ کہتے کہتے ایک مرتبہ پھر سوچ میں پڑ گیا۔

غمہ شاید اس شخص کو اس کا احساس نہیں ہوا۔ سارگی سے بولا: ”وہ کوئی اور ہو گا۔

مجھے تو آج ہی پتہ چلا تھا کہ آپ مکان نیچ رہے ہیں پس میں نے دفتر میں آپ سے رابطہ پیدا کرنے کی گوشش کی۔ وہاں نہیں ہو سکتا تو ہمایاں حاضر ہو گیا۔ اندر سے جواب آیا کہ آپ دفتر سے تو آگئے ہیں، ہمیں کہیں ہیں۔ میں نے سوچا تھوڑا انتظار کر لیا جاتے۔

”آپ کو کسی نے خطا اٹلاع دی ہے کہ میں مکان نیچ رہا ہوں۔“

”اچھا؛ پھر تو مجھے آپ سے معمولت کرنی چاہیے کہ خواہ مخواہ میں نے آپ کا وقت پیا۔“
”کوئی بات نہیں۔“

وہ تو چدا گیا مگر میں صیران تھا کہ کل ہی تو گھر میں یہ بات ہوئی ہے۔ پر اپنی ڈیکر کے کاموں یہ کسی سے پہنچ گئی۔ میں نے زبیدہ سے پوچھا: ”پر اپنی ڈیکر کو کس نے اٹلاع دی تھی کرم مکان نیچ رہے ہیں۔“

”پر اپنی ڈیکر کو؟ . . . اچھا۔ . . . تعجب ہے۔ . . . وہ آدمی کون تھا؟“

”پر اپنی ڈیکر تھا۔ تم نے کسی سے ذکر کیا ہو گا؟“

”کسی سے نہیں۔ کل گھر ہی میں یہ بت ہوئی تھی۔ کیا کہتا تھا وہ؟“

”پوچھنے آیا تھا کہ آپ مکان نیچ رہے ہیں۔ نہیں بلکہ اس اعتماد کے ساتھ آیا تھا کہ یہ مکان پکنے لگا ہے اور اسے اس کا سوداگر نا ہے۔“

”دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔ ہم مکان ایسے تھوڑا ہی نیچ دیں گے، آنکھیں بند کے۔“

پھر کیا کہا تھا نے؟"

"میں نے کہہ دیا کہ تمہیں خطا خلاع ملی ہے۔"

"اچھا کیا؟" - پھر رک کر بولی۔ "مگر ذرا مشتعل تو سی کہ کیا کہتا ہے؟"

"جب تھیں گھر بیچنا ہی نہیں ہے تو اس سے ٹوٹنے اور بات کو آگے بڑھانے کی کیمپ تھی؟"

"ذرا پتہ تو چلتا کہ وہ کیا قیمت لگاتا ہے؟"

"کسی باتیں کرتی ہوں۔ پر اپنی ڈالر سے بات کر کے تو آدمی بھیں جاتا ہے تو نہیں جانتیں۔ میں اس مخلوق کو خوب سمجھتا ہوں۔ یہ مخلوق تو وہ ہے کہ ایک مرتبہ مردست میں بھی اس سے بات کرو تو وہ لیس ہو جاتی ہے۔"

میں نے یہ بات یونہی تھوڑا ہی کھی تھی۔ میرے ساتھ گندہ چکی تھی۔ یہ تب کا واقعہ ہے جب میرے پاس گاڑی تھی۔ عجیب کھٹ بگڑی گاڑی تھی۔ چلتے چلتے بلا سبب اُڑ کر کھڑی ہو جاتی۔ پھر میں جس تسلسلہ میکھتا۔ گندہ رقی ہونی میکھیوں کو رکنے کے اشارے سے کرتا۔ کوئی اللہ کا بنہ نہ کسی والا حرم کا کٹھی رکتا۔ گاڑی کھول کر اس کے کل پُرنس سے دیکھتا جاتا، اور مت کرتا اور پھر میں وہاں سے چلنے کے قابل ہوتا۔ ایک روز جب سخت دوپھر تھی اور میں مردگ کے کنارے پسینہ میں شرایور کھڑا تھا تو ایک میکھی دلے نے میری گاڑی کے ڈائینو کا جائز ملیتے لیتے کہا:

"صلب، آپ کس گاڑی کو سچ ہی ڈالیں۔ نئی خرید لیں۔ آج ہمکہ شرایور کا نیا ماڈل آیا ہو ہے بہت اچھی گاڑی ہے۔"

جواب میں میں نے پیش کی اور گردن سے پسینہ پوچھا اور ہوں، کہ کہ کر چپ ہو رہا۔ دل میں کہا کہ کہتا تھے ہے گرلاتے یہ پتہ نہیں کہ میں اس گاڑی کے ساتھ اپنے آپ کو سچ ڈالوں تو شرایور خریدنے کی استعداد پیدا نہیں کر سکتا۔

تیرے دن ایک شخص جسے میں بالکل نہیں جانتا تھا موفر میرے پاس آیا اور کہنے لگا: "میرے پاس آپ کی گاڑی کے لیے ایک گاہک ہے۔ محقق اسی ہے۔ آپ کو اچھے پیے مل جائیں گے۔"

میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا:

"آپ کون صاحب ہیں؟"

"میں بس یہی موڑوں میں ڈیل کرتا ہوں۔ آپ مجھے نہیں جانتے مگر میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ جس درکش اپ سے اپنی گاڑی بھیک کرتے ہیں اس کا اہک میرا جانے والے ہے بہت آپ کی تعریف کرتا ہے۔"

"وہ تو بھیک ہے مگر فی الحال تو میں اس گاڑی کو بیچنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔" "اچھا۔ وہ چپ ہوا۔ پھر لونا: خیر جب بھی آپ کا ارادہ ہو آپ مجھ سے بات کریں۔ میں آپ کا اچھا سودا کراؤں گا۔" یہ کہتے کہتے اس نے جیب سے اپنا تعارفی کارڈ نکالا اور مجھے پکڑ کر جدا گیا۔

ایک ڈیڑھ نیٹنے بعد پھر آن دھکا۔ اب ذیادہ اعتقاد سے ملا: "تو آپ نے فیصلہ کر لیا گاڑی بیچنے کا؟"

"مکون کہتا ہے۔ میں نے تو کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا۔"

"اچھا کمال ہے۔ میں نے تو یہی سناتا ہے۔"

"کس سے سنتا تھا؟"

اس سوال کو دو گول کر گیا۔ ذہن دینے کی معذرت کی اور چلا گیا۔

ڈیڑھ دنیٹنے بعد پھر آیا۔ اب کے تو بستہ ہی بے تکلفی سے ملا جیسے برسوں کی آشنا تھی۔ میں نے چائے کے لیے پوچھا۔ بولا:

"کوئی مسئلہ نہیں۔"

ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ کاروں کے نئے مادلوں کی تفصیل بتاتا رہا۔ پوچھنے لگا:

”آپ کے پاس یہ گاڑی کب سے ہے؟“

”یہی دو تین سال سے۔“

”اچھا۔ دو تین سال میں اس کا یہ حال ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں آپ نے کس کے ذریعے نیز سودا کیا تھا۔ مجوہ سٹاپ کی ملاقات ہو گئی ہوتی تو میں آپ کو اچھی گاڑی دلاتا۔ آپ کے قریب ہی سیٹ لائٹ کا دفتر ہے وہاں صدیقی صاحب ہوتے ہیں۔ انہیں میں نے اب سے چھ سال پہلے فوکس دیگن دلائی تھی۔ بالکل کوڑیوں کے مول۔ صاحب آج تک اس گاڑی نے درکشاپ کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ صدیقی صاحب میرے نام کا لکھ پڑھتے ہیں؟“

”سکینہ ہینڈ گاڑی اور درکشاپ نہ جلتے۔ تعجب ہے؟“

”جناب یہی تو اپنا کمال ہے۔ جب بھی آپ کا ارادہ بنے آپ مجھ سے بات کریں۔“

ویسے آپ کا ماذل بہت پرانا ہو گیا ہے۔ اسے زکال ہی ڈالیں۔ اس وقت زکال دین گئے تو اچھے پیسے مل جائیں گے۔ تھوڑے دن کے بعد اسے کوئی مانشو نہیں لگائے گا۔

وہ کھوارتا۔ میں سنتا رہا۔ ماں ناں میں کوئی جواب نہیں دید۔ اس نے بھی میرا دل جاننے کے بارے میں کوئی تردید نہیں دکھایا۔ چائے پی، ہاتھ طایا اور رخصت ہو گیا۔

عینہ نہیں گذرا تھا کہ ایک گاہک کو ساتھ لے کر آگیا:

”انہیں آپ ذرا اپنی گاڑی دکھادیں۔“

”کس سدد میں؟“

”بس دکھادیں۔“

”میں گاڑی پہنچ تو نہیں رہا۔“

”تعینے کو کون کہہ رہا ہے۔ مگر میں انہیں اپنی گاڑی دکھانا چاہتا ہوں۔“

میں کسی قدر تماں کے ساتھ اپنی سیٹ سے اٹھا اور دفتر سے باہر آ کر انہیں اپنی

گاڑی کے پس لاکھڑا کیا۔ اس شخص نے اس نوادرد کو گاڑی بہت تفصیل سے دکھانی تعریف کی، زور اس پر دیا کہ گاڑی کا بخن بالکل درست حالت میں ہے اور اصل چیز تو بخن ہوتا ہے۔

یہ ساری بتیں کے اس نے تجھے چاہیا نہ میں، ارخصت کے لیے باختہ طایا پھر نوادر سے کہا: ”آئیں چلتے ہیں۔“

جلتے جاتے میرے کان میں کھر گیا: پسیے دالی اسماں ہے۔ اسے گنوانا نہیں ہے۔ میں نے تو مردت میں گاڑی دکھادی تھی۔ مگر آدمی ایک دفعہ مردت میں آجائے تو پھر آنا چلا جاتا ہے۔ اس کا ردیلہ نے مردت ہی مردت میں مجھ سے فرد خست کے سارے مراحل طے کر لئے اور اس خوش اسلوبی سے کہ آخر وقت تک مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ گاڑی کا سودا ہو رہا ہے۔

”پھر تو اچھا کیا تم نے اسے صاف جواب دے دیا لیکن اگر کسی بھداہ تمہارے تیکھے آجائے تو میں کیا کہوں۔“ زبیدہ نے ایک نیا سوال اٹھا دیا۔

میرے تیکھے آجائے۔ میں چونک پڑا۔ ایک مرتبہ پھر سویا، ہوا شک میرے اندر جا گا کہ کہیں یہی تو وہ آدمی نہیں ہے جو..... کیا یہ آدمی کسی بھی پہنچی آیا تھا؟“

”نہیں۔ لس تجھے یونہی خیال آیا کہ اگر اسے بخیال ہے کہ ہم آشیانہ زیع رہے ہیں تو یہ نہ ہو کہ روز آن کھڑا ہو۔“

”کیسے آن کھڑا ہوگا۔ لس اسے منہ نہیں گانا ہے۔“

زبیدہ نے تال کیا۔ پھر لوٹی:

”بل اگر ہم آشیانہ نہیں زیع رہے ہیں تو پھر تو اسے منہ نہیں گانا چاہیے۔ لیکن اگر زیع رہے ہیں تو....“

پتھر نہیں زبیدہ کیا کہنا چاہتی تھی، میں نے زیع ہی میں بات کاٹ دی:

ہے۔ نہیں۔ ہم نہیں نیچر ہے۔ اس شخص کو بالکل من نہیں گذا

۱۱

کتنے دنوں سے وہ مجھے یاد نہیں آئی تھی۔ لبس جیسے دل و دماغ سے بسرگئی ہو۔
ہر جذبے کی ایک عمر ہوتی ہے، محبت کے جذبے کی بھی۔ اور ہر جذبہ کسی نہ کسی
صارے پر درش پاتا ہے۔ جذبے خلامیں تو پرداں نہیں چڑھا کرتے۔ آپس میں
کچھ ہوتا ہے بڑا یا بھلا تب ہی جذبے کو تقویت ملتی ہے۔ مگر یہاں تو بس دُور سے آتی
ہوتی ایک شیرین آواز نے آن پکڑا تھا۔ پھر وہ آواز بھی غائب ہو گئی۔ آواز کا جادو کب
تک چلتا۔ جب تک اس کے سحر میں رہا اسے ڈھونڈتا رہا، مفترب پھرنا پھرا۔
”یارِ ممتاز، کیا کیا جلتے۔ وہ تو جھوپ ہو گئی۔“

”تم تو کہہ رہے تھے کہ تم نے اس کا پتہ معلوم کر دیا ہے۔“

”ماں۔ وہ تو معلوم کر دیا تھا۔ بینک میں کام کرتی ہے۔ میں نے بینک میں جاگر
معلوم کیا۔ پتہ چلا کہ دہال سے ٹرانسفر ہو گیا ہے جس براپے میں ٹرانسفر ہوا تھا اس کا
پتہ لیا۔ دہال پہنچا۔ پتہ چلا کہ لانگ ٹنپر ہے۔ میں نے اس کے گھر کا پتہ معلوم کیا۔
مگر یہ دفتر کے لوگ بہت کیسے ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں وہ کیا سمجھے۔ آئیں باس شایی
کر کے ٹال دیا۔ گھر کا پتہ نہیں تباہیا۔“

”یارِ نصویر! اسپر کرو۔ جانا کہاں ہے اسے۔ پوختم کرنے کے بعد تو آئے گی۔“
کتنا صبر کرنا چند دن بعد پھر بینک کا پھر اگلا یا پھر وقفہ وقفہ سے کتنے پھرے

پھر ہونے لگا کہ میں نے بینک میں قدم رکھا اور ایک نے درسے کو ادھر سے نے
تیرے کو اشارہ کیا اور سب کی نظر میں مجھ پر، جیسے مجھے دیکھ کر مخفوظ ہو رہے ہیں۔
کیا کرتا، سینہ پر صبہ کا پھر رکھا اور اوہر کا پھر انگکھوڑ دیا۔ اور یوں بھی تو موتا
ہے کہ آدمی ایک دفعہ صبر کر لے تو پھر صبر آتا چلا جاتا ہے اور شوقِ رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑ جاتا
ہے۔ میرے ساتھ بھی ہوا۔ کہاں ہر دمک دل و دلخ میں بھی رہتی تھی کہاں اب کتنے کتنے
دنوں تک اس کا خیال ہی نہیں آتا تھا۔ خیال آتا بھی تو کسی جذبے با تی، سیجان کے بغیر۔
کسی بھی بھولی بسری باتوں کے ساتھ اس کا بھی خیال آ جاتا۔ اور میں کتنے بے تعلقی
سے اپنے اس جذبے با تی طوفان کو یاد کرتا اس احساس کے ساتھ کہ ایک آندھی تھی جو
آئی اور گذر گئی۔

تو میں تو اپنی دانست میں اس کے سحر سے نکل آیا تھا۔ کتنے دنوں سے وہ مجھے
باکل باد نہیں آئی تھی۔ لیس اچا بکہ اس کے خیال نے مجھ پر شخوں ہارا۔ میں اس شام
گھومتا پھر ترا آرٹ سنٹر میں جانکھ جہاں تصویروں کی ایک نمائش کا افتتاح ہو رہا تھا۔
میں اس وقت آرٹ گیدری کی بالائی منزل میں تھا۔ تیسرے فلور پر۔ تصویروں کے سامنے
سے گزرتے گزرتے یوں ہی بے ارادہ میں نے تنچے کے فلور پر نظر ڈالی اور ایک دم
سے شنیک گپا۔ اسے یہ تو دیکھا ہے۔ میں تیزی سے پٹا اور سیرھیاں اتر نے لگا کتنی
تیزی سے میں سیرھیاں اتر رہا تھا مگر سیرھیاں تھیں کو ختم ہونے میں نہیں آرہی تھیں۔
زینیہ اکیم سے پچھنچ کر کتنا لمبا ہو گیا تھا۔ مگر میری ٹانگوں میں بھی اس آن بھلی پھر کی تھی
سیرھیاں اتر رہا تھا کہ زندہ میں بھر رہا تھا۔ ابھی سیرھیوں پر تھا کہ اچانک ایک اور پھر
سامنے آگیا۔ میں شنیک کر کھڑا ہو گیا:

”شیریں تم؟“

وہ بھی شاید مجھے دیکھ کر شکی تھی۔ مگر فوراً ہی سنبھل گئی۔

”اس میں اتنے تعجب کی کوئی بات ہے؟“

”میرا مطلب ہے کہ کب آئیں۔ اپنے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی۔ آنے کے بعد تو اطلاع دی ہوتی۔“

”جلواب اطلاع ہو گئی۔“

”کہاں تھی ہوتی ہو؟“

اس نے میر سے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسری ہی بات کی:

”تم تیزی میں کہیں جا رہے تھے۔ میں نے زیچ میں تمہیں روک لیا۔“

میں تو اسے دیکھ کر سب کچھ عجول گیا تھا۔ اس کے یاد دلانے پر یاد آیا:

”ہاں۔ ایک دوست تھے۔ کوئی بات نہیں۔ وہ انتظار کر لیں گے۔“

”نہیں۔ ان سے مل لو۔“

”اچھاٹھیک ہے۔ تم اوپر جا رہی ہونا۔ تھویر میں دیکھو۔ میں ان سے بات کر کے اچھی آیا۔ پھر باقی ہوں گی۔“

میں عجلت سے بنچے آیا۔ گراڈ فلور پر اس وقت بہت چیل پل خی کتی اچھی اچھی صورتیں امندی ہوئی تھیں۔ مگر وہ کہاں کہی۔ گھوم پھر کر دیکھا۔ ہر گھشتے میں جا کر ڈول کہیں نہیں نظر آتی۔ میں حیران کر اتنی سی دیر میں وہ کہاں چھو ہو گئی۔

پک کر کاڑ نشیپہ گیا اور گلداری کے انچارچ سے پوچھا:

”معاف کیجیے۔ یہاں ذکریہ احمد تھیں کہ ہر چھل کیں؟“

”ذکریہ احمد؟ انچارچ نے ذہن پر زور ڈالا۔ معاف کیجیے میں ان سے شناختیں دیں۔“ کچھ لوگ چلتے کی طرف گئے ہیں۔ جن محدثہ کو آپ تلاش کر رہے ہیں شاید وہ دہاں ہوں۔“

تیزی کے اس گھشتے میں گیجاں چلتے کا اہتمام تھا۔ چلتے پتی خواتین میں سے

ایک ایک کی صورت دیکھی۔ جو میری طرف پشت کیے کھڑی تھیں بہانے سامنے جا کر ان کی شکلیں دیکھیں۔ کوئی کوئی پشت اتنی جاذب نظر نہیں کہ گماں ہوا کہ شاید وہی ہے۔ کس عجلت میں سامنے جا کر اس کی صورت دیکھی کہ میں خود ہی اپنے اس انکھڑیں پر شرمende ہو گیا:

جب یعنیں ہو گیا کہ وہ اس گوشہ میں نہیں ہے تو پھر میں پک کر پاہر آیا۔ اور اُدھر پہلے ہوئے میزہ زاروں میں اور خوشگوار دشون پر جہاں آرٹ کی ولادوہ خواتین اپنی گہلی پھر رہی تھیں، نظر دڑائی۔ وہ یہاں بھی نہیں تھی۔ لمبے لمبے دگ بھر کر گیٹ تک گیا کہ شاید والپس جا رہی ہو۔ گیٹ سے باہر بھی نظر ڈالی۔ وہ کہیں نہیں تھی۔

سب ٹلنٹ سے مایوس ہو کر میں نے سوچا کہ اب کیا کیا جائے۔ اسے ہاں شیریں میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ والپس اندر گیا۔ گراڈنڈ فلور سے دوسرے فلور پر۔ دوسرا سے تیسرا فلور پر۔ کہاں گئی وہ؟ سوچا کہ شاید میرا انتظار دیکھ کر تپخچے چلی گئی ہو۔ والپس پھر گراڈنڈ فلور پر آیا۔ اور اب کے یہاں کا زیادہ تفصیل سے جائزہ یا نظر نہیں آئی۔ تو گویا وہ چلی گئی۔ میں اس کے اس رویتے پر حیران ہوا، اور افسردا بھی کہ ایک زمانے کے بعد ملی مگر کتنے روکھے پن کے ساتھ کہ ذرا میرا اتنی رسمی نہیں کیا۔ شیریں تو بالکل ہی بدلتی میں نے سوچا اور میرا دل میٹھا گیا۔ اسے دیکھ کر میں کتنا خوش ہوا اور اب کتنا مول ہوا تھا۔

”بوجان۔ ایک خبر سناؤ۔ شیریں آئی ہے۔“

”شیریں؟“ بوجان نے تعجب سے مجھے دیکھا۔

”ہاں شیریں۔ میں آرٹ سنسٹر تھیریوں کی نمائش پر گیتا تھا وہاں اچانک اس سے شہبیڑا گئی۔“

”اچھا؟ پھر کمال ہے وہ؟“

”بوجان۔ اس نے کمال کیا۔ باہمی کرتے کرتے میں ذرا تصویریں دیکھنے لگا۔ وہ

نظر دل سے ایسی ادھر جملہ ہوئی کہ پھر نظر ہی نہیں آئی۔
اے لو۔ وہ چھلا وہ تھی کہ غائب ہو گئی۔

بوجان میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ میں خاصی دیر وہاں رہا کہ شاید بھیں کہیں ہو۔ سب لوگ چلے گئے ہیں تب میں وہاں سے نکلا ہوں۔ اس نے کمال ہی کر دیا۔

آخر کس باپ کی بیٹی ہے۔ خدا بخشنے تمہارے ہجاتھی ایسے ہی بے مردت تھے۔ علی گڑھ میں جا کر ایسے بے کہ پھر مرنے جیتنے کے تو قتوں پر ہی ان کی صورت نظر آئی تھی اور اب تو قدر ہی دوسرا ہے۔ تو کہاں میں کہاں؟ چپ ہو میں پھر افسردگی سے بولیں۔ اس نجورڑی، ہجرت نے تو خون کے رشتے ٹکٹک ختم کر دیے۔

پھر چپ ہو گئیں۔ کتنا دیر تک چپ رہیں پھر بولیں:

بیٹے، اس کا پتہ کرو اس رڑک کی آنکھ میں تو سور کا بال ہے مگر ہمارا خون توابی سیند نہیں ہوا ہے۔

بوجان کی ان باتوں پر میرے نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ ظاہر بھیں توابیے بنار پا جیئے میں نے شیر میں کی اس حرکت کو سرسری لیا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اندر سے میں بہت مضطرب تھا۔ یوں جلدی ہی سونے کے لیے جائیشا لیکن رات گئے ہنک کرو میں بدلتا رہا۔ رہ رہ کے خیال آتا کہ شیر میں نے یہ کیا کیا؟ صورت دکھ کے کسی غائب ہوئی؟ واقعی وہ تو چھلا وہ بن گئی۔ کیوں ایسا کیا، کیوں پڑا کر بیک سوچ میں پڑ گیا۔ سو سو طرف دھیان گیا۔ بس اسی میں وہ گھڑی یا داگنگی جبا سے چھوڑ کر میں مپنچے اتراتھا اور کس عجلت کے ساتھ گہاونڈ فلور پر پہنچا تھا اور اسے نہ پا کر کا دشڑپہ جا کر اپنارچ سے ذکر یہ کے متعلق استشار کیا تھا۔ اور اچانک میرے دماغ میں یہ بات آئی کہ شاید اس نے میری بات سن لی تھی۔ شاید وہ میرے اتنے کے بعد وہیں سڑھیوں پر کھڑی دیکھتی رہی تھی کہ میں کیا کر رہا ہوں، کسے ڈھونڈ رہا ہوں؟ اس خیال نے تو میری سٹی گم کر دی۔ واقعی؟ کیا واقعی وہ بجنپ گئی تھی؟

کیا اس نے سن پاتھا؟ بچھڑ تو غصب جو گیا۔ شیر میں بعد معاف کرے گی۔ جب اس نے اس وقت معاف نہ کیا تو اب کیسے معاف کر دے گی؟ اس وقت تو حرف تک نتھا اور اب تو.... لب اس کے ساتھ ہی مجھے وہ واقعہ یاد آگیا اور وہ وقت جب میں واقعی میں نتھا اب کی طرح تھوڑا ہی کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ میں ہوں۔ آدمی بھی کس طرح وقت کے ساتھ اپنے آپ کو گزرا آکھوتا چلا جاتا ہے۔ اور حالات و واقعات کی جانے دیجئے جو اس کی ہمراستے کتنا خراب کرنی چلی جاتی ہے کہ وہ بچر وہ رہتا ہی نہیں۔ میں اس وقت جو تھا وہ میرے تصور میں گھوم گیا۔ اس زمانے کا اخلاق حسن متعلم علی گڑھ لو نیو ریٹی، کہ اب اس کے لیے وہ واحد غالب کے صیفی میں تھا۔ اپنے گھنے کالے بالوں اور لکھن شیر کے ساتھ یا شیر دانی میں محسوس۔ وہ ان دنوں اس دنیا میں تھا جو اپنی سیاہ چست شیر دانیوں اور سیاہ بر قلعوں کے ساتھ اگئے پہچانی جاتی تھی۔ ہر سیاہ بر قلعہ اس کے لیے ایک بھینڈ تھا۔ ہر سیاہ بر قلعہ کو دیکھ کر تھس میں پڑ جاتا کہ اس کے بیچ کونسا وجہ دھے اور نعاب کے پیچھے کہا جھوڑ ہے۔ نقاب پڑی رہتی پھر بھی کسی نہ کسی طور ایک جدک دکھائی دے ہی جاتی، کبھی گورے گال کا شکارا، کبھی روشن آنکھوں کا ایک آن کا درشن۔ بہر حال ایک چھوڑ توبے نقاب تھا کہ آنکھوں میں سما تا دل میں اترنا چلا جا رہا تھا۔ اب وہ چرانغ حولی کی فضائے نکلنے کے ایک نئی فضا مکمل رہے تھے۔ ایک نئے جذبے کے ساتھ۔ اس نے جذبے کے اثر میں آ کر انہیں پیں گردہ نخاکہ جیسے وہ پہلی مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھا اور جانے ہیں۔ شروع شروع میں وہ اپنی انگریزی سخوار نے کے لیے پورا پورا ناول اکٹھے پڑھ دلتے تھے۔ ناول کے ہیر دہیر و ن ان سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ کبھی کیش کی بھی شیئے کی نظم پڑھتے پڑھتے دفعاً جمیک جاتے۔ پھر نظم اپنی جگہ پہ رہ جاتی اور وہ کسی اور بھی فضائیں پسند نہ جاتے۔ ان کے درمیان ایک نئی جمیک اور ایک نئی بے تکلفی جمیک لے رہی تھی۔ ایک نیا انجام اپنے، ایک نئی جانکاری۔

دھیرے دھیرے کر کے دہ ایک دوسرے کے کتنے قریب آگئے تھے مگر کتنی تیزی سے
وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ دلوں کے قریب آنے میں کتنا وقت لگتا ہے پر جدائی کتنی
جلدی ہو جاتی ہے۔ بس ایک شک کی اہمیٰ اور دلوں میں فرق پیدا کرنی چلی گئی۔

شیرین اس جگہ تمہاری رابعہ نہیں کرہی؟“

شیرین ایکہ اچھو کرنی ہو گئی۔ اسے غور سے دیکھا: ”میری رابعہ... بکیوں نہیں
اس کا انتظار تھا؟“

وہ پڑا گیا۔ نہیں۔ میں نے تو یونہی پوچھ دیا تھا۔ تمہارے پاس روزانہ جو
آپکرتی تھی؟“

”تو تم اس ٹوہ میں رہا کرتے تھے کہ وہ کب یہاں آتی ہے اور کب جاتی ہے؟“
اس نے بڑی مشکل سے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے ایک راستہ نکالا: ”میں تو
صرف اس لیے پوچھتا تھا کہ اس نے مجھ سے شکریہ کے فوٹس مانگتے تھے۔ میں نے سوچا
تمہاری سیلی ہے ہلبو اس کی ہمیلپ کیجئے دیتے ہیں۔“

”ہوں۔ یہ کب کی بات ہے۔ میرے سامنے تو یہ بات ہوئی نہیں تھی۔ میرے پیچے
ہوئی ہو گئی۔ اور کیا باتیں ہوئی تھیں؟“ شیرین کا شک اور تقویت پکڑا گیا اور وہ میز پر
المحجو گیا۔

وہ ایک بات کر کر پکڑا گیا۔ شیرین نے تو باقاعدہ جرح شروع کر دی۔ اس جرح میں
اس کا دہی حال ہوا جو عدالتی جرح میں ایک ناظر پہنچا کر ملزا کا ہوتا ہے۔ شیرین کا شک بڑھتا
چلا گیا، اس کے ساتھ ساتھ پارہ بھی چڑھتا چلا گیا۔ پہلے وہ غصے سے آگ بچک دلا ہوئی پاچھر
سکیاں لے کر رونے لگی۔ بس اسی جوشی گریہ میں اس نے ماں کے سامنے یہ مقدمہ
پیش کر دیا:

”امی یہ اخلاق میری سیلیوں سے اکیلے میں کیوں باتیں کرتا ہے؟“

اور آن کی آن میں اس گھر میں اس کا چال چین سٹ کو کٹھر گی۔ لب اس کے ساتھ ہی دونوں کی ملگئی کی جو بات چل رہی تھی، دونیوں پر ہی میں ختم ہو گئی۔

”اخلاق، تم ابھی جاگ رہے ہو؟“

”ہوں۔ ایک دم سے واحد غائب کے صیغہ سے واحد مشکلم کے صیغہ میں۔“ مل نہیں آرہی۔

”تم تو نیتے ہی خڑی لینے لگتے تھے۔ آج تمہیں کیا ہو گیا۔ اتنی دیسے دیکھ رہی ہوں کروں بدلے جا رہے ہو۔“

میں زبیدہ کو کیا بتاتا۔ میں نے اٹا اس سے سوال کر دیا: ”مگر تم بھی ابھی ہمک نہیں سوئی ہو۔“

”محبے تو اس مکان کی فکر کھلٹے جا رہی ہے۔ اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں،“ اس نے سوال دار دیا: ”بھر تم نے کیا سوچ دیے؟“

”کس بارے میں؟“ سوال اتنا اچاہک تھا کہ واقعی میری سمجھدی میں نہیں آپکے زبیدے نے کس بارے میں یہ پوچھا ہے۔

”زبیدہ جسنجھدا گئی۔“

”کونسی بیٹی بیانے کو بیٹھی ہے جس کے بارے میں پوچھوں گی۔ آشیانے کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔“

”آشیانے کے بارے میں.....؟“ میرے لیے زبیدہ کے سوالوں کو سمجھنا اور جواب دینا اس وقت درجرا ہوا جا رہا تھا۔ میں تو کسی اور ہی فضائیں پرداز کر رہا تھا، جہاں دنیا کے پر قصص تھے، ہی نہیں۔ لب شیر میں تھی اور میں تھا۔ میں جو اُس وقت تھا۔ مگر اسی کے ساتھ مجھے تعجب ہوا کہ شیر میں کاترا بھی نہیں کچھ بھی نہیں بکردا۔ مل اس وقت گلڑی کچی تھی، اب پک کر بھر گئی ہے اور زرشش گھٹی ہے۔ واقعی کیا ترشی ترشانی نظر آرہی تھی کہ

ہر خم ہر گولائی نمایاں اور مناسب۔ اور بھری ہوئی اسکی کہ اب چیلکی۔ اور اب مجھے افسوس ہونے لگا کہ اسے نظر پھر کر دیکھا بھی نہیں۔ کسی غائب ہوئی، لیکن جیسے آنکھوں کے آگے بھلی کو نہ کھٹی ہو۔ اور بھر مجھے وہی خیال است ز لگا کہ شاید اسے شک پڑ گیا تھا۔ مگر کمال ہے۔ اتنے برسوں بعد میں اور اسی شک کی طبیعت کے ماتھ۔ شک بھی، میں نے سوچا، کیا فتنہ ہے۔ دودل کتنی مشکلوں سے، کتنے نازک مرحلے طے کر کے قریب آتے ہیں، گھن میں جلتے ہیں جیسے کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ مگر ایک ذرا ساشک آن کی آن میں ساری قربتوں، ساری ملاقاتاں کو اکارت کر دیتا ہے۔

”وہ پاپری ڈیلر تو پھر نہیں ملا؟“

”پاپری ڈیلر؟“ میں چکرا گیا۔ چکرانا ہی تھا۔ میرا دھیان تو کہیں اور بھٹک رہا تھا۔

”میں نے کوئی ہمیلی تو نہیں پورچی ہے۔“ زبیدہ پھر جنجنگلا گئی۔ سیدھی سی بات پوچھی ہے کہ پاپری ڈیلر جو اس دن کیا تھا پھر پا یا نہیں؟“

”نہیں۔“

”ایک درفعہ صورت دکھا کے بخخت کمال دفان ہو گیا۔“

اسی گھری جیل کے پریدار کی آداز آئی۔ ”جائتے رہو۔“ اور تب مجھے اس کے راست واقعی بہتگذر گئی ہے۔

”زبیدہ اب موجود۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ اس مسئلہ پھر بات کریں گے۔“

”میں تو اچھی بھلی سو گئی تھی۔ تمہاری الٹی سیدھی کر دوں نے میری یعنی اچاٹ کر دی۔“

برحال میری بات نے اتر کر اس نے مسئلہ کو ملتوی کیا اور تھوڑی ہی دیر میں خراٹے لینے لگی۔ اور بھر میں شیر میں کئی شہر کے ساتھ آدھا سورج تھا آدھا جاگ رہا تھا۔

۱۲

اُسے دہن، ہوش کی دوا کرو۔ خدا کا خوف کر د۔ مجھ بودھی پہ تھمیں لگاتی تھیں اچھی نہیں لگتیں۔ بھلہ میں کیوں پوت میاں کو سکھاتی پڑھاتی۔ میں ان ماڈل ٹرینس سے نہیں ہوں جو بیٹے ہو کی کنسوٹیاں لیتی پھر تھی ہیں اور میئے کو اکیدا پا کے اس کے کان پھرتی ہیں۔ میں تو جو بات کرتی ہوں عالم آشکارا کرتی ہوں اور جو بات مجھ کا لکھاتی نے کہی تھی تمہارے ہے ہی کے لیے کہی تھی۔ ارسی بی بی مجھے اب اس گھر کو کونسا برتنا ہے۔ قبر میں پاؤں لٹکا بیٹھی ہوں۔ سانس کی ڈوری اب ٹوٹی کہ اب ٹوٹی۔ اس گھر میں تو تھمیں ہی رہنا بنتا ہے۔ دو دھوں نہاد پوت توں چلدو۔ ابھی تو تم دو جنے ہو۔ جب اللہ رکھو پوت ہوں گے اور دلمنوں کی ڈولیاں آئیں گی پھر تھمیں اس گھر کی قدر معلوم ہو گی۔ پھر میری بات کی بھی تھا معلوم ہو گی۔ میے تو تم سیاہ کر د سفید کر د، میں کون دخل دینے والی۔ لیکن جب گھر اجڑنے کے سامان ہوں تو منہ میں تالا دال کے کیسے بیٹھو جاؤں۔ اور دنیا تم دنوں کو تو پہ کہہ کے بخشن دے گی کہ ناجربہ کار تھے، مغل پر پردہ پڑ گیا تھا۔ مگر میرے منہ میں گو دے گی کہ بڑیل سفید چونڈا لیے بیٹھی رہی اور بیٹے کے گھر کی نیلامی کو ٹکر دیکھتی رہی تو مجھے سمجھانا تھا سمجھا دیا۔ باقی تھمیں اختیار ہے۔ تمہاری چیز ہے۔ تم ہی نے بنایا تم ہی اسے اچھا ڈو۔ بولنے بولنے بوجان مجھ سے مقابلہ ہو میں: ”میرے لال، تمہارا گھر ہے۔ میں کون ہوتی ہوں بولنے والی۔ یا چو، نیلام کر د۔ کسی کو بخشن دو مگر تھوڑا انتظار کر لو۔ میں جس

آخری دمول پہ ہوں۔ یہ حسرت پوری ہو جانے دو کہ جنازہ اپنی ڈیلوڑھی سے نکلے۔ بوجان نے تواہجھی خاصی تقدیر کر ڈالی۔ زبیدہ چپ۔ میں بھی بالکل چپ رہا۔ پس پوچھو تو زبیدہ کی باتوں سے میں اپنے اس ارادے سے میں کہ مکان کو یہی نہیں ہے، کچھ ڈانوالا ڈول ہو گیا تھا اور بوجان نے جیسے میرے تذبذب کو بجانپ لیا ہو۔ مگر میں تو یہ سوچ کر پریشان تھا کہ گھر میں یہ کیا فساد شروع ہو گیا۔ وہ جو گھروں میں ساس بھوکے بیچ کٹا چینی رہا کرتا ہے اس سے اپنائھر آج تک نا آشنا تھا۔ ستم طریقی دیکھو کہ جب تک ہم لوگ کرائے کے مکانوں میں رہے امن جیتنے سے رہے۔ ساس بھوپواری، بھوساس کی خدمتگزار۔ مگر اپنے گھر میں آکر بے تو بھکڑے مٹھے شروع ہو گئے۔ سو طرح کے دسوں سے اندر لیتے، بدشگنیاں، انعام، جوابی انعام، زبیدہ کو میری طرف سے خوش فہمی پیدا ہو جی تھی کہ میں اس کے اثر میں آگیا ہوں اور مکان یہی پر آمادہ ہوں مگر یہ کہ بوجان موقعہ پا کر میرے کان بھرنی ہیں اور میں پھر بدک جاتا ہوں۔ ادھر بوجان بھی میری طرف سے اتنی ہی خوش فہمی رکھتی تھیں کہ مکان یہی کاشتگوڑہ ان کی بھونے چھوڑا ہے۔ خیر بیان تک تو وہ صحیح بھتی تھیں گرامی کے ساتھ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ میں بیدی سے بہت دبتا ہوں اور دباو میں آکر مکان یہی ڈاپر طو عاد کر لے آمادہ ہو گیا ہوں۔ میں خوش فہمی کے ان دو پاؤں کے بیچ میں پستا چھا جا رہا تھا۔

بوجان اور زبیدہ دو فوں پر میں کتنا حیران تھا۔ بوجان پر یہ سوچ کر انہوں نے تو اپنی آنکھوں سے سڑا دہا دگھروں کو اجڑتے اور اونچی ہو بیوں کو ڈھیتے دیکھا تھا، پھر بھی ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی کہ گھر کرنے بے ثبات ہوتے ہیں۔ اصل میں زبیدہ سے زیادہ بوجان نے مجھے مکان بننے پر آمادہ کیا تھا۔ میرے اندر یہ بات اتار دی تھی تھوڑے وقت ہی کے لیے سہی کہ جب تک آدمی کا اپنا مکان نہیں ہوتا وہ اکھڑا ہوا رہتا ہے۔ میری سادہ طریقے میں نے مطلقاً یاد نہ کیا کہ کتنے بھے جما نئے گھرانے اور بڑھ کے پیڑ کی مثال

مستحکم لوگ اس کی آنکھوں دیکھتے گئی بینا دوں اور اونچی چھتریں والے محل دو محلوں سے نکلے اور پت جھر کے پتوں کی طرح دور کی گلیوں میں رلتے پھرے۔ مگر مجھے رفتہ رفتہ یہ احساس ہوا کہ آدمی مکان تعمیر کرے تو ساتھ میں ایک کشتی بھی ضرور تیار کرے کہ کیا ضرور کہ کب گھر کے چولے کی تھے اور اس میں سے پانی اُبلنے گے۔

ذبیحہ پر یہ سوچ کر حیران ہوا کہ اس نیک بخت نے اس وقت مکان بنانے کیلئے میری تلی اکھڑدی تھی اور اب اسی مکان کو ٹھکانے لگانے کے لیے میری تلی اکھڑے دے رہی تھی۔ ایک بیوی کا مکان بنانے کے لیے اصرار تو میری سمجھی میں آتا ہے۔ اس کے بیان احساسِ تحفظ کے لیے خالی شوہر کا ہونا کافی نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ مکان کا ہونا بھی ضروری ہے اور بنیک بیس کا ہونا بھی۔ شوہر، مکان، بنیک بیس۔ یہ تین چیزیں مل کر بیوی کو احساسِ تحفظ عطا کرنی ہیں۔ مگر ایک بیوی شوہر سے مکان یقین دلانے کا تعامل کرے، تعجب کی بات تو یہ تھی۔ یہ تو خیر تھا ہی کہ جیں کی ہمسائیگی نے اسے ایک دہمی مبتدا کر دیا تا مگر پھر مجھے ایک دن یوں ہی خیال آیا کہ ہمارے اڑوں پڑوں سے کتنے ہی کوششی والے ہمارے دیکھتے رہیں کوئی کوئی پیچ کھو جاگر گلبرگ کے علاقہ میں جا بے ہیں کیا وہ بھی ایسے ہی کسی دہم میں پڑے گئے تھے۔ نہیں، ان کا سُنہ دوسرا تھا۔ بات یہ تھی کہ یہ علاقہ اس مقام بلند سے جسے نئی زبان میں پوشش لوکلش کرتے ہیں، بہت تیزی سے گردہ تھداب سے پہنچے ہیاں آ کر رہنا بنا شیش کی نشافی سمجھا جاتا تھا۔ اب یہاں سے نقل مکلن کر کے گلبرگ یا کسی ایسی نئی آبادی میں جا کر بن شیش کی نشاف بن گیا تھا۔ ایک تو یہ کہ شہر کی تو سیچ کے ساتھ نئے پوشش علاقے درجہ میں آ رہے تھے اور پرانے پوشش علاقے زوال کرتے چارہ ہے تھے جیسے انہیں گھمنگ گیا ہو۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ اس علاقے میں دیکھتے دیکھتے دکانیں بہت کھل گئی تھیں۔ موڑو رکشا پس، جزل شورز، ہوٹل، کباب ٹکے کی دکانیں، پان سگریٹ اور کولد ورنیس کے سماں غرض ہر رنگ کی دکان اب یہاں نظر

آتی تھی اور ہر قہاش کی مخلوق۔ مکینک، پرچون فروش، تھوک فروش، تیلی چولی، پر اپنی دلیر، مفرمن یہ کہ رنگ رنگ کی چھوٹی مخلوق یہاں امتد آئی تھی گویا اب یہ مرک شندی مرک نہیں رہی تھی۔ جن راستوں پر کسی زمانے میں صبح منہ اندر ہیرے سے اور شام پڑے شرفاً پہلی قدمی کرتے نظر کتے تھے وہ رستے اب ہر عرصہ کے ٹرینک اور ہر قہاش کی مخلوق کے شور سے اور رہیں اور گرد کے اڑنے سے گرم گرد آلو دھو گئے تھے۔

ایک واقعہ اور ہوا۔ اچانک اس علاقہ میں زمین کی تیزی میں چڑھ گئیں۔ یا اخیال

یہ تھا کہ یہ علاقوں کی روشنی ایسے یا بننے والا ہے۔ یہ کم شیل ایسا بھی عجوب متعددی شے ہے نے شہروں میں بالکل ہر کاس بیل کی طرح پھیلتا ہے اور سربر علاقوں کو نگتا چلا جاتا ہے۔ جیسے صحرا علاقوں میں ریاستان پھیلتا ہے اور مرغزاروں نخلے نوں کو نگتا چلا جاتا ہے تو کم شیل ایسا شہر کی کتنی شاداب آبادیوں کو اپنی لپیٹ میں لیئے کے بعد تیزی سے ہمارے علاقے کی طرف بڑھتا تھا۔ ادھر مجھے یہ سوچ سوچ کر دھشت ہو رہی تھی کہ اگر یہ علاقوں کی چڑیوں کا جینا اجیر کر دے گا۔ بھروسہ کا ہے کہ یہاں ٹھہریں گے تو اس سربر علاقے کی چڑیوں کا جینا اجیر کر دے گا۔ بھروسہ کا ہے کہ پاریں میں آدمی تو مکان تعیر کر کے اپنے پاؤں میں بیٹھیاں ڈال لیتا ہے۔ چڑیوں کے پاؤں میں ایسی کوئی بیڑی نہیں ہوتی۔ کسی علاقے کی آب و ہوا ان کے لیے سازگار نہ رہے تو انہیں کوئی طاقت دلان باندھ کر رکھ سکتی ہے۔ تو اگر اس علاقے کی ہر ایسی تو چڑھیاں تو بھروسے اڑ جائیں گے۔ اور ہر صبح کو جو میرے ہار نگہدار ملے سمجھ جاتی ہے وہ بھر جائے گی۔ بھر میں کیا کروں گا؟ ار گرد آدمی ہی آدمی ہوں اور چڑھیا کوئی نہ ہو، ایسی غیر انسانی صورتیں کا تھوڑے لیے سخت گھناؤ ناتھا۔ وہ تو یہ کیسے کہ اس دھرتی پر چرد پرند اور پھول اور درخت بھی ہیں۔ اگر صرف انسانی مخلوق ہوتی تو اس کے بیچ بُر کرنا کہت اذیت ناک عمل ہوتا۔ توجہ میں نے آنے والی زندگی کا اس طرح تصور کیا کہ چڑھیاں ہجرت

کر جکی ہیں اور ہمارے نگہار کا پیڑ مُر جھا چکھے اور چاروں طرف آدمی ہی آدمی ہیں تو مجھے زندگی کا یہ نقشہ بہت مُردہ نظر آپا۔

زبیدہ نے جب میرے اس دسوئے کو سمجھ لیا تو پھر اس سے پورا پواف مدد اٹھایا۔ جان یا کہ اب اس کی بات بے اثر نہیں جائے گی۔ وفعہ، فتحہ یہ صورت حال البعربی کہ اس علاقے سے نقل مکانی زبیدہ اور مجھے دداں کو دارالاکھانے لگی۔ زبیدہ کو یہ نظر آرہا تھا کہ مکر شیل ایر یا بننے کی صورت میں آشیانہ لچھے داموں نکل جائے گا جس سے گلبرگ میں اچھی بھلی کو شُنی تعمیر ہو سکے گی۔ اگر اس رقم سے پورا نہ پڑا تو اس نے یہ تر جان ہی یا تھا کہ میں پس لگا کر کہیں نہ کہیں سے قرضے کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ بہر حال گلبرگ میں کوشی بن جائے گی۔ یوں سیٹیں بھی بلند ہو جائے گا اور جیل کی ہمسایگی سے بھی نجات مل جائے گی۔ ادھر میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس سے پہنچ کہ میرے پھول پودے ٹرینک کے شودا اور دھویں سے جلس جائیں مجھے اس علاقے سے نکل جانا چاہیے۔ اس خیال نے دھیرے دھیرے اتنی شدت پکڑی کہ میں بالکل اس کی گرفت میں آگیا۔ اس عالم میں مجھے اس پارپنی ڈیلر کا خیال آیا۔ تب میں دل ہی دل میں زبیدہ کی عاقبت اندیشی کا فائل ہوا جو پہا پرپنی ڈیلر کو نقطی جواب دینے کے حق میں نہیں تھی۔ ایک تاسف کے ساتھ میں نے سوچا کہ خواہ مخواہ میں نے اسے دھنکارا۔ ڈور پر گلشنے رکھتا تو آج اس سے کام یا جاسکتا تھا۔ اور کمال ہوا کہ جس دن میرے دماغ میں یہ بات آئی اس کے دوسرے دن ہی وہ آن موجود ہوا میں تو ہنکار بکارہ گیا۔ کیا اسے القا ہوا تھا۔ میں ڈر گیا کہ یہ شخص کیا شے ہے۔ آدمی ہے یا جن ہے۔ اس وفعہ پارپنی ڈیلر سے میں بہت گرم حوشی سے ملا۔ زبیدہ کو اندر پہنچا کر پارپنی ڈیلر آیا ہے اس کی باہچیں کھل گئیں۔ اس کی نو دلی مُراد برآئی تھی۔ فوراً ہی چائے بنانے بیٹھ گئی۔ مجھے بلما کر سمجھا یا کہ اسے پہنچ کی طرح مت ٹرخا دیتا۔ ذرا کر بیدو تو سب کہ

زمینوں کا کیا بھادڑ جا رہا ہے اور اگر ہم اپنا آس شیانہ بیچیں تو کتنے میں نکل جائے گا؟ مگر فوراً ہی اسے احساس ہوا کہ اس نے غیر مختاط انداز میں بات کر دی ہے۔ سواس نے حکم دیا کہ بے شک ہم نہ بیچیں اور کوئی ابھی نیچر ہے ہیں مگر ہر بات کا پستہ تو ہونا چاہلے ہے۔

میں زبیدہ سے سبق پڑھ کر باہر آیا اور پر اپہنی ڈیلر کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی بائیں کرنے لگا۔ چیال تھا کہ وہ خود ہی مکانوں جامد ادوان کی خرید و فروخت کا ذکر بھیڑے گا مگر اس نے اشارہ بھی کوئی ایسا ذکر نہیں کیا۔ اور اور باتیں کرتا رہا۔ کچھ دسم کا ذکر، کچھ میرے مشاغل کے بارے میں پوچھ گچھ۔

آخر خود میں نے ہی ذکر چھیرا : "کہیے آپ کا کار و بار کیسا جا رہا ہے؟" پھر دنوں تو منہ ہی رہا۔ ہاں اس وقت بہت اعلیٰ جا رہا ہے۔

"اچھا؟"

"صاحب آپ کو تو پہتہ ہونا چاہیے۔ آپ کے علاطے میں تو ان دنوں بہت خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ ایک دو کوٹھی والوں سے تو میں نے مخذالت کر لی۔ انہیں بچپن کی کچھ زیادہ ہی جلدی تھی۔ لوگ بھی تو سیلی پرسہ سول جلتے ہیں۔ میں نے مخذالت کر لی کہ جناب ابھی تو میری سٹھنی میں کوئی گاہک نہیں ہے۔"

"اچھا؟ مجھے تو پتہ نہیں مگر خرید و فروخت میں یہ گراگری کیسے پیدا ہو گئی؟"

"صاحب بات یہ ہے کہ یہ علاقہ کرشمبل ایر یا میں آگئے ہے۔ لیکن تم جو کہ فیصلہ ہو گیا ہے۔ اس سے اچانک زمین کا بھادڑ چڑھ گیا ہے۔ کوئی ٹھوں والوں کے تو دارے نیارے ہو گئے۔ منہ مالگی قیمت مل رہی ہے۔ تو اندر ھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ رہائش کے لیے تو یہ علاقہ اب موزوں رہا نہیں۔ تو ایک تو شر فاویسے ہی یہاں سے جانے پہ تیار ہیں۔ پھر انہیں دام بھی اپنے مل رہے ہیں۔"

”داتی یہ جگہ کر شیل ایریا میں آگئی ہے؟“

”باکل صاحب۔ فیصلہ ہو چکا ہے۔ فائل اس وقت گورنر صاحب کی میز پر ہے۔ ایک دو دن میں ان کے دستخط ہو جائیں گے۔ پھر دیکھیے یہاں کیسا العذاب آتا ہے؟“
”ہاں بھر اس علاقے میں کا سکون ختم ہو جائے گا۔“

”یہ تو ہے۔ یہاں کا سکون تو واقعی غارت ہو جائے گا۔ اتنا سور ہو جائے گا کہ آپ جیسے نفیس مزاج لوگوں کے لیے تو یہاں سانس دین مشکل ہو جائے گا۔“
”پھر تو کسی نہ کسی وقت یہ علاقہ چھوڑنا ہی پڑے گا۔ مگر رہی مشکل ہے اچھی لکھتی میں تو زمین نایاب ہے۔“

”پس پاس ہو تو پھر نایاب نہیں ہے۔ لکھرگ میں ابھی بہت گنجائش ہے۔ لوگ گلبرگ کی طرف بہت دوڑ رہے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ کیناں بینیک اس سے بہتر علاقہ ہے۔ جنیڑی کا رجحان تو اسی طرف ہے۔ پھر داں زمین کا ریٹ بھی کہہ ہے۔“

”اچھا؟“

”باکل۔ اسی آپ کی لوکشنی کے درجنٹیمینوں کو تو میں دلو اچکا ہوں۔ بہت سوچ جگہ ملی ہے۔ اور ستی بھی ہے۔ ویسے صاحب زمین کی قیمت وہاں بھی بہت تیزی سے چڑھ رہی ہے۔ ایک نیشن کے اندر اندر ریٹ بائیس ہزار مرلہ سے چھیس ہزار مرلہ تک پہنچ گی۔“

میں نے اس کا بیان بہت توجہ سے سنا۔ سوچ رہا تھا کہ مطلب کی طرف کیسے دک۔ یہ ظاہر بھی کرنا نہیں چاہتا تھا کہ مکان پیچنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ ظاہر کرنا حصیت کے خلاف بھی تھا اور پھر آنے والے دنوں سے ساری بیزاری کے باوجود ابھی میں مذبذب تھا۔ خیر کچھ کہنے لگا تھا کہ کامریہ آن دھمکا۔ بات منہ سی میں رہ گئی۔ کامریہ نے میز پر چائے کی پیالیوں کے برابر اپنا تھیدار کھتے ہوئے پراپری ڈبل کہ معنی خبر نظر دی سے دیکھا۔

پر اپنی ڈبلر کچھ سپٹا سا گیا۔ کیوں، میں نہیں سمجھ سکتا۔
”سلام علیکم۔“

”علیکم السلام۔“ کامریڈ نے پر اپنی ڈبلر کے سنا مکا جواب بہت روکھے لجھے میں ریا۔
تجھے لگا کہ وہ اپنے دس سے کو جلتے ہیں۔ اس حد تک کہ کسی قدر اپنید و سرے کے تجھے
بھی ہیں۔ کامریڈ کی آمد نے پر اپنی ڈبلر تو سپٹایا پوا تھا ہی، ادھر میرا بھی حال یہ تھا کہ
جیسے میں چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہیں۔

”کامریڈ، چاہئے چلے گی نا؟“

”کیوں، بہت جلدی میں ہو۔“ کامریڈ نے مجھے گھوڑ کر دیکھا۔ کیا کہیں جانا ہے؟“
”نہیں۔ جانا کہاں ہوتا ہے چیک ہے۔ شہر کے پیسے گئے۔“

پر اپنی ڈبلر اکھڑ تو پسے بی گیا تھا، کامریڈ کے ان فقردل سے جوڑے میں خیز
لنجہ میں کھے گئے تھے بالکل بی اکھڑ گیا۔ فوراً ہی کھڑا ہو گیا:

”اچھا جناب۔ مجھے اجازت دیجیے۔“

”اچھا پھر کسی وقت آئیئے۔ باقی میں ہوں گی۔“ میں اسے گیٹ تک چھوڑنے لگا اور
ایک دفعہ پھر اصرار کیا کہ کسی وقت ضرور آئے۔

واپس آکر بیٹھا ہی تھا کہ کامریڈ نے ہے بول دیا:

”یہ فردا یا تمہارے پاس کیا لینے آیا تھا؟“

”تم اسے جلتے ہو؟“

”میں اس شہر کے ہر فراڈیلے کو پہچانتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ تمہارا اس کے ساتھ کیا
چکر ہے۔ کیا کوئی نئی جائیداد خرید رہے ہو۔ سودا سوچ سمجھ کے کرنا۔“
”نئی جائیداد؟ تم نئی کی بات کر رہے ہو۔ یہاں پرانی بلائے جان بھی ہوئی ہے۔ میں
اسے ٹھکانے لگنے کے لیے پھر رہا ہوں۔“

”اچھا اچھا۔ گھونسلہ کو ٹھکانے لگا رہے ہو۔ بوجان نے ایک مرتبہ مجھ سے ذکر کی تھا بکد فرپاد کی تھی کہ تمہارا دوست مکان یتھنے پہ تلا ہوا ہے۔ تو گویا وہ بُھرت تم پہا بھی بک سوار ہے۔“

”یار کس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آ رہا۔“

کامریڈ نے ایک زہر بھرا قہقہہ لگایا: ”تیری اس نے خصم کیا۔ بُرا کیا کر کے چھوڑ دیا اور بھی جڑا کیا۔“

”ہاں یار یہی سمجھو لو۔ مگر کیا کیا جائے۔ ایک توہ مومنگ کار پریشن نے میری ایسی کی تیسی کر رکھی ہے۔ شروع میں قسطیں ادا نہیں کی تھیں ان کی سزا اب تک بھگت رہا ہوں ماس کے صعود نے میرا ناظر بند کر رکھا ہے۔ پھر جو قرض خواہ سوئے ہوئے تھے وہ بھی جگ اٹھئے ہیں۔ صوچتا ہوں کہ مکان کو ادنے پوئے ہیچو اور قرض خواہوں سے اپنی جان چھڑاؤ۔“

”تو پھر بھابی کو بھی طلاق دے رہے ہو؟“

”کیا مطلب؟“ میں نے غصے سے کامریڈ کو دیکھا۔

”دیکھو کامریڈ۔ اس میں ہمارا نہ کی کوئی بات نہیں ہے۔“ اب کامریڈ سینیگی سے بول رہا تھا۔ ”شریف لوگ زندگی میں ایک ہی دفعہ شادی کرتے ہیں اور ایک ہی دفعہ مکان بناتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ جتنے ارمانوں سے شادی کی جاتی ہے اتنے ہی ارمانوں سے مکان بنایا جاتا ہے۔ مگر ارمان تو بس ارمان ہی رہتے ہیں۔ شادی والے ارمان ہم نے تو ازدواجی زندگی میں کبھی پورے ہوتے دیکھے نہیں۔“ مگر اس وجہ سے کوئی شریف آدمی بپوی کو طلاق تو نہیں دے دیتا۔“

میں خاموش سن تارہ۔ اتنے میں اندر سے چلئے کی ٹرائی آگئی۔ کامریڈ کو چاہئے بن کر دی۔ جب دیکھا کہ کامریڈ اب تھنڈا ہو گیا ہے تو میں نے کہا:

”یار کامریڈ۔ ایک بات بتاؤ۔ تم اور مکان بنانے کے قابل ہی نہیں ہو۔ اسے سخت

غیر اعلانی بکہ اعلان دشمن کا رو بار سمجھتے ہو۔ سوتھ نے مکان نہیں بنایا۔ پھر تم میرے مکان پیچنے کی مخالفت کیوں کر رہے ہو؟"

"میری چھوڑ د۔ میں نے شادی بھی تو نہیں کی۔"

"اس کا سطلہ یہ ہے کہ تم نے شادی کر لی ہوئی تو پھر تم بھی مکان بناتے۔"

"بناتا یا نہ بناتا، بنانے کے چکر میں ضرور مبتدا ہو جاتا۔"

"شاید کامرٹیہ۔ تیر سے حتیٰ میں یہ اچھا ہی ہوتا۔"

"اپنے کام سے جاتا۔ یہی اچھا ہوتا نہ۔"

"کامرٹیہ میں شیک کہہ رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ شادی، اولاد، مکان، یہ جھیلے ضرور ہیں، مگر ضروری بھی نہیں۔ ان کی وجہ سے آدمی تھوڑا لٹک جاتا ہے۔ کچھ جڑ پکڑ لتا ہے۔ نہیں تو زندگی کے بھاؤ میں آدمی تنکے کی طرح بستا ہی رہتا ہے۔"

"دم کٹی تو مرد یوں کا نفسہ کامرٹیہ نے تھیفر سے کہا۔"

میں کچھ بولنے لگا تھا کہ کامرٹیہ نے بات کاٹ دی: "یار کوئی کام کی بات کرو۔ لڈ سگریٹ پیاؤ۔"

میں نے سگریٹ پیش کی۔ کامرٹیہ نے سگریٹ سکا فی۔ لمبے لمبے کش لیے۔ اپن تھیڈا اٹھایا اور جپ کھڑا ہوا۔

بہر حال کامرٹیہ اپنا کام کر گیا۔ فیصلہ پر پہنچنے پہنچنے میں پھر ڈانوا ڈول ہو گیا۔

۱۴۱

در دارے پر پھر دی دستک۔ اور میرا سانس اد پر کارپ اور تینے کلتے۔ جسم جیسے پتھر ہو گیا ہو۔

"اے ہے کانوں میں ڈاٹ رکھنے نیٹھے ہو۔ سن نہیں رہے ہو۔ کسی نے بیس دی ہے۔"

"دی ہو گا۔"

"کون؟"

"دی پر اپنی ڈیلر۔ بور کر دیا اس شخص نے۔ دفتر میں ہوتا ہوں تو فون آ جاتا ہے اور اتنی لمبی بات کرتا ہے کہ جی چاہتا ہے رسیور پٹخ کر باہر نکل جاؤں۔ گھر آؤ تو خود آن دھکتا ہے۔"

"تم تو بس کامریہ جیسوں کے ساتھ خوش رہتے ہو جو گور کا چوتھا نہ لیپنے جو گا نہ پوتے جو گا۔ کام کے آدمی سے بجاگتے ہو۔"

لتنے میں پھر زیل ہوئی۔

"اجی جاؤ۔ دیکھو نا۔"

اور میں بیز اری کے ہال میں اٹھا در دارہ کھولا۔ میرا گمان صحیح تھا دی پر اپنی ڈیلر تھا۔ اسے برآمدے میں بھایا سبیدہ نے فوراً چلے بھجوادی۔ نبیدہ اس کی کتنی

تواضع کرنے لگی تھی۔ کامر ڈیڈ کی آمد کا قواں سس نے کہی اس طرح نوش نہیں لیا تھا۔ مجھے کہنا پڑتا تھا کہ ذبیدہ، اپنا کامر ڈیڈ آگیا ہے۔ ذرا چاٹے ہو چاۓ۔

اس کے چلے جانے کے بعد ذبیدہ نے کتنے تھجت س اور اشتیاق سے پوچھا:

کیا کہہ رہا تھا؟“

”دہی اول ڈال باتیں۔ فلاں کیم میں پلاٹن کے لیے قرداںدازی ہونے والے فلاں صفائی میں فلاں کو بھی فروخت ہو رہی ہے۔“

بخت مارے نے اب بتایے جب قرداںدازی ہونے لگی ہے۔ پہلے سے بتایا ہوتا تو ہم بھی فارم داخل کر دیتے۔ اور وہ جو اس نے پیدے کیاں بینک کے پلاٹن کا ذکر کیا تھا ان کے مستقی اب کیا کہتا ہے۔“

”ذبیدہ۔ ابھی تو ہم نہیں خرید رہے، میں جب فیصلہ کر لیں گے آشیانے کو پھوٹ دیتا ہے تو پھر معلومات حاصل کرنے میں کتنی دیرگتی ہے۔“

”لیے معاملوں میں، سختی پر سوں نہیں جا کریں ہے۔ ابھی سے معلومات حاصل کرتے رہو گے پھر وقت آنے پر کچھ ہو سکے گا۔ اور میں کہتی ہوں کہ ہم نہ خریدیں سیکن ہیں پہتہ تو رہنا چاہیے کہ زمینوں کا کیا حال ہے۔ باقی رہی فیصلہ کی بات تو تم تو فیصلہ کر چکے۔ تمہیں بوجان کوئی فیصلہ نہیں کرنے دیں گی اور اپرے سے اس بخت مارے کامر ڈیڈ نے پہنچے میں مانگ اڑادی۔ خود نکھرا پھرتا ہے۔ ہمارے مکان کے لیے اس کے پیٹ میں بہت درد اٹھ رہا ہے۔“

اب یہ روز کا ضمنون بھٹرا تھا۔ دفتر کے ادقات میں فون۔ دفتر کے ادقات کے بعد گھر پہنچا۔ اس کے جانے کے بعد ذبیدہ کی طرز متعارف سننا۔ اور فون سے اب میں لکناؤ نے لگا تھا۔ ایک دقت تھا اور کیا دقت تھا کہ میز پر رکھے ہوئے ہے ٹیلفون سیٹ میں گہریا جان پر گئی تھی۔ کتنی زندہ تھے نظر آتا تھا۔ اب ایک دفعہ پھر فون ہیرت لیے

زندہ چیز بن گیا تھا۔ مگر اب کے دو سے کوئی نہ سے سا ب نہ میرے یہ ایک ڈرائیوری چیز تھا۔ فون کی گھنٹی بجی اور میرا دم خشک ہوا۔ کتنا ڈرتے ڈرتے میں فون اٹھاتا تھا۔ یہی کیفیت اس وقت ہوتی تھی جب گیٹ کی بیل بجتی تھی۔ اس شخص کا کتنا ڈر میرے اندر سما گیا تھا۔ جتنی دبیرہ مجھ سے باقیں کرتا رہتا اتنی دبیر مجھے یہ خیال رہتا کہ وہ مجھ سے باقیں نہیں کر رہا ہے، میرے اندر جھاہکر رہا ہے۔ گھات میں بیٹھ لپے کہ میں اب گرا اور اب گرا۔ جب نہیں ہوتا تھا تب بھی یہی دہم رہتا تھا کہ کہیں اس پاس منڈلار ہا ہے۔ کبھی کبھی چلتے چلتے لوں لگتا کہ وہ چیچے آ رہا ہے۔ پیدل چلتے ہیئے کتنی مرتبہ مجھے اس دسوسرے نے ستایا اور کتنی مرتبہ میں نے یہی مرط مرت کر دیکھا۔

لبس اس روز میرا اس سے خوش اخلاقی سے پیش آنا اور چائے سے تواضع کرنا غصب ہو گیا۔ وہ تو اسی روز مجھے کتنے نیز ہمسوں طور پر راہ پر لے آیا تھا مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ تہنیت وقت پہ کامر پڑ آن پکا اور میں بدک گی۔ اس کے بعد عجب بہوت حال پیدا ہوئی۔ جیسے شکارچوکنا ہو گیا ہوا اور شکاری اس کے چیچے لگا ہوا سر میں اب اسے بسط ج دھنکار بھی نہیں سکتا تھا جیسے شروع میں دھنکار اٹھا۔ اس سے ناٹف بھی کہا اس کے اثر میں بھی تھا۔ ایسے اس سے ڈرتا تھا جیسے گائے فصالی سے ڈرتا ہے۔ ایس کی طرف کھنچتا تھا جیسے سانپ سپرے کی طرف کھنچتا ہے۔

گھر میں اب نقشہ یہ تھا کہ ایکستانتی کی نظر۔ بو جان اور زبیدہ میں اب بحث تو نہیں ہوتی تھی مگر دونوں اکیدہ دسکے سے ددرد درد بننے لگی تھیں۔ بو جان نے زبیدہ ہی کو نہیں مجھے بھی اب نصیحت کرنی بند کر دی تھی۔ چپ چپ ہے نگلی تھیں۔ جب درد اونے گئی تھی اور پتہ چلتا کہ پا پر ٹیڈی میرا آیا ہے تو تشویش کی ایک کیفیت۔ ان کے چہرے پر ظاہر ہوتی جسے زبیدہ تو نہیں مگر میں فرآ جان پیتا تھا۔ دیے منہ سے کچھ نہیں کستی تھیں۔

عجب ہوا کہ بوجان کے چپہ ہرنے کے ساتھ ہمارے گھر میں بھی خاموشی نے ڈیرا کر پ۔ اس گھر میں بولنے والوں کرنے کا سند تو بوجان ہی کی کسی بات سے شروع ہوتا تھا لہ دے دلمن۔ اے بیٹے۔ اے لال۔ کبھی زبیدہ سے خطاب کبھی مجھ سے خطاب۔ لبھے شروع ہو جاتی تھیں۔ کوئی نیاں کی بات کوئی دلماں کی بات۔ اگھے پچھلے قصے، کب کب کی کہانیاں۔ ایک ان کے دم سے کتنے زمانے کلتے ہیں اس گھر میں دم لے رہے تھے دھچکہ ہوئیں تو جیسے اس گھر میں کرنے کے لیے کوئی بات ہی نہیں رہی۔ سب نانے روپرشن ہو گئے۔ میں نے اپنی ہلکی سے انسیں چھپرا بھی۔ وہ باتیں بھی کیس جوان کے تخیل کے لیے تھیں کام کرتی تھیں۔ چراغِ حوالی کا ذکر بھی چھپر کر دیکھو۔ ذرا جبوں ہوں۔ مباختندا اس بھرا درچپ ہو گئیں۔ ان ایک دن خود ہی شروع ہو گئیں۔ کتنی دیر سے چپ ہیجھی تھیں آپ ہی آپ بڑھانے لگیں:

آج ہل چراغِ حوالی خواب میں بہت آرہی ہے۔ نہ جانے کیا بات ہے۔ رات کیا دیکھ کر جیسے حوالی میں سفیدی ہو رہی ہے۔ راج مرزو در گھر ہوئے ہیں۔ پھر جیسے صفائی سفرانی ہو گئی ہو۔ کیسی چکدی ہی تھی ماشا حاللہ میر دانے کے صحن میں چھپر کا دپہ چھپر کا دپہ میں جیسے طال سے کھر رہی ہوں کہ بہشتی جی کتنی مشکلیں اٹھ دیو گے۔ اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ مشکل خالی کی اور پھر کنوں پہ ڈول بھر بھر مشکل میں اور پھر مشکل سے صحن میں چھپر کا دپہ۔ پھر جیسے میاں جان ہیں۔ تخت پہ گاؤں تکیے سے ڈیکھ لگائے ہیں۔ بغیر برائق پھر سے پہنے ہوئے ہیں۔ چھر سے پہ ایسی رونق کہ کیا بتاؤ۔ مجھے دیکھو کہ میر کے لئے کتنی شفقت تھی سے کہا کہ بہو تم آگئیں۔ لبھ اتنے میں میری آنکھوں گئی۔

بوجان چپ ہو گئیں۔ خیالوں میں غرق ہو گئیں۔ پھر خود ہی بولنے لگیں:

پرسوں رات کی بات ہے۔ دیکھا کہ جیسے رات کا وقت ہے۔ حوالی کا بڑا چھکہ بجاڑ سا کھلا ہوا۔ اندر اندر ہیرا۔ میں جیران ہو کے کھر رہی ہوں کہ نہ جانے کیا بات ہے کہ اج

حوالی کا پھائک کھدا پڑا ہے اور ڈیوڈھی میں لائیں بھی نہیں جل رہی۔ اندر سے دل دھکڑ پکڑ کر سے کہ اندر جاؤں یا نہ جاؤں۔ پھر جیسے حوالی میں اکیلی بھتک رہی ہوں۔ چلادہی ہوں کہ اری اُد سکینہ، تو کہاں اُر گئی۔ چولغاٹھڈا پڑا ہے۔ باورچی خانز میں جھارڈ بھی نہیں گئی ہے۔ کب ہندہ یا چڑھتے گی، اکب کھانا پکے گا۔ اسے لوا ابھی میں سکینہ کو آداز دے ہی رہی ہوں کہ میری آنکھ کھل گئی۔

پھر جپ۔ گم سم۔ اپنے خیالوں میں غرق۔

یہ بوجان کی آخری لفت گئی تھی۔ پھر نہیں بولیں۔ بیٹھنی ہوئی یوں لگتیں کہ ہیں، نہیں ہیں، کہ میں اور ہمینچی ہوئی ہیں۔ مجھے پتہ تھا کہ کہاں چینچی ہوئی تھیں۔ جسم یہاں تھا، ردھ چراغ حوالی میں بھکلتی پھرتی تھی۔ اسی بوجان تو چراغ حوالی ہی میں تھیں۔ ان دنوں کیا دبدبہ تھا ان کا۔ نوکر چاکر، اچھوٹے بڑے سب ان کے رعب میں رہتے تھے۔ کسی کی محفل نہیں تھی کہ ان کے کھے کو ٹال جائے۔ حوالی میں زنانے سے مردانے نہ کے ان کا حکم پڑتا تھا میاں جان نہ کر رسانی حاصل کرنے کا دسیدہ بھی دیتی تھیں۔ تو اصلی بوجان تو وہ تھیں۔ بہر تو ان کی پر چھا میں تھی۔ جیسے اصلی بوجان وہیں حوالی میں رہ گئی ہوں۔ صحت گرتی بھاری تھی۔

بدن پر پسے بھی ایسی کونسی بوجاتی چڑھی ہوئی تھی مگر اب تو خدا بھوت نہ بلوائے بدنا پہ نولہ بھر گوشت بھی نہیں تھا۔ سوکھ کے جمیرخ ہو گئی تھیں۔ خوراک سمجھو کر چڑیا کا چگا۔ چلن پھر نابھی اب موقوف تھا۔ نہیں تو گھر کے اندر شمع شمع چلتی، ہی دہتی تھیں۔ سجن کے یچھے گھرے ہو کر انگلی اٹھا کر دعا پڑھنے کا ورد بھی معطل ہو چکا تھا۔ بلکہ اب تو نماز بھی بیٹھنے ہی پڑھنی تھیں۔ بالکل ہی تھک گئی تھیں۔ مگر کسی حال میں بھی ہوتیں سردم ہرگز ٹری منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتی رہتی تھیں۔

اس دن بھی چر کی پر بیٹھی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔ میرے ماتھہ ٹھیکیدار کو گھر کے اندر آنے اور اندر باہر کا جائزہ لیتے دیکھا تو جیسے ہونٹ اکیدم سے ہل گئے ہوں۔

پورا جسم ساخت۔ لب آنکھیں حرکت میں تھیں جیسے بھیگیدار کی سہ حرکت کا تعاقب کر رہی ہوں۔ اس میں میرا رادہ شال نہیں تھا۔ لب وہ پر اپر فی ذمیر کسی گاہک کو لے کر ایک دم سے آن دھمکا۔ کس بے نکلنے سے تعارف کرایا:

”بنختیار صاحب، یہ میں ہمارے اخلاق صاحب۔“ پھر مجھ نے مخاطب ہوا: ”اخلاق صاحب ایہ اپنے بنختیار صاحب آشیانہ دیکھنے کے خواہشند تھے۔ میں نے کہا کہ پچھے انہی دکھائے دیتے ہیں۔“

”لکھ سلسلہ میں۔ میں اسے فی الحال پیچنے کی تو کوئی نیت نہیں رکھتا۔“

”لا جوں دلا قوہ۔ میں نے کب کہا کہ آپ اسے یہ رہے ہیں۔ میں نے بنختیار صاحب کے سامنے آپکے مکان کی تعریف کی۔ انہوں نے مکان دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا کہ کیا مصالحتہ ہے۔ مگر کیا بات ہے۔ اخلاق صاحب سے ایسی کوئی غیروت نہیں۔“

”میں نے تامل کیا۔ میرے تامل کو دیکھ کر بنختیار صاحب خوش اخلاقی سے بولے:

”جناب ہم آپ سے نہ بردستی کوئی سودا تو کرنے نہیں آئے ہیں۔ مگر اپنے ذمیر صاحب نے آپکے مکان کی اتنی تعریف کی کہ میرا بے ساختہ جی چاہا کہ چل کر اس مکان کو دیکھا جائے۔“

ڈمیر نے فوراًٹکڑا گایا: ”بنختیار صاحب آپ دیکھیں گے تو دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔“

”مکان اچھا ہو تو اسے خواہ دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر مکان خریدنا یا بنانا ہو نہ اس سے بہت مدد ملتی ہے۔ ایک تصور قائم ہو جاتا ہے کہ مکان ایسا ہو ناچاہیے۔“

پھر میں انکار نہ کر سکا۔ مکان دکھایا۔ بنختیار صاحب نے دیکھا۔ ساتھ میں پر اپنی ڈمیر نے بھی۔ اس نے بھی پہلی مرتبہ ہی یہ مکان اندر باہر سے دیکھا تھا۔ بغیر دیکھتے ہی اس نے بنختیار صاحب کے سامنے اس مکان کی تعریف کے پہلے باندھوڑا لے تھے۔ بہر حال بنختیار صاحب مکان دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ڈمیر بھی باتیں کیا کیے۔ مکان کی تعریف کرتے رہے۔ مشورہ دیا کہ پیچئے مت۔ ایسے مکان روز روذ نہیں بنائے جاسکتے۔ مگر

چلتے چلتے شکرا گئے: ویسے اگر کسی یہ مکان نکالنے کا خیال ہو تو مجھے ضرور یاد کیجیے۔
جنگیار صاحب اور پاپٹی ڈیلر کو رخصت کر کے جب میں اندر آیا تو دیکھا کہ بوجان
چوک پر گمراہ بیٹھی ہیں۔ میں سپاٹ کر فوراً شروع ہو گیا:

”یہ صاحب پتہ نہیں کیا سے آئے ہے۔ پاپٹی ڈیلر نے انہیں لا کے مجھ پر
ستط کر دیا۔ مضر تھے کہ آپ کا گھر دیکھنا ہے۔ میں نے کہا دیکھ لیجیے مگر یہ مت سمجھیے کہ میں
مکان کو زیع رہا ہوں۔“ میں نے جلدی جلدی یہ ساری باتیں ایسے کہیں جیسے بوجان کے
سلسلے اپنی صفائی پیش کر رہا ہوں۔

بوجان نے ذرا جو کسی رد عمل کا مظاہرہ کیا ہو۔ لیس ایک دفعہ مجھے دیکھا ضرور ایسی
نظر دی سے کہ میں ڈھنے ہی تو گیا۔ پھر انہیں اور آہستہ آہستہ چلن کر اپنے کمرے میں چل گئیں۔
ذبیدہ جیسے بوجان کے جانے کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ ان کے جانتے ہی بڑے
بے صبرے بین سے پوچھا:

”اخلاق۔ انہوں نے کیا قیمت لگائی؟“

”تم کسی باتیں کرتی ہو۔ ہمیں بچنا ہی ہے تو سوچ سمجھ کے پہنچیں گے۔ ایسا تو نہیں ہے
کہ کوئی منہ اٹھائے چلا آئے۔ قیمت لگائے اور ہم زیع دیں۔“
”یہ میں کب کہہ رہی ہوں کہ ہم بے سوچ سمجھے اونے پونے زیع دیں۔ تھوک بجا کے
سودا کر دیں گے۔“

”مان نہان میں تیرا نہان۔ مجھے تو پاپٹی ڈیلر پر بہت غصہ آیا۔ پہلے اس نے
مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ کسی گاہک کو مکان دکھانے کے لیے لے کر آ رہا ہے۔
غیر آدمی کے سلسلے اسے میں کیا کہتا۔ مرقت میں مکان تو دکھا دیا۔ مگر صاف کہہ دیا کہ فی الحال
بچنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”یہ تو اچھا کیا۔ آنے والے کو بھی احساس رہے کہ ہم کوئی بہت ضرور تند نہیں ہیں۔“

اور سچنے کی کوئی عجلت نہیں ہے۔ عجلت میں اچھے پیسے نہیں ملتے۔ مگر اندازہ تو کیا ہوتا کہ کیسی اسامی ہے۔ کتنے میں خریدنے کی نیت رکھتا ہے۔

”خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔ کونسا بھاگ کا جارہ ہے؟“ اور اس کے ساتھ یہ مجھے بوجان کا خیال آیا۔ لگتا ہے کہ آج بوجان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ اور اس سے پہنچے کہ زبیدہ کچھ کہتی میں اٹھا اور بوجان کے کے کے کی طرف ہوں یا۔

بوجان اس شام اپنے کمرے میں ایسی گئی کہ پھر باہر نہیں نکلیں۔ میں نے جا کر دیکھا تو ان کی طبیعت بگڑی ہوئی تھی۔ پھر بگڑتی ہی چلی گئی۔

ہم دونوں نے تین راتیں ان کے سر لہنے سوتے جا گئے گذاریں۔ زبیدہ نے حتیٰ یہ کہ ان تین دنوں میں ان کی بہت خدمت کی۔ دل میں جو ایک چالنس پڑھتی تھی وہ تو پہنچی رات نکل گئی۔ کس بے قراری کے ساتھ بوجان کی حالت کو اور گھری کی سوئی کو درستی رہی۔ با ر بار دعا کرتی کہ الہی رات تحریر پت سے گذر جائے۔

پہلی رات۔ دوسری رات۔ تیسرا رات۔ بوجان کی پیشی اور ہم دونوں نے پوری رات آنکھوں میں گستاخی بخراصل دیکھو جال تو زبیدہ کر رہی تھی۔ میں تو بس اس کا خوصلہ بندھانے کے لیے پاس رہتا تھا۔ کچھ سوچتا ہوا کچھ جاگتا ہوا۔ ہاں تیسرا سے دن ہم دونوں کا بوجھ کچھ ہمکا ہو گیا۔ ایک تیسرا نے اگر ہمارا بوجھ بتایا۔ تیسرا پھر کا وقت تھا کہ دروازے پر کوئی کارہ کر رکی۔ اُرن کی آواز پر میں باہر گیا اور حیران رو گیا:

”ارے شیر میں تم؟“

اُب تم ہر مرتبہ مجھے دیکھ کر حیرت کا انہار کر دے گے۔ اور فوراً ہی الجہ بدل کر بولی۔

”تائی اماں کا کیا حال ہے؟“

”دیکھو چل گر۔ دیے تھے میں کس نے بتایا؟“

میرے اس سوال کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سیدھی اندر گئی اور بوجان کے پینگ کے پاس پہنچ کر ان پر چک گئی۔

”تائی اماں۔ تائی اماں۔ آپ کسی ہیں؟“

تائی اماں ہوش میں ہوتیں تو جواب دیتیں۔ وہیں پیارے لگ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر گم جنتی رہی پھر زبیدہ سے مخاطب ہوئی: ”کب سے یہ حال ہے؟“
”دو دن ہو گئے۔ اچھی بھلی تھیں۔ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے اٹھ کر اپنے کمرے میں چل گئیں۔ مجھے تو کوئی ایسا گمان بھی نہیں ہوا۔ اخلاق نے کہا کہ بوجان کی طبعتی شیک نظر نہیں آتی۔ اندر رام کے دیکھا تو وہ تو بخار میں بھن رہی تھیں۔ لیس پھر حالت بھڑکتی ہی چل گئی۔
”کہ کہ اکثر کو دکھایا۔ کیا کہتا ہے۔ ہستیاں میں داخل کیوں نہیں کرایا۔“ کتنی دیر تک یہی پرچھ کچھ کرتی رہی۔

”میں نے جب بوجان سے ذکر کیا کہ شیر میں بے تو بست خوش ہو جیں۔ پھر بگڑنے لگیں کہ ساتھ لے کر کیوں نہیں آئے۔ رد نہ پوچھتی تھیں کہ شیر میں آئی نہیں۔ کیا بات ہے؟“

”اماں مجھے سب سے پہلے تو تائی اماں کے پاس آنا چاہیے تھا۔“
”اس روز تو تم نے کمال کیا۔ ایسی او جمل ہو میں کہ میں ڈھونڈتا پھرا، تم کہیں نظری نہیں آئیں۔ بہر حال تم نے کنے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر کیوں نہیں آئیں؟“
جواب میں اس نے مجھے ایسی تیز نظروں سے دیکھا کہ میں پشاگیا۔ میں نے فوراً بات بدی: ”زبیدہ۔ شیر میں کے لیے چائے بناؤ۔“

”نہیں جاپی نہیں۔ میں چائے نہیں پیدوں گی۔“

”لو۔ کیوں نہیں پیدوں گی؟“

”بیماری کے گھر میں ایسے مکلفات اچھے نہیں گئے۔“

”نہیں۔ تکلفات باکل نہیں ہوں گے۔ سیدھی سیدھی چلتے ہوگی۔“

”آپ لوگ مجھے مہاں سمجھ رہے ہیں۔ میں یہاں تائی اماں کی خدمت کرنے کے لیے آئی ہوں۔ میں رات کو یہیں رہوں گی۔ تم لوگوں کو دراٹیں جاگتے گذرتی ہیں۔“

”بھر کیا ہوا۔ زبیدہ نے کہا۔ نیسے وقت میں جان پڑتا ہی ہے۔“

”مجھک ہے۔ آپ بیٹھے ہو ہیں گمراہی اماں میری بھی کچھ لگتی ہیں۔ کچھ ان کا حق مجرم پر بھی ہے۔“

”خود ہی دیہ میں شیرین ایسے ہو گئی جیسے وہ بہت دنوں سے یہاں رہ رہی تھا۔“

”اپنی تائی اماں کا چارچ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ زبیدہ سے کہا: ”جوابی، آپ کھر کا کام دیکھیں۔“

”تائی اماں کو مجھ پر چھوڑ دیں۔“

”زبیدہ بادوچ کھلنے میں چلی گئی۔ گھر جو دندنوں سے اڑا پڑا تھا اسے دست کرنے لگی۔ دتفوں سے کرسے میں جانک جاتی: ”شیرین میری ضرورت تو نہیں ہے؟“

”نہیں۔ آپ بے فکر ہو کر اپنے کام کریں۔“

ہند یار دٹی اور گھر کے درست کے ہاؤں سے فراغت پا کر جب زبیدہ اُگر بیٹھی تو شیرین نے جلدی ہی اسے آماں کرنے کا نوش دیدیا: ”جوابی آپ دراٹ کی جاگی ہوئی ہیں۔ آپ اپنے بستر میں جا کر فوراً سو جائیں۔“

”کیسے سو جاؤں۔ مجھے تو حالتِ سنبھالتی فنظر میں آئی۔ پتہ نہیں رات کیسے گذسے۔“

”آپ سوئیں۔ میں جاؤں گی۔ کوئی ایسی ولی بات ہوئی تو آپ کو اٹھاؤں گی۔“ بھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”اخلاق تم بھی آرام کر د۔“

”لبس تم اپنی جوابی کو سُلا دو۔ اس غریب نے دراٹوں سے آنکھ نہیں جھپکی۔ میں تو سوتا بگتا رہا ہوں۔ آج بھی یہی کروں گا۔ تمہیں پست ہے کہ میں بیٹھے بیٹھے بھی سو لیتا ہوں۔“

ہاں۔ پتہ ہے۔ بہت بے تعلقی سے اور کسی قدر آہستہ سے کہا۔ مپر فوراً ہی زبیدہ کی طرف رُخ کر لیا۔ بھابی۔ آپ آدم کریں۔

زبیدہ تھوڑی ہچر مخبر کے بعد یہ کہتے ہوئے کہ اچافرا پیٹھ رگالوں اقرب پڑے پنگ پہ لیٹ گئی اور فوراً ہی ایسی سونی کہ خراٹے لینے لگی۔

ہم دنوں دیرنگ ایک دوسرے سے بات نہ کر سکے۔ شیرین نے کافی دیر کیا پہنچ کر آپ کو بوجان کی تیار داری میں مصروف رکھا۔ میں دیکھتا رہا کہ کس طرح دہ تیار داری کے بدلے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی گوشش کر رہی ہے۔

شیرین۔ بوجان نے پچھے دنوں تھیں بہت یاد کیا۔ آخر میں نے زبان کھلی۔

شیرین جیسے شرمnde ہو گئی۔ آہستہ سے بولی: "ماں مجھے آنا چاہیے تھا۔"

"پچھے چند دنوں سے انہیں خاندان دلے بہت یاد آرہے تھے۔ ایک ایک کانا کیا۔ ایک ایک کو یاد کیا۔ مپر ایک روز بیٹھے بیٹھے کہنے لگیں کہ نہ جانے کیا بات ہے آجکل خواب میں چراغِ حوالیِ صحیبہت دکھائی دے رہی ہے۔"

"چراغِ حوالی۔" شیرین نے آہستہ سے کہا اور اس انداز سے جیسے اسے بہت کچھ یاد آگیا ہو۔

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ شیرین، تمہیں چراغِ حوالی یاد ہے؟" "یاد کروں نہ ہوتی۔ میں اتنی بچی تو نہیں تھی۔ مجھے ماں کی ان دنوں کی ایک ایک

بات یاد ہے۔"

"اچھا؟" میں نے تعجب کے کہا۔

مگر اس نے میرے رد عمل پر کوئی وھیان نہیں دیا۔ وہ یادوں کے رستے پر چل پڑی۔ اس کے لمحے سے بے تعلقی کا زنگخوار ج ہو چلا تھا۔ "اخلاق تمہیں یاد ہے جب

حوالی کی محضی پہ ایک دن مور آکے بیٹھا تھا اور ہم نے کہا کہ آدم سے پکڑتے ہیں۔“ یہ کہتے کہتے وہ ایک دم سے بدل گئی۔ اس کا دہ لیا دیا ہے اور غیریت کا حس س باکل ہی فائدہ ہو گیا۔ وہی بھول پیں، وہی ایک جیسے اس وقت کی شیریں واپس آگئی ہو۔ کتنے پچکے چکے ہوئے ہوئے قدم رکھتے رہتے ہم چھٹ پہ گئے تھے۔ یہ لمبی دم اور ایک دم سے نیں۔ لبس دم کو پکڑنے لگے تھے کہ پھر سے اڑ گیا۔

اس کے بیان کے ساتھ ساتھ وہ پورا منظر میری آنکھوں میں پھر گیا۔ چراغِ عولیٰ کی لوشنی چھٹ، محضی پر بیٹھا ہوا مر، اس کی جھاڑِ جسمی گھنی لمبی نیلی دم۔ اور جب وہ اچانک اُڑتا تو باکل ایسے لگا جیسے کوئی نیلا جوڑیرہ ہوا میں بتنا چلا جا رہا ہے۔

”اخلاق۔ لے سے ہمارے آنے کا پتہ کیسے چل گیا تھا۔ ہم نے تو اپنے دنوں سے ذرا آہٹ نہیں ہونے دی تھی۔“

”پھر؟“

”اسی وقت دور سے میاڈ میاڈ کی آواز آئی تھی نا؟“

”ہاں باکل۔ میاڈ میاڈ کی آواز سنائی دی تھی۔“

”مورنی نے اسے پکارا تھا۔ وہ اس پکار کو سن کر تڑپ گیا۔“

”موراپنی مورنی کو اتنا چاہتا ہے نا۔“

”ہوں۔“

ہم دنوں ہی اس فنا میں پسخ گئے تھے یا جیسے اس نے مجھا نگلی سے پکڑا اور یادوں کی ہری بھری دادی میں اتر گئی۔ یادوں کی ہری بھری دادی میں قدم سے قدم ملا کر ایک میسا سفر۔

”اخلاق نہیں یاد ہے وہ جو ایک سٹاچڑی یا منڈیرہ پر آکے بیٹھا کرتی تھی دم سے۔“

شام پری کہا کرتے تھے:

“شام کپری کو میں نے پکڑنے کے لیے بہت جتنی کیے مگر وہ ہمیشہ جلدے
جانی تھی۔”

شیریں کھلکھلا رہتی۔ پھر ایک دم سے سنجیدہ ہو گئی:

‘اخلاق! ’

میں گھبرا گیا: ‘ہاں۔ ’

خوبی میں جو کتوں اس تھا وہ تمہیں یاد ہے؟ ”

‘ہاں یاد ہے۔ ’

کیا وافعی اس کے اندر جن رہتے تھے؟ ”

‘پتہ نہیں۔ ولیے اس وقت میں یہی سمجھتا تھا۔ ’

‘اس وقت ہم کتنے بے دقوف تھے۔ سمجھتے تھے کہ کنوں میں جن رہتے ہیں۔ ’

‘اس وقت ہم کچھ نہیں جانتے تھے۔ ’

‘ہاں۔ اس وقت ہم کچھ نہیں جانتے تھے۔ دنیا کی کسی بات کا پتہ نہیں تھا۔ شاید انہیں دنوں ہم اپھے تھے۔ ’ شیریں اداں ہو گئی۔

ایک یاد سے دوسری یاد، دوسری یاد سے تیسری یاد، کس طرح سب یادیں ایک دوسری میں بینیہ ہوئی، آپس میں گھٹتی ہوئی تھیں۔ تو یوں کی ایک بی رڑی کچھ سمجھی ہوئی کچھ اچھی ہوئی۔ یادیں امند گھنند آتی چلی جا رہی تھیں۔

‘اخلاق تمہیں یاد ہے جو یہی کے احاطہ میں وہ جو پڑھ رہے تھے نا، کتنے گھنے اونچے پڑھ رہے تھے۔ ’

وہ جو آدم کا پڑھ تھا کتنا ہرا بھرا اور گھننا تھا۔ ایک دفعہ ہم چڑھتے چڑھتے کتنے اونچے چڑھ کئے تھے؟ اور یہ کہتے کہتے وہ اچاہک روک گئی۔ میں بھی ٹھٹھک گیا۔ ایک دک سے سب کچھ یاد۔

آگئی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب شیریں نے نیانیا دوپہر اڈھنا شروع کیا تھا۔ سینہ

اب ڈھکا رہنے لگا تھا اور ناک میں نیم کا فقط تھا۔ اب نہیں دنوں تاک چھڈی تھی۔ میری انگلی پار بار اس کی ناک پر جاتی تھی۔ کتنا بد کتی تھی میری اس حرکت سے؟ مرت چھوڑ دی۔ میری ناک دکھتی ہے۔ اصل میں نیم کے شکنے کے ارد گرد جو جگہ سرخ ہو گئی تھی اسے چھوڑنا مجھے اچھا لگتا نہ تھا۔ پھر جب وہ بد کتی تھی نہ اور بھی اچھا لگتا تھا وہ ایک گرم دل پھر تھی۔ ہم دونوں خس کی ٹیوں والے بڑے گرے سے چکے سے نکل کر احاطہ میں پیڑوں کی چاؤں میں بھکٹے پھر رہے تھے۔ ہر سے بھرے گھنے آم کے بیڑے کے پنجے پیسے کر ہمارے منہ میں پانی بھرا کیا۔ یہ بڑی بڑی اسیاں لٹک رہی تھیں۔ ہوا کے جھونکے کے ساتھ کس طرح امراتی تھیں۔

”اوہ اسیاں توڑیں۔“ میں نے تجربہ پیش کی۔

”بہت اونچائی پہ ہیں۔“

”پھر کیا ہوا؟“

سہارا دے کر شیریں کوستنے سے اد پر کھسکایا۔ پھر خود پک کر چڑھ گیا۔ پھر تم دوڑ پکنے سے دوسرے گدے سے پر اد مرے گدے سے تیرے گدے سے پر چڑھتے چلے گئے۔

”بس بھئی۔ اب اور اد پر نہیں جائیں گے نہیں تو گر پڑیں گے۔“

واقعی ہم بہت اد پچلے گئے تھے۔ اور پتوں میں چھپ گئے تھے۔ پتوں میں چھپے ایک ڈال پہ پاس پاس بیٹھے ہم اسیاں توڑ کے کھاتے رہے۔

”بہت کھٹی ہے۔“ اس نے منہ نگاہ کے کہا۔

”پھر میں چھووا۔“ میں نے اس کے ہاتھ سے پک کر اسیا اپنے منہ میں کھلی۔

”کوئی بھی کھٹی نہیں ہے۔ بہت منے کی ہے۔“

”تااری اسیا ہمیں دیدو۔“

میں اس کی درخواست کو خاطر ہی میں نہیں لایا۔ کتر کتر کے مزے لے لے کر

کھانا چلا گی۔ اس نے چھیننے کی میں نے بچانے کی گاہشش کی۔ اس چھین جھپٹی میں میرا باتوں
اس کی ناک پر جائے گا۔ وہ تڑپ ہی تو گئی۔

"ادنی مر گئی"

"بچوٹ لگ گئی۔ اچالا میں بچک کرتا ہوں"۔ میں نے انگلی کی پورمنہ کی بھاپ سے
گرمگی اور چھمدے سے ہوئے نہتھنے پر اسے آہستہ آہستہ بچرا۔ ایک دفعہ، دو دفعہ، میں
دفعہ۔ اسے آرام آتا چلا گی۔ انکھیں مند قیچل گئیں۔ میں نے منہ ناک کے قریب لارک دکھنی
جگہ کو بجا پ دینی شروع کر دی۔ پھر آہستہ سے ہونٹ اس جگہ پر نہ دیے۔ کتنی دیر
رکھے رہا۔ ہم دنوں اس ناک جگہ میں ایک گھنے پہ نیچے بیٹھے کتنے قریب آگئے تھے۔
جیسے ایکدوسرے کے ساتھ چپک گئے ہوں۔ دو پہ مرنکتے مرنکتے نیچے جاگا۔ اس نے
ہڑپڑا کر انکھیں کھولیں۔ اگر مرنکتے ہوئے کہا : "ہٹ، میرا دوپٹہ گر گیا"۔ بغیر دوپٹے کے
لے دیکھ کر میں کتنا حیران ہوا۔ یہ دہی شیریں تھیں کہ جب ابھی روپٹہ اور رضا شروع نہیں کیا
تھا تو باکل رٹکوں کی طرح لگتی تھی اور اب..... اس نے نیچے گھورتے دیکھا تو
پتا گئی : "بے شرم" اور درخت سے پچھا اتر گئی۔

ہم دنوں یادوں کی شادابِ ادب سے والپس آگئے تھے مگر سپٹا نے ہوئے تھے جیسے
ابھی ابھی یہ واقعہ گذرا ہے۔ شیریں کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا تو اس نے بوجان کی نبض دیکھنی
شروع کر دی۔ پھر سانس کی آداز کو غور سے سنا۔ گھبر اگئی:

"اخلاق دیکھو، تماں اماں کے سانس کی آداز کسی ہے؟" پھر بہت عجلت میں زبیدہ

کو چھنجھوڑ کر اٹھایا۔ "بجانی، اذر اخشوتوسی؟"

زبیدہ ہڑپڑا کر اٹھ جمیں۔ "کیا بات ہے؟"

"ذرماں کے دیکھو۔"

زبیدہ دوڑ کے بجان کے سرماں نے چہنی۔ سانس کی آداز غور سے سخن ساخت تشویش

کے لمحہ میں بولی : " یہ تو سانس چل رہا ہے ۔ "

میں نے گھڑی پہ نظر ڈالی ۔ " اب تو صبح ہونے کو ہے ڈاکٹر کوفون کہتا ہوں ۔ "

فون کی طرف لپکا ۔ ڈائل بار بار گھپلیا ۔ نمبر نہیں مل رہا تھا ۔ شیریں نے پکارا :

" اخلاق ٹیلی فون کو چھوڑو ۔ بیان آ کے تانی اس کے قریب بیجو ۔ "

میں نے شیریں کے لمحہ کی گھبیرت سے اندازہ لگایا کہ بوجان پر کوئی گھڑی گزدرا ہی ہے ۔ ٹیلی فون چھوڑنے کا سامنہ سے بوجان کے قریب آ کر سڑانے کھڑا ہو گیا ۔

ہم تینوں کھڑے رہے ۔ بوجان کا سانس چلتا اکھڑتا دیکھتے رہے ۔ سانس چلنے آنکھ کے میں بند ہو گیا ۔ شیریں نے جھک کر دیکھا ۔ جسم کو چھوٹا ۔ پھر یوں کیا کہ بہت آہستہ سے بوجان کی آنکھیں بند کیں ، گردن بہت دھیر سے سیدھی کی ۔

" بحال بیر سیدھے کر دو ۔ "

اور پورے بدن کو چادر سے ڈھانک دیا ۔ اس طرف سے فراعنہ پاکر میرے قریب آئی ۔

ڈبڈ باقی آنکھوں سے مجھے دیکھا ۔ " اخلاق ۔ تانی اماں ہمیں چھوڑ گئیں ۔ اور میرے سینے سے گک کر سکیاں بھرنے لگی ۔ میں نے کتنی مشکل سے لے سنبھالا ۔

غور ڈی دیر میں شیریں خود سنبھل گئی سو و پہ کے آپنے سے آنکھیں پوچھیں ۔ ایک اس کی ذمہ داری کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی اور بہت سمجھیگی سے مجھے اور زیدہ کوہہ ایات دینی شروع کر دیں ۔

" اخلاق عزیز دل کو اعلان کر دو ۔ "

اس ہدایت نے مجھے بو کھلا دیا ۔ ہمارے کون عزیز ہیں اس ثمر میں مجھے تو کسی کے متعلق معلوم نہیں ہے ۔

" میں تباہی ہوں ۔ فون لاڈ ۔ "

میں فون اٹھالا یا ۔ اس نے پرس سے ڈاڑھی نکالی ۔ نامے لے کر فون نہ برتائی گئی ۔

میں داخل گھا تا گیا۔ میں حیران تھا تھے نہ مانے سے اس شہر میں رہ رہا تھا اور اس کے
ہی نہیں تھا کہ اس شہر میں ہمارے کتنے عزیز موجود ہیں۔ وہ انہیں دنوں اس شہر میں وارد
ہوئی تھی اور اس کے پاس ایک ایک عزیز کا بورا پتہ محفوظ نمبر کے موجود تھا۔

ٹپیریں۔ تم کل بھی دفتر نہیں گئیں۔ آج بھی نہیں گئیں۔ اپنے دفتر کو اطلاع تو دیدی
ہوتی۔ مجھے نمبر تراویث میں فون کر دوں۔“

”دفتر کو اطلاع ہے۔ جب مجھے پتہ چلا تھا تب ہی مجھے ایک دھڑکا سا گگ گبا تھا
دفتر میں اطلاع کر کے ادھر آئی تھی۔“ رُکی، پھر بولی۔ ”میں کتنی دور سے کھینچ کر ہیاں پہنچی ہوں۔
بے نکر نیو یارک میں بیٹھی تھی۔ سان نہ گمانہ اچانک اپنے اٹھی ٹیوٹ کی مرد سے ٹیم کا را دھر کا
دورہ نکلی آیا اور میرا ناماً اس میں آگیا۔ لبستاں اماں کی صورت دیکھنی تھی۔ . . . ان میں
صورت تو دیکھلی۔ اپنی صورت نہیں دکھا سکی۔ . . . لبست میں سے کوئی ہرگئی جیسے اپ بیا۔
آئی تھی دیسے ہی پہلے میں ادھر آجائی۔ کئی دفعہ اما دہ بھی کیا گہر۔ . . . پھر کہتے کہتے چپ
ہو گئی۔

ذبیدہ کہنے لگی۔ ”آخری دنوں میں تو ایسا ہو گیا تھا کہ خاندان کے ایک ایک فرد کا نام
لے کر یاد کرتی تھیں۔ تھمارے بارے میں کتنی مرتبہ اخلاق سے پوچھا۔ اے جیشے، ٹپیریں کا
پتہ کرو ادھر آئی گیوں نہیں؟“

”ماں۔ بندرگ تو پکڑ بڑوں سب کو یاد رکھتے ہیں۔ خاندان کتنا بکھر گیا تھا۔ مگر ایک
ان کی ذات کی وجہ سے آپس میں ایک تعلق قائم تھا، جیسا کیسا بھی تھا۔ اماں اس خاندان
کی آخری بندرگ تھاں۔ . . . ہمارے مردوں پر آخری سایہ۔ اب ہمارے مردوں پر۔“

کوئی سایہ نہیں ہے۔۔۔ شیریں کی آواز بھرا نے لگی تھی چپ ہو گئی۔

”بہت ڈھار کس تھی ان کے دم سے۔۔۔ بوجان نہ ہڈیں تو اٹھ قسم میرا تو اس گھر میں
دم الٹ جاتا۔۔۔“

”بھابی، آپ نے بوجان کا حوالی والا زانہ نہیں دیکھا۔ حوالی انہیں کے دم سے حوالی
نظر آتی تھی۔ اخلاق و تمیس یاد ہے۔ ان کی ڈاٹ سے ہماری میامراجاتی تھی۔۔۔ آپ رے باپ
جتنی بھر بان تھیں اتنی ہی سخت بھی تھیں۔ جب آپے پھر کھٹ پہ سامنے پاندھان رکھ کر اور
بائہمیں سروط لے کر بنیٹھی تھیں تو کتنا بد بہ ان سے ٹپکتا تھا اور کس وقار کے ساتھ
حکم دیتی تھیں۔ نوکر جاگر اچھوٹے بڑے اسب کی ایک ایک حرکت پر ان کی نظر ہتی تھی۔۔۔
”مگر یہاں آگر باکل بدل گئی تھیں۔۔۔“ میں نے بتایا۔۔۔ کسی معاملہ میں دخل نہیں دیتی تھیں
بس جیسے حوالی سے نکل کر مر جھاگئی ہوں۔۔۔ پھر مر جاتی ہی چل گئیں۔۔۔“

”وہاں کتنی سرخ و سفید تھیں۔۔۔ اور اس شرنی کی چھینٹ دالے تنگ پامجامہ میں انکی
پنڈلیاں کتنی کسی کسی نظر آتی تھیں۔۔۔“

”اب تو یہ حال تھا۔۔۔ ذبیحہ نے کہا“ کہ پڑھ یاں ہی پڑھ یاں۔۔۔ تو لہ پھر گوشہ رہ گی
بُوگا۔۔۔ باقی ہڈیاں ایسی کہ ایک ایک گن لو۔۔۔“

بوجان اپنے چھر خبدن کے ساتھ میرے تصور میں گھوم گئیں۔۔۔ عمر کا سفر بھی کتنا تباہ
ہوتا ہے اور دلت آدمی کے ساتھ کیا کچھ کر دا تا ہے۔۔۔“

”ہاں وقت“۔۔۔ شیریں بس آہستہ سے اتنا کہہ کر چپ ہو گئی اور افسر دہ بھی۔۔۔

شیریں ہمارے ساتھ سویم تک رہی۔۔۔ کتنا گھن مل کر رہی جیسے برس برس سے ہم اسی طرح

گھلنے ملے چلے آرہے ہیں۔ غیریت کا، دری کا ذرا جو اس نے احساس ہونے دیا ہو۔ ہر دقت باتیں۔ ان دو ڈھانی دنوں میں کتنی باتیں کر ڈالی تھیں ہم نے۔ سب چڑاغ ہوبی کے دنوں کی باتیں۔ ہر بات کی ایک ایک تفصیل۔ اپنے سارے پچھن و کپن کو کھوند ڈالا۔ مگر اس خفر میں ہم دونوں ایک مقام پر جا کر رک جلتے تھے۔ بس ایک دفعہ میں نے جھیکتے جھیکتے اس سرحد کو عبور کرنے کی گوشش کی تھی۔

مگر شیریں نے اتنی تیزی سے بات کافی کہ دوبارہ سرحد عبور کرنے کی ہمت ہی نہیں پڑی۔

سویم کے دوسرا سے دن اس نے اپنے دفتر فون کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں گاڑی دیوار سے آن گئی۔

"و گاڑی آگئی۔ بجا بی میرا جانے کو باکل جی نہیں چاہ رہا مگر دستِ رُ کی وجہ سے جانا پڑ رہا ہے"

ذبیحہ نے کتنے تشكیر ایز لجھ میں کہا: "شیریں، تم نے ہمارا بہت ہاتھ بٹایا۔ تم نہ ہو تو ہم کیا کرتے۔ یہاں کون تھا ہمارا۔ جب بوجان کی حالت بگزی تھی تو میرے تو ہاتھ پا پہ بچول گئے تھے کہ اگر ایسی دیسی بات ہو گئی تو میں اکیلی کیا کر دیں گی۔ اللہ قسم تم تو باکل رحمت کافر شتم بن کر آئیں"

بجا بی۔ تم تو میں میرا شکریہ ادا کر رہی ہو۔ جیسے میں کوئی غیر ہوں۔ اور میں نے آکر کیا کیا۔ تائی اماں نے تو مجھے خدمت کا موقع ہی نہیں دیا۔ یہ کہتے کہتے اس کی سنکھیں پھر بچیگ گئیں۔

جب وہ کار میں بیٹھنے لگی تو میں نے تقریباً کار کے اندر منہ ڈال کر آہستہ سے کہ جیسے راز کی بات ہو:

"مسنو!"

ہاں ۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا۔

"آڈگی؟"

تمل کیا۔ پھر آہستہ سے کہا : "اچھا۔"

۱۲

دروازے پر کسی گاڑی نے ہارن دیا میرے وجدان نے کہا کہ ہونہ ہو دی ہے۔ پک کر دروازے پر گیا دی تھی کتنی کھل جو نظر آرہی تھی۔ پچھے دون تو سوگ کے دن تھے ایک زانے کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا، دیکھ کر حیران ہوئے، اس سوت کی فضائیں بل کر بیٹھے، گزرے دونوں کو یاد کیا۔ جانا کہ اپنے آپ کو پار ہے میں کم از کم مجھے تو بالکل ایسا اگر رہتا کہ جیسے میں لمحو گی رہتا اور ادب اپنے آپ کو پانے لگا ہوں۔ ایک غم نے ہمارا علاپ کرایا تھا اس غم نے اپنا کام انجام دیا اور چھپت گی۔ کوئی غم پاسیدار نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ ناپاسیدار سوت کا غم ہوتا ہے جس دن بوجان کا استھان ہوا ہے اس دن ہمیں دنیا انہیں نظر آرہی تھی۔ مگر دوسرے ہی دن انہیں چھپت گیا۔ باقی شرمند ہو گئیں گوریا بوجان کے گزر جانے کا مقدمہ ہی رہتا کہ اس بہانے ہم اپنے لھوئے ہوئے دونوں کی تلاش میں نکلیں اور ادب تو سو نہ ہو جبکہ کئی دن ہو چکے تھے سوگ کی فضا بالکل چھپت ہے اس گھری وہ کتنی بخوبی بخوبی نظر آ رہی تھی۔

”ارے شیریں تم؟“

”پھر تم نے حیرت کا انہصار کیا۔ مجھے میں کیا ہے کہ جب مجھے دیکھتے ہو جیران ہوتے ہو؟“

”حیرت کے پردے میں اصل میں سرت کا انہصار ہوتا ہے۔“

”کار سے اترتے ہوئے بولی“ آٹھ ستر میں کچھ کوئی ناش اپن ہو رہی ہے۔

چلو گئے نہیں؟ میر کہتے کہتے اندر آئی۔ بھابی فوراً تیار ہو جاؤ۔ تمہیں پینگ کی نمائش میں لے کر
چلتے ہیں؟

”شیریں کسی باتمیں کر رہی ہو۔ اگر مجھے کوئی آگیا تو کیا کہے گا کہ ابھی دسوال بھی نہیں
ہوا، بلیں بہونے سے سرو تغیریخ شروع کر دی؟“
شیریں شرمذہ ہو گئی۔

”اچھا ایسا کرتے ہیں؟ میں نے تجویز پیش کی۔“ میں شیریں کو کہنی دیتا ہوں۔ نمائش دیکھنے
تو بہر حال مجھے جانا ہی تھا۔

”یہ دھیک ہے؛ زبیدہ نے کہا۔ تم ہواؤ، کوئی ایک تو گھر پر رہے۔“
کتنے خوش خوش ہم گھر سے چلے گئے شیریں کتنی چمک رہی تھی۔

”ایک تجویز؟“ مجھے دفعہ سوچھی۔

”کیا تجویز ہے؟“

”نمائش کو نسی صحیح وقت یہ ادنی ہو جائے گی۔ پہلے ایک ایک پیال چائے ہو جائے
جل کر کی پسکون گوٹے میں بیٹھتے ہیں؟“

شیریں نے تجویز بلا تکلف منظور کر لی۔ گاڑی اور ستر کی بجائے کیفے و کٹوریہ کی
عمر مل گئی۔

کیفے و کٹوریہ کے ایک خاموش گوٹے میں ہم کتنی دیر بیٹھے رہے، مشترکہ یادوں
کے سہارے مااضی میں تاک جھانک کرتے رہے۔ اخلاق تمہیں یاد ہے ناجب.....
اوپر پھیل کسی کو یاد کو اس طرح کر دیا کہ ایک ایک تفصیل سناؤں۔ اس کا چپ ہونا۔ تو
میر داں ہو جانا۔“ شیریں تمہیں یاد ہے یہ ان دونوں کی بات ہے جب ہم.....“

”سب یاد ہے اخلاق مت یاد دلاؤ۔“ ابھی کتنی خوش تھی۔ ایک دم سے داس
ہو گئی۔

"یاد بھی نہ کریں۔"

"اس وقت تو یاد کر کے خوش ہو لیں گے مگر اس کے بعد کی ہو گا۔ یاد ہے ہم نے محر
بیٹھ کر چڑائی جو بیلی کی کتنی باتیں کی تھیں اس وقت بھیپی باتوں کو یاد کر کے کتنا جی خوش ہوا
تھا کتنا سکون ملا تھا۔ کتنے زمانے بعد اتنی خوشی آتا کون ملا تھا لیکن جب تمہارے یہاں سے
گئی تورات کو باسکل نہیں آئی۔"

"شیریں۔"

"ہوں۔"

"دہ دن والیں نہیں آسکتے؟"

شیریں نے مجھے عندر سے دیکھا۔ آہستہ سے ادا اس ہجہ میں بولی "نہیں۔"

"کیوں؟"

"یہ تو میں نہیں جانتی کہ کیوں۔ مگر جو وقت چلا جاتا ہے وہ والیں نہیں آیا کرتا۔ پھر
آہستہ سے جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو۔ یہی تو مشکل ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔ یہی ساری مشکل ہے میں ایک دفعہ دراسی چوک پوچھائے پھر
وقت باختہ سے ایسا نکلتا ہے کہ میرے ہیان کیاں سے کہاں نکل گیا۔
اس وقت کی ایک چوک —————"

شیریں نے فوراً بات بدلی "میرے خیال میں ایک ایک پیال اور ہو جائے۔"

دیر تک ہم دونوں چپ رہے چپ چاپ چائے پیتے رہے مگر میں بہت دیر
تک چپ نہیں رہ سکتا تھا۔ اندر ایک گردہ جو ڈری ہوئی تھی میر پھر کر دھیان دہیں آکر
امک جاتا تھا۔ دہاں رہتے تو تایید آگے چل کر کچھ ————— مگر اس کے فراؤ بعد ہی تو
یہاں آنا پڑگیا ————— کتنی مرتبہ میں نے سوچا کہ تمہیں خط لکھوں۔ ہمہت نہیں پڑیں سوچ
سوچ کر رہ گیا۔"

ویسے اس کے بعد تم بھی جلدی ہی یہاں آگئے تھے اسی شہر میں۔

"واقعی؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ کتنے دنوں یہاں رہے۔ پھر کراچی گئے ہیں؟"

"کمال ہے میں یہی سمجھتا رہا کہ تم وہیں ہو۔ اگر مجھے پتہ ہو جاتا کہ تم یہاں آگئی ہو تو پھر نہیں دیا کہ ہم یہاں آگئے ہیں ویسے ہمیں سب عزیزیوں کا پتہ تھا کہ کون کہاں ہے"

"حالات ان دنوں اتنے خستہ تھے کہ ہم نے کسی عزیز رشتہ دار کو پتہ ہونے اگر مجھے کسی طرح یہ پتہ چل جاتا... کہ تم یہاں ہو تو..."

"تو؟" پھیکی سی مسکا سہٹ کے ساتھ "تو پھر پاکستان کی تاریخ اُج مختلف ہوتی"

فوراً ہی کلائی پر گئی گھری دلکھی" دیر ہو چکی۔ چنانچا ہیے؟ اور کھڑی ہو گئی۔

"ڈتقرب توشتم ہو گئی ہو گی"

"خراب دلکھنے کا مرد بھی نہیں رہا۔ واپس چلتے ہیں"

"اقتحام میں شرکیب ہونا کی ضرور تھا۔ نائش ہی دلکھنی ہے وہ کل بھی دلکھی جا سکتی ہے"

دروازے پر آکر کاپٹہ سے گاؤں کی روگی۔ میں نے اترنے پوئے اسے دیکھا اُندر نہیں آؤ گی؟"

"نہیں بہت دیر ہو گئی ہے بھابی سے میری طرف سے معذرت کر دیا۔"

"تو نائش کل دلکھنے جاؤ گی... . . ."

"ہاں۔ میں نہیں فون کروں گی۔"

"یا میں یاد کراؤ؟"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے میں آؤں گی ماں کی وقت جس وقت اُج آئی

تھی؟ سوچ کر مگر ایک بات ہے؟

”کیا؟“

”بجا بیکھیں گی کہ میرے بیان کو یہ عورت رذرا کہاں اڑا کے لے جاتی ہے۔“

”جب روز کا پروگرام بنے گا تب اس پیسو پر عذر کریں گے۔“

اس پر کھلکھلا کر سنبھالی ”اچھا۔ رخصت۔ فوراً ہی موڑ رکھ دی کر دی۔

”دکٹور یہ کیفیت کی طرف نہ چلیں؟“ میں نے تجویز پیش کی۔

”کوئی لازم ہے کہ جو کل کیا تھا وہ آج بھی کریں۔“

”دیکھیں چاۓ تو کہیں نہ ہیں چل کر پینی چلئیے ان سخنوں نے تو کو کا کو لا کی ایک بول ہاتھ میں نکھادی۔“

”بڑی فضول بات ہے تو واضح کا یہ کیا طریقہ موگوں نے نکالا ہے۔“

”تو پھر گاڑی دکٹور یہ کی طرف موڑ لو۔ چاۓ تو بہر حال پینی ہے۔“

”مگر یہ کی ضرور ہے کہ آج بھی چائے اسی کیفیت میں پی جائے۔“

”ہاں کسی خوشنگوار تجربے کو دہرنے کی کوشش تو نہیں کرنی چاہیتے پھر بھی۔“

”شیری ہنسی۔ گاڑی۔ گاڑی موڑتے ہوئے بولی“ مگر ایک شرط ہے۔

”کیا؟“

”ہم آج ماضی کو نہیں کریڈیں گے۔“

”منظور ہے۔“

”مگر میں دکٹور پر کے اس خاموش گوشے میں پہنچ کر اس شرط کو باہکل بھول گیا۔“

فوراً ہی شروع ہو گی ”شیریں تھیں یاد ہے۔۔۔“

”بھول گئے کیا معاہدہ ہوا تھا یہ کہ ہم آج ماضی کو نہیں کریں گے یادوں کی نان منس آج نہیں چلے گی۔

”بڑی مشکل ہے میں تو جتنا بھی ہوں ماضی ہی میں ہوں۔“

”حال میں ہونے کی کوشش کر د۔“

”مگر کیسے؟“

”یہ کوئی دوسرا تو نہیں بتاسکتا۔ آدمی کو خود ہی یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ وہ یادوں میں مقید ہو کر نہ رہ جائے جس طرح بھی ہوا سے حال کی ساعتوں میں اپنے آپ کو دریافت کرنا ہوتا ہے۔“

اس وقت مجھے احساس ہوا کہ شیریں کو جو بزرگ بن کر نصیحت کرنے کی عادت تھی خاص طور پر مجھے وہ ابھی تک لگئی نہیں ہے میں نے بھی سعادتمند بن کر اس کی نصیحت سنی۔ پھر کہا ”جیک ہے ماضی کو نہیں کریں تھے۔ ماضی کچھ نہیں ہے جو کچھ ہے وہ آج ہے۔ آج کا یہ تھا، یہ ساعت جو اس وقت میرے اور تمہارے درمیان گزرنہ ہے۔“
اس بات پر تھوڑی گر ڈرائی ”پتہ نہیں“

”پتہ ہونا چاہیے۔ مشکل یہی ہے کہ اصل ساعت کا اس ساعت میں پتہ نہیں چلتا ہے۔ جب گزند جاتی ہے تب اس کا پتہ چلتا ہے۔ کامیاب آدمی وہ ہے جو ساعت کو اس ساعت میں پہچان اور گرفت میں لے لے۔“

”وہ کس طرح؟“

کتنی مخصوصیت سے شیریں نے پوچھا اور کس متذمت سے میرا جی چاہا کہ اسے گھوٹ میں بھینچ لوں اور کہوں ”اس طرح“

عین اس ساعت میں کتنی گزرنی ساعتوں میرے تصور میں منور ہو گئیں اور گزرنی ساعت ان کی چکا چڑنیں گم ہوتی چلی گئی۔

والپی میں عجب ہوا۔ جب کار اس تاریخی منی بس سٹاپ کے سامنے سے گئی تو مجھے ایک شکر سا ہوا کہ جیسے وہ کھڑی بس کا انتظار کر رہی ہے۔ میں بے چین ہو گیا "ذرار وکو"۔ شیریں نے گاڑی کو بریک دیئے۔ "کیوں" کی بات ہے؟

بہت محبت میں گاڑی سے اترتے ہوئے کہا "ابھی آیا"۔ تیزی سے بس سٹاپ کی طرف چلا۔ کار سٹاپ سے اچھی خاصی دور نکل کر کی تھی مجھے تیز تیز چلن پڑا۔ مگر جس وقت میں وہاں پہنچا اسی وقت کی بخت میں بس آن پہنچی۔ جلد دو چار سوار یاں کھڑی مخفیں جلدی سے سوار ہو گئیں۔ کہہ کردنے بس کا دروازہ بند کرتے ہوئے سیٹی دی اڈ بس چل پڑی۔ میں نے زمانہ نشستوں کا جلدی جلدی جائزہ لی کہ اگر وہی تھی تو انہیں میں سے کسی نشدت پر بھی ہو گی۔ وہ تو نظر نہیں آئی۔ میں بس تیزی سے آگے نکل گئی۔ مجھے کتنی جھنجڑا سڑھا ہوئی کہ میں بسیں آخر تیز کیوں چلتی ہیں۔

میں ہارا ہوا سادا پس آیا اور دروازہ کھول کر خاموشی سے شیریں کے برابر آن پہنچا۔ شیریں نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ اچھا ہی ہوا۔ پوچھہ بیٹھی تو میں جانے کیا اول پہل جواب دیتا۔ خواہ مخواہ وہ شکر میں پڑ جاتی۔ تو اچھا ہوا کہ اس نے یوں میرے محبت سے اتر کر جانے پر کسی تجسس کا انہمار نہیں کیا۔ خاموش گاڑی چلاتی رہی۔ اور صریح خاموش، اس شش دینچھے میں کہ کیا سچ پچ وہ تھی یا مجھے وہم ہوا تھا۔

لھر پہنچنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ مجھے اتنا خاموش نہیں رہتا چاہیے تھا۔ کوئی نہ کوئی بات کرنی چاہیے تھی کہ وہ بلا وجہ کسی شکر میں نہ پڑ جائے مگر اس تردید نے زیادہ طول نہ پکڑا۔ میں اپنی ابھمن میں چکنا ہوا تھا۔ بار بار خیال آتا کہ کیا وہ تھی یا مجھے ممحض وہم ہوا تھا کہ وہ ہے خیاس وقت تو یہ سوچ کر اس ابھمن کو رفع و فتح کر دیا کہ میں اب کونسا اس کے عشق میں بتا ہوں جو اس بارے میں زیادہ تردد کروں۔ وہ تو بس ایک تجسس تھا کہ دیکھیوں تو سہی کہ کیا وہی ہے اگر تھی تو یہ ہوا نہیں تھی تو یہ سوچا۔ مگر صحیح ہونے پر جب میں دفتر کے پیسے چلنے لگا تو یوں ہی مجھے خیال آیا کہ اگر

وہ واپس آگئی ہے تو پھر اس کا دہی ورد ہو گا کہ دفتر جانے کے لیے منی بس سینڈ پر پہنچا اور منی بس کا انتظار کرنا۔ سوچا کہ محدود توكیا جائے کہ وہ واقعی آگئی ہے تو میں نے سکون در گھر بیٹھوڑا اور دفتر کے لیے پہلی گھر سے نکلا۔ اسی رُپ پر پہنچ کر منی بس کا انتظار کرنے لگا وہ تو دہاں نہیں تھی۔ ایک دیگن آکی، اسے نکل جانے دیا دوسرا آکی، اس میں بھی سوار نہیں ہوا۔ دیر بعد تیری آئی۔ کیا کرتا وہ تو کہیں نظر نہیں آ رہی تھی دیگن میں سوار ہو گیا دوسرے دن پھر بھی کیا مگر وہ نظر نہیں آئی۔

پھر سوچا کہ کیوں نہ اس کے دفتر سجا کر دیکھ دیا جائے۔ سو اس کے بینک میں جا کر ٹوہلی۔

" ذکریہ احمد؟ — وہ تراب یہاں نہیں ہوتی ہیں "

" مُرانسٹر ہو گیا کیا؟ "

" وہ تو بینک ہی چھوڑ گئی کسی فرم میں اسے طہل مل گئی ہے۔ "

" آپ اس فرم کا پتہ بتا سکیں گے؟ "

ایک نے دوسرے سے، دوسرے نے تیرے سے پوچھا " یار وہ ذکریہ احمد تھی نہ۔ وہ کس فرم میں گئی ہے؟ "

سب انجانے بن گئے " پتہ نہیں جی۔ بہر حال یہاں سے چلی گئی ہے۔ "

ان کا اس جواب پر مجھے تشویج نہیں ہوا۔ دفتر والوں کی ایک خاص ذہنیت ہوتی ہے ان کے درمیان کوئی رُذنکی کام نہیں کرتی ہے تو وہ کسی باہر والے کو اس میں دیکھ پیلتے نہیں دیکھ سکتے۔ اس کے متعارف کبھی کچھ پوچھنا پڑتا ہے تو کبھی صحیح نہیں بتاتے مگر دفتر والوں پر کیا موقف ہے کوئی بھی شخص کسی دفتر سے کو محبت کرتے نہیں دیکھ سکتا۔ ویسے تو ہر آدمی ہی ہر آدمی کا دشمن ہوتا ہے مگر محبت کرنے والے کے خلاف تو متعارف معاذ قائم ہو جاتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس سے محبت

گرہا تھا میں نے اپنے آپ کو مطلع کیا کہ تم نے محض تجسس کے طور پر تو ساری پوچھ چکی ہے، کسی جذباتی وابستگی کی بن پڑنیں۔

"بوجان کے چالیسویں کا انتظام کرنا ہے" زبیدہ نے مجھے نوٹس دیا۔

"اچھا؟" بوجان کے چہلئم کو تو میں بھولا ہی بیٹھا تھا۔ "کی انتظام کرنا ہے"

"ایک توبہ عزیزیوں کو اطلاع دینی ہے"

"عزیزیوں کو اطلاع۔ یہ تو بہت مشکل کام ہے مجھے تو کسی کا پتہ بھی معلوم نہیں ہے"

"شیریں کو سب کے پتے معلوم ہیں اس وقت بھی اس نے سب کو فون کئے تھے وہ تو ایسی گئی کہ چھرائی ہی نہیں"۔

تب میں چونکا میں اس کے چکر میں شیریں کو بھول ہی بیٹھا تھا۔ اب خیال کیا کہ وہ تو ایسی گئی کہ چھرائی ہی نہیں۔ سو چند پر یاد آیا کہ جس شام ہم ناش دیکھنے لگئے تھے اس شام کے بعد سے شیریں نے اپنا پتہ نہیں دیا۔ وہ خود آئی نہ فون کیا اسے ہوا کیا۔ پہلے شیریں پر تعجب ہوا۔ چھرائے آپ پر تعجب ہوا کہ اس شام کے بعد مجھے شیریں کا خیال ہی نہیں آیا۔ دھیان سے ایسی اتری کہ اب جب زبیدہ نے اس کا ذکر کیا تب اس کی یاد آئی تعجب۔ اتنے قرب کے بعد اتنی بیگانگی۔ لکھو کر ایک ٹمپر کے بعد اسے پایا تھا۔ پاکرا اتنی تاقدی۔ آخر کیوں۔ تب میں نے ہوش کی دوالي۔ اپنے آپ کو سریش کی کہ کس کے پچھے خراب ہو رہے ہو۔ وہ ہے کہاں جو ملے گی۔ وہ تو ساری اپنی آواز میں بھتی تم نے جانا کہ وہ آواز کے سوا بھی ہے۔ شہزادے نے وہ خوش رنگ بھول لپنے گھلان میں سچا دیا چھرلوں ہوا کہ روزِ صبح کو جب وہ جاگتا تو اپنی انگلی میں ایک جو صبورت نیکنے جڑی انگھوٹھی دیکھتا اور حیران ہوتا۔ کتنا حیران ہوتا کہ یا عالم الغیب رات کے پر دیں کون آتی ہے اور روز ایک نئی ذمکوٹھی مجھے پہنچاتی ہے۔ آخر اس نے رنجگے کی مٹھانی۔ کافی انگلی تھوڑی کاٹ کر اس میں مرچیں بھر لیں کہ درد سے نیند نہیں آئے

نگی مسخرناک پڑ دیا جیسے سور ہا ہے جب رات آدھی گزری تب بچوں ہمکا کہ جہک سے اس کا ایوان سارا ہمک گیا۔ پھر دھیرے دھیرے اٹھتے قدموں کی آہٹ سنائی دی پھر اس نے جانا کہ اس کی انگشت میں انگوٹھی پہنائی جا رہی ہے۔ شوق دید میں اس نے آنکھیں کھولیں اور پھر بڑا کراچھ بیٹھا۔ سمجھا سے میں اس کی پنجمی نظر آئی۔ پھر دم کے دم میں دہ بچوں میں سما گئی ادھر دہ در طہیرت میں غرق ہوا کہ وہ کون تھی جو بچوں سے خوشبو کی مثال برآمد ہوئی اور اسے انگوٹھی پہنائ کر صورت دکھائے بغیر بچوں میں چھپ گئی۔ تب بچوں کے بارے میں اس نے تجھیس کی مگر اب گلدان خالی پڑا تھا۔ حیرت میں ایک اور حیرت کہ یا اہنی بچوں کہاں گی۔ تب مدبدروںی خاک ابری قسمت میں اس کی لکھی گئی جنتکوں باخنوں میں ٹوہ لیتا پھر تھا، حیران دپریشان ہوتا تھا کہ اے جہاں زنگ دبو کے پیدا کرنے والے، باقاعدے عالم میں وہ کون گھشن ہے جہاں یہ تنگوںہ بچوں تھا اور یہ بچوں بچوں تھا۔ بچوں میں کون گلبدن پر می پیکر سما یا تھا۔ انگوٹھی اس نے کیوں پہنائی، صورت کیوں نہیں دکھائی۔

"میں تو جاؤں تم شیریں کوفون کر کے بدا پو۔ وہی آکے انتظام کرے گی؛"

"ہوں نہیں۔ آج ہی اسے فون کر دو۔"

"اچھا۔" بات میں زبیدہ سے گر رہا تھا، دھیان کہیں اور تھا۔ تو وہ ساری اپنی آواز میں تھی نادان تیری بیتابی سے وہ پراسار رشتہ جو اس آواز کے ساتھ پیدا ہوا تھا توٹ گیا۔ ادھر سے جو عطا ہونا تھا عطا ہو چکا۔ وہ باب اب بند ہو چکا ہے۔ اب کوہ ندا سے آواز نہیں آئے گی۔

"دن بہت کم رہ گئے میں ابھی اسے فون کر دو۔" زبیدہ نے فون لا کر میرے سامنے رکھ دیا۔

مگر اس کا فون نمبر کیا ہے۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ اس سے فون نمبر معلوم کر کے نوٹ کروں؟“ یہ تو میں نے بات بنائی تھی اس نے جان کر مجھے اپنے فون نمبر نہیں بتایا تھا جب تک مجھی فون نمبر اس سے معلوم کرنا چاہا دہ طرح دے گئی۔ بہت لڑکے کے بعد میں اتنا پتہ چل سکا تھا کہ نیو یارک میں کوئی ایشین انٹی ٹیوٹ یا ساؤمنٹ ایشین نہیں، آر گنائزیشن، یا اسی سے ملتے جلتے نام کا کوئی ادارہ ہے جس کی سر وے ٹیم کے ساتھ وہ یہاں آئی ہے۔

”میرے پاس ہے اس کا نمبر؟“

”تھا رے پاس؟“ میں نے تعجب سے زبیدہ کو دیکھا۔

”میں، شیریں نے وقت بے وقت کے لیے مجھے اپنے نمبر لکھا دیا تھا۔“

”خوب“ میں نے دل میں کہا، کس واسطے سے اپنا پتہ مختونک پہنچایا ہے۔

زبیدہ نے نمبر بتایا۔ میں نے ڈائل گھما کیا۔ ہسیو میں شیریں ہیں؟“

”میں شیریں۔“ ادھر سے جواب آیا۔ وہ جا چکی ہیں۔“

”کتنی دیر میں والپس آئیں گی۔“

”وہ تو ہمیشہ کوارٹر نہ والپس چلی گئی ہیں۔“

”میں چکرایا۔“ ہمیشہ کوارٹر کی مطلوب ہے کیا مطلوب ہے آپ کا؟“

”جی ہمیشہ کوارٹر۔ نیو یارک۔“

”نیو یارک؟ میں سخت چکرایا کہ شخص کی کہہ رہا ہے“ میں آپ کی بات نہیں سمجھتا۔ نہیں تو سروے ٹیم کے ساتھ والپس جانا تھا، نہیں تو ابھی یہاں لا رہا کرنا تھا۔“

”جی ہاں بگران کا پروگرام بدل گیا۔ ایم جنسی میں نہیں والپس جانا پڑا۔“

میرے اندر تو ایک ملچھ پچھا گئی۔ کیسے چلی گئی۔ کیوں چلی گئی۔ خلط ہے تپہ نہیں

ادھر سے کون بول رہا تھا۔ ممکن ہے شیریں نام کی کوئی اور خاتون ہو جس کے بارے میں وہ بتا رہا ہو۔ مجھے خود جا کر معلوم کرنا چاہیے۔ میں فوراً ہی تو اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے ادھر سے صحیح جواب نہیں آ رہا۔ مجھے خود جا کر معلوم کرنا پڑے گا۔"

"ماں جا کر معلوم کرو لو۔ بھلا شیریں اتنی جلدی کیسے واپس چلی جائے گی اور اگر ان دنوں جانا ہوتا تو وہ ہم سے ذکر نہ کرتی۔"

"دفتروں کا عجائب عالم ہے کسی کے بارے میں پوچھو، کبھی صحیح اطلاع نہیں

ملتی۔"

بدھواس سپاپا ہوا دفتر پہنچا۔ پوچھ چکی۔ فران پر صحیح بتایا گیا تھا۔ شیریں نیو یارک چاہی تھی میں ایسے ہو گی جیسے بڑا سا پتھر گرنے سے ایک دم سے کشتی ڈول جائے۔ چلی گئی۔ ملگر کیوں؟ اور اتنی اچانک کہ مل کر بھی نہیں گئی ایم جنسی؟ کیا ایم جنسی ہو سکتی ہے؟ سو سو طرف دھیان گیا۔ کتنے امکانات، کتنے وسوسے دماغ میں پیدا ہوئے۔ کسی پہ جی تھکا نہیں۔ اور ایک دم سے بھی کی طرح ایک خیال آیا۔ میری تو کوئی بات گران نہیں گزدی۔ بخوبی دیر کے لیے میں چکر میں آگیا۔ ملگر بھر فوزا ہی اندر سے تردید ہوتی۔ تم اس کے لیے جب اہم تھے تب اہم تھے اب تم اس کے لیے اتنی اہمیت نہیں رکھتے تھے کہ تمہارا کوئی سلوک کوئی بات اس طرح اس پر اثر کرے کہ وہ اپنا سارا پروگرام تپٹ کر کے واپس چلی جائے۔ پھر؟ تو پھر کہا نیو یارک میں کوئی ایسا ہے کہ اس کی خاطر۔۔۔۔۔ مگر اس خیال نے مجھے اتنا وحشت زدہ کیا کہ میں نہیں پہچھے میں ہی اس کا لٹکا گھونٹ دیا۔ نہیں ایسا کوئی چکر اس کے ساتھ نظر نہیں آتا۔ ہو ہی نہیں سکتا۔

جاتے ہوئے میرے قدموں میں بھلی بھر تھی واپس ہوتے ہوئے قدم سو سو من کے ہو گئے۔ کتنے مصیبتوں سے اپنا بھمار کی بوجھ سنبھالے میں وہاں سے

نکلا۔

میرا ایک قدم ٹرینیگر سے بھری مال پر تھا، دوسرا قدم صحرائیں تھا۔ عذر کر پہلی پر
رہا تھا کہ ویرانے میں بچک رہا تھا۔ ٹرینیگر کا شور بے معنی تھا۔ میرے انداز سے
بڑھ کر شور مچا ہوا تھا۔ باہر کسی چیز کے کوئی معنے نہیں رہے تھے۔

۱۱۱۱۱۱

۱۱۱۱۱۱

۱۷

کتنی دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ میں خاموش بیٹھا ہوں۔ کتنی دیر بعد ہی میں اندازہ نہیں کر سکا بس ایسا لگان ہوا کہ خاموشی کی ایک صدی گزر گئی ہے اور تب مجھے کامر ٹیڈ کی موجودگی کا خیال آیا۔ کب سے کامر ٹیڈ آیا بیٹھا ہے اور میں نے اس سے کوئی بات ہی نہیں کی؟ وہ دل میں کیا سوچتا ہو گا۔ کب سے ہی میں نے ذہن پر بہت زور دلا کہ کامر ٹیڈ کس وقت آیا تھا کچھ یاد نہیں آیا۔ کامر ٹیڈ کو میں نے ایک نظر دیکھا۔ میرے اور اس کے درمیان خاموشی کی ایک صدی بھیلی ہوتی تھی مجھے اس سے بات کرنی چاہیئے میں ہونٹ کھونے لگا تھا کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ کہنے کے لیے میرے پاس کوئی بات نہیں ہے کوئی رسمی سی بات۔ آخر بات شروع کرنی ہے کوئی بھی ادھر ادھر کی بات کر کے بات شروع کی جا سکتی ہے مگر میری سمجھ میں کوئی بات ہی نہیں آئی۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ میں اندر سے خالی ہو چکا ہوں۔ کوئی خیال، کوئی احساس، کوئی بات، کوئی اغل بے جوڑ بات ہی سہی۔ دہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے ایک پیچارگی کے ساتھ کامر ٹیڈ کو دیکھا ورمیان میں بھیلی ہوتی خاموشی کی صدی کو عبور کرنا مجھے کس قدر مشکل نظر آ رہا تھا۔

"کامر ٹیڈ ۔۔۔؟" بالآخر میں خاموشی کی ہبہ توڑنے میں کامیاب ہو گیا کتنی بڑی ہم میں نے سر کی تھی ایک دفڑا دمی خاموش ہو جائے تو پھر زبان کھونا اس کے لیے کتنا مشکل مرحلہ ہوتا ہے مگر اب سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ آگے مجھے کیا کہنا ہے۔ خیر کامر ٹیڈ نے خود ہی میری اس مشکل کو حل کر دیا۔ "ہوں" اور اس کے ساتھ اس نے ایک لمبی جمائی

ل۔ وہ بھی شاید درنکل گی تھا اس کی مبی ہوں اور لمبی جما ہی بتا رہی تھی کہ مجھے سفر سے واپس ہوا ہے ”پھر کامرٹی سگریٹ ہی پوادُ“

میں نے فوراً سگریٹ کی ڈبیا کامرٹی کو پھر ادا دی اسے غور سے دیکھا ”کامرٹی“

”ہوں“

”بایار آج میں نے تمہیں بورگر دیا“

”نہیں کامرٹی“

”پھر چرخ بند کئے ہوئے کیوں بیٹھے ہو“

کامرٹی نے سگریٹ سلاکا۔ ملکش یا میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ابھی تک میں نے کامرٹی کے اس غیر معمولی روایتے پر دھیان ہی نہیں دیا تھا کہ میں خود اپنی دل میں گھم بھجا تھا اب خیال آیا اور تعجب پوکہ کامرٹی کو آج ہوا کیا ہے وہ تو آتے ہی شروع ہو جایا کرتا تھا۔ سوچا کہ شاید مجھے چپ دیکھ کر کامرٹی کو چپ لگائی۔ مگر یہ تو اس کے مزاج کے خلاف بات تھی کسی کا کیا سبی مود ہو، کوئی کسی پرشیافی میں ہو، کامرٹی کب اس پر دھیان کرتا تھا اس اچانک آدھکنا، میفلشوں اخبار دن سے بھرے اپنے تھیلے کو ایک طرف پٹھنا اور بیٹھنے سے پہنچے روانہ جانا۔ بات کوئی پورب کی، کوئی پھتم کی تان بہرحال انقلاب پر توڑنا۔

”اچھا کامرٹی یوں کرتے ہیں کہ چائے بنواتے ہیں چائے پی کر تمہارا مود بھیک ہو گا۔“ میں نے سوچا کہ شاید اس طور میر مود بھی کچھ بجائ ہو جائے۔

”نہیں کامرٹی“

میں نے کامرٹی کو تعجب سے دیکھا ”کامرٹی، چائے سے انکار کر رہے ہو“

”یہاں نہیں“

”ہاں یہ بات نہیک ہے کہیں باہر نکل کر بیٹھتے ہیں۔ چلو تمہیں آج ملٹن میں

چائے پلاتے ہیں۔ اور میں فوراً ہی کھڑا ہو گیا۔

"نہیں ملٹن میں نہیں۔"

"انٹر کان میں؟"

"نہیں کامرڈ۔ ایبٹ روڈ چلتے ہیں۔"

"ایبٹ روڈ؟" میں نے کامرڈ کو تعجب سے دیکھا۔ کامرڈ میں تھیں اندر کون اور ملٹن میں چائے پلانے پر آمادہ ہوں۔ تم ایبٹ روڈ کی بات کر رہے ہیں۔ وہاں کون محققوں رستوران ہے؟"

"بس ایبٹ روڈ چنا ہے۔"

"اچھا تھاری مرضی۔ میں تو تھیں ہائی کلاس چائے پلانے کی سوچ رپا تھا۔" ایبٹ روڈ کے اس بو سیدہ چائے خانے میں داخل ہوتے ہوئے کامرڈ بولا "یر جگہ بھی بدل گئی۔"

"بدل گئی۔" میں نے کامرڈ کو تعجب سے دیکھا۔ کامرڈ کیا کہہ رہے ہیں یوں تو بہت شروع میں بس سمجھ لو کر سٹالرے میں ایک دو دفعہ یہاں آیا تھا۔ جتنا میلا اس وقت تھا اس تھا اب ہے کمال ہے اتنے عرصے میں یہاں کچھ بھی تو نہیں پدلا۔ بالکل وہی نقشہ ہے اور یہ کہتے کہتے ایک تعجب نے مجھے آیا۔ تب سے اب تک لکھا زمانہ گذر چکا ہے مگر یہ جگہ دیسی ہی ہے۔ اتنی ہی میلی، اتنی ہی بو سیدہ۔

"وہ نہتھ؟" — نہیں یاد، وہ تو نقشہ ہی اور تھا۔ باہر کھلنے میں محرُّمی کی ایک لمبی تپاری رہتی تھی اس کے ساتھ ایک لمبی میز۔ دادا اسی بنچ پر آکے بیٹھا کرتے تھے لکھنی رونق ہوا کرتی تھی ان دنوں۔ ہر یوں کا بندہ نظر آتا تھا۔ سب دادا کے گرد جمع رہتے تھے لمبا ٹھٹڈاں سنس لے کر۔ اب ان میں سے کوئی بندہ نظر نہیں آتا اور ان سالوں نے وہ تپاری اور میز بھی یاں سے غائب کر دی؟

"کامرڈی، یاں باہر ہیں پیائی اور میز کے بیسے کوئی گنجائش نظر آ رہی ہے؟"

"ٹھیک کہتے ہو کامرڈی، ان دونوں تو یہاں سامنے بہت ساری جگہ خالی پڑی تھی۔

اب یاں پر سالی قدم رکھنے کی جگہ نہیں ہے؟"

کامرڈی کے اس کرنے کے ساتھ مجھے احساس ہوا کہ واقعی یہ جگہ تو بہت بدل گئی ہے۔
بٹیک چائے خانہ اندر سے نہیں بدلنا۔ وہی میں پن وہی بوسیں گی۔ مگر ارد گرد تو سارا
بدل گیا ہے کتنی کشادہ جگہ تھی اور اب قدم رکھنے کی جگہ نہیں۔ تنہ وزلت اور بڑھے ہونے
ٹرینیک نے اس گوشے کو کتنا پہلیت بنادیا تھا۔

"محب بات ہے یہ شہزادیوں سے خالی ہوتا جا رہا ہے اور جگہ پس بھرتی چلی جا رہی
ہیں۔"

کامرڈی نے تائید میں سر لایا۔ "ٹھیک کہتے ہو کامرڈی۔ سالا ہجوم آتا اور آدمی غائب۔
ایک وقت آنے والا ہے کہ یہاں سانس لین مشکل ہو جائے گا۔"

"وہ وقت آنہیں چکا ہے؟"

"بانکل بانکل۔" کامرڈی نے فوراً اپنی تصحیح کی۔ "پھر لوٹا" حالات اس زمانے میں
بھی خراب تھے۔ مگر زمانہ اچھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک لمبا عنظر لگایا۔ باکھل
خاموش کسی سوچ میں کھو یا ہوا۔ دیر بعد تھہ سے سر کالا۔ "ایک بات پوچھوں۔"
"پوچھو؟"

"تم نے کبھی محبت کی ہے؟"

"محبت؟ کامرڈی کے منہ سے یہ نام سن کر بیکن حیران ہوا۔" کامرڈی نہارا مضمون
تو انقلاب ہے اسی مضمون تک رہو۔"

"کامرڈی، نہاد میں بات مت ٹاؤ۔ میں اس وقت سخت سیریں ہوں۔"

"اچھا۔" اور پیس نے کامرڈی کو غور سے دیکھا۔ اس نے ٹھیک کہا۔ اس وقت وہ

بہت سمجھیہ تھا۔ یار کامرڈ بات یہ ہے کہ — میں سوچ میں پڑ گیا" یار یہ بتا نا بہت مشکل ہے۔"

"کیوں مشکل ہے؟ تم عورت تو نہیں ہو اس غریب کے لیے تو بتا دا قعی مشکل ہوتا ہے۔"

"یار کامرڈ بات یہ ہے کہ اس سوال کا دو لوگ جواب دینا مشکل ہے؛" "کوئی مشکل نہیں پہنچے آدمی نے یا تو محبت کی ہوتی ہے یا محبت نہیں کی ہوتی ہے اور ہاں کامرڈ ایک بات بتا دوں۔ محبت سے میری مراد ہے محبت۔ اب اگر تم نے کسی رُٹکی سے خدشت کیا ہے یا رومانس رُٹایا ہے یا کسی رُٹکی کے چکر میں چھپس گئے ہو تو وہ قصہ لگ ہے جیسے تم ایک زمانے میں ایک رُٹکی کے چکر میں تھے نا اس سے تمہاری ملاقات نہیں ہو یا رہی تھی۔ ممکنا نہ تھا کہ اس سے کوئے مجھے معلوم نہیں۔ میں اسوقت پر لٹائی کے کام میں دن رات جتار ہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ سالے بورڈوا ان کو تو اور کوئی کام ہے ہی نہیں۔ ٹھکانی سے بیگنا رکھلی۔ تو کامرڈ تھا کہ ملاقات اس سے ہو گئی تھی۔"

"ملاقات؟" میں کھینچنا سا ہو گیا۔ "پتہ نہیں اسے ملاقات کہنا چاہیے یا کیا کہنا چاہئے۔" "تو پھر خط بازی ہی ہوتی رہی؟"

"خط بازی؟ نہیں۔ خط بازی کی نوبت ہی نہیں آئی۔ وہ غائب ہی ہو گئی۔" "اچھا؟ کمال ہے کامرڈ۔ تم نے جان کو روگ تو اتنا لگا رکھا تھا۔ ہوا کچھ چھنہیں۔" "یہی تو میں کہہ رہا تھا کہ بہت بے ہنگم سکی بات ہے تمہاری زبان میں ہمیشہ جو۔ میری سمجھ میں خود نہیں آیا کہ میرے ساتھ یہ کیا ہوا۔ میں نہیں کیا جواب دوں۔"

کامرڈ نے سوچا۔ پھر کہا "بس کامرڈ، پتہ چل گیا، تم نے محبت کی ہے۔"

"پتہ چل گیا؟ کیا پتہ چل گیا۔ کامرڈ مجھے خود پتہ نہیں چلا کہ یہ معاملہ کیا تھا۔ نہیں کہے۔"

پتہ چل گی؟"

"کامرڈی ہے۔" کامرڈی مجہت اسے ہی کہتے ہیں بنی محضیں بھروسہ ہے میں نے ایک مرتبہ فاروق سے پوچھا تھا اس نے روحاں سیکھوں اور آنسوؤں سے بھروسہ ایک کہانی سندھی بیسی کہانی خالم تے سنائی کہ اس پر فلم بنائی جائے تو بہت جائے مگر میں نے سمجھ لیا کہ اس نامحتقول آدمی نے کوئی مجہت و جہت نہیں کی ہے لیں جب آدمی بھی بھول جھوٹے میں پڑ جائے اور یہ طے نہ کر سکے کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تو وہی مجہت ہوتی ہے جیسے میرے ساتھ ہوا۔"

"تمہارے ساتھ؟ کامرڈی، تمہارا تو پرخانہ ہی خالی ہے؟"

"میں بھی یہی سمجھتا تھا مگر خانہ خراب ہوتے دیر تھوڑا ہی سمجھتی ہے بخیر میں تو اسے بھول ہی گیا تھا مگر رات وہ مجھے یاد آگئی۔ سالی عجیب سی بات ہے۔ یاد آنے کی کوئی وجہ تو ہوتی۔ بس بلا وجہ بلا سبب یاد آگئی۔ اور بہت یاد آئی۔ پھر میں سونہیں سنکا۔" "اچھا؟" میں حیران کامرڈی کو دیکھ رہا تھا۔

"کامرڈی آگے مت پوچھنا۔"

"چلو نہیں پوچھتے؛ مگر پھر مجھ سے رہا نہیں گیا۔ ایک دو باہمیں کر کے پھر اسی موصوی رہا۔" کامرڈی؟ یہ تو میں نہیں پوچھوں گا کہ کون تھی، کیا قصہ ہوا۔ اس سے ہٹ کر ایک بات بتا دو۔ یہ افلاطونی مجہت تھی یا کچھ اور بھی قصہ تھا۔"

"کامرڈی، تم نے بے ڈھب سوال پوچھا ہے۔" رُکتے ہوئے کچھ تھجکتے ہوئے دیے تو افلاطونی بھی بھول بھروسہ ہی تھا۔ مگر ایک دفعہ — بس ایک دفعہ —

ہوا یوں کہ — پتہ نہیں کیا ہوا۔ کیسے ہوا۔ — بس وہ میرے بازوں میں جگڑی ہو گی اور میرے ہزار اس کے ہونٹوں کے ساتھ پوچست۔ چب ہو گی کسی خیال میں لکھو گی۔ پھر تھوڑی دیر بعد خود ہی بولا۔" کامرڈی، میری زندگی میں بس ایک

بوسہ ہے اور کچھ نہیں ہے؟"

"لبس ایک بوسہ؟"

"کامرڈی، ایک بوسہ بھی بہت ہوتا ہے آدمی اگر شکانے سے لیلے تو عمر بھر کے لیے کافی ہوتا ہے کیا سمجھے کامرڈی؟"

کامرڈی جیسے بات کر کے فارغ ہو گیا ہے، مگر میرے اندر ایک بیکھی شروع ہو گئی تھی میں چاہتا تھا کہ یہ ذکر مخنوڑا اور چلنے "تو کامرڈی، رات وہ نہیں بہت یاد آتی؟"
ہاں کامرڈی، پتہ نہیں کیوں اچانپ سے یاد آگئی۔ پھر رات پھر میں سونہیں سکا۔
"وہ گئی کہاں؟"

"کامرڈی، عورت کے بارے میں یہ نہیں پوچھا کرتے یہی تو اس کے بارے میں پتہ نہیں چلتا جسم سے آجائی ہے پتہ نہیں چلتا کہ کیسے آئی، کہاں سے آئی۔ ایک دم سے چل جاتی ہے پتہ نہیں چلتا کہ کیسے چل گئی، کہاں چل گئی؟"
"جھیک کہتے ہو کامرڈی، پھر تم نے اسے تلاش کیا؟"
"نہیں کامرڈی،"

"کیوں؟"

"بس گئی سو گئی، پھر تلاش بے سود ہے"

کامرڈی کی اس بات پر میں جھینجھلاگی "کامرڈی، العذاب کے معاملہ میں قوم مایوسی لوگوں سے ہو بگزندگی کے معاملہ میں تم نے قنوطی ہو۔"

"دیکھو کامرڈی، العذاب اور عورت میں یہی تفرقہ ہے العذاب تو آدے ہی آدے مگر عورت، وہ جا کر پھر کبھی نہیں آتی؟"

"یار کامرڈی، فتوے دینا پھوڑ دو۔ یہ زندگی ہے اس کے بارے میں قطعی حکم نہیں لگاسکتے؟"

"اپنھا کام رہی، پھر تم ڈھونڈو۔ ڈھونڈتے رہو؟"

"نہیں یار، میں اپنے بارے میں نہیں کہہ رہا۔ وہ تو قصہ ہی بہت پرانا ہو گیا۔ کام رہی زور سے ہنسا" کام رہی۔ یہ قصہ کبھی پرانا نہیں ہوا کرتا۔" پھر افسر دہ جو گیا۔ "یہی تو خراب بات ہے کہ تھی کہ پرانا ہو جائے مگر ذرا کسی پہانے یاد آجائے کم بخخت تازہ ہو جاتا ہے"

کام رہی بھیک کہہ رہا ہے۔ یہ بات کہہ کر جتنا وہ افسر دہ ہوا آتا ہی میں افسر دہ سو کتی دیر تک ہم دنوں چپ بیٹھیے رہے چپ بیٹھیے چائے پیتے رہے۔

"پھر لوں ہی میں بول اٹھا" دیے کام رہی، اس وقت میں نے دلچسپی اسے بہت

ڈھونڈا تھا"

"پھر ملی؟"

"لنا کہاں تھا۔ وہ تو بالکل ایسے ادھیل ہوئی۔ جیسے پرانی کہانیوں میں پرمی ایک جھلک دکھا کے غائب ہو جاتی تھی عزیب شہزادہ بنوں کی خاک چھانتا پھر تاھما۔ نتیجہ ڈھکا کے میں پات مگر میرے معاملہ میں کچھ اور ہی کل لکھدا"

"کیا؟"

"میں ڈھونڈ رہا تھا اسے۔ اور مل گئی وہ"

"وہ؟ وہ کون تھی؟"

"وہ بھی تھی۔"

"کام رہی، پہلیاں مت بوجھواو۔ بھیک بھیک بااؤ۔ یہ کون سا حصہ ہے؟" "یہ دوسر قصہ ہے۔ — نہیں۔ پہلا قصہ۔ اس میں وہیں رہتے ہوئے کھنڈت پڑ گئی تھی۔ جب میں ادھر آگی تو انکھا ادھیل پہاڑ ادھیل۔ اور اب تو میر دھیان ہی کہیں اور تھا۔ عین اس پیچے وہ اچانک سے آگئی۔ — یار کام رہی

کمال ہو گی۔ ایک دم سے سارا کچھ جو میں بھول بیجا تھا دھیان میں آگئا جیسے میں اسی ساعت میں واپس چلا گیا ہوں۔ مگر کیا ہوا کہ وہ ایک دم سے چلی گئی۔ جیسے ایک دم سے آئی تھی؟

”کامر ڈی ہی ہونا ہے اچانک سے آتی ہے۔ اچانک سے چلی جاتی ہے۔“
ایک دفعہ پھر چپ، وہ بھی میں بھی۔ اپنے خیالوں میں کم۔ میں اپنے خیالوں میں
گم۔

”یار کامر ڈی! آخر میں نے ہی خاموشی کی مہر توڑی“ تم بوگوں کے پاس تومبا دل نظام
ہوتا ہے۔ عشق کا نعم بدل انقلابی جدوجہد۔ وہ نہیں تو یہ۔ مگر ہم جیسے ادھر سے پہنیں
تو کہ صحر جائیں۔

”انقلابی جدوجہد“ کامر ڈی منھ سی منھ میں بڑا یا اور چپ ہو گیا پھر بولا“ دیسے
میں اب سوچتا ہوں کہ اس وقت میں اس کے پیچے گی ہوتا تو وہ واپس آہی جاتی مگر
اس وقت مجھ پہ سو وا سوار تھا کہ انقلاب لبیں اب آیا تو جہاں طرف سے نہیں ہٹنی
چاہیے ”لبائھنہ اس سانس لیا“ سار انقلاب بھی نہیں آیا اور وہ بھی چلی گئی۔

”کامر ڈی، وہ تو خیر چلی گئی۔ مگر انقلاب تو بقول تمہارے آؤے ہی آؤے آج
نہیں تو گل!“

کامر ڈی کو غصہ سگی۔ یاں پر سالا کوئی انقلاب و نعتاب نہیں آؤے گا۔“
”کیوں نہیں آئے گا؟“؟

”بس کامر ڈی، یاں یہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ سب سالے فرادی ہے میں۔ دیوس بکتے
کے نچے۔“ اور کچھ بھی کر ایک بی سانس میں کتنی گاہیں دے دالیں۔ پھر اپنے بھینی کو
میرے سامنے کر دیا۔ دیکھتے نہیں ہو۔ آج میرا خیلانا خالی ہے۔“

میں نے حیرت سے اس بھینی کو دیکھا جس میں پیغام اور اخبار مٹھیں بھرے

رہتے تھے "آج یہ خالی کیسے ہو گیا۔

"میں نے سارا چڑا بھر میں الٹ دیا۔"

"کام ریڈ، کیا کبھر ہے ہو؟"

"صحیح کبھر رہا ہوں۔" یہ کہتے کہتے اس نے اپنا ایک گھنٹا لکھوں دیا۔ یہ گھنٹے دیکھ رہے ہوان میں درد بیٹھ گیا ہے۔ خالی چائے کا ایک کوب چڑھایا اور تھیلا بغل میں داب نکل پڑا۔ پورے شہر کا گشت کرتا تھا۔ یمند، اخبار، کتابیں، ایک ایک دفتر میں ایک ایک شخص کو پہنچاتا تھا کہ کسی پتو اندر ہو گا۔ مجر کام ریڈ، یاں یہ تو کسی پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ میں نے سوچا کہ یہ سب چیزے ہوئے لفظ بے برکت ہیں جب ان کا کسی پر اثر ہی نہیں ہوتا تو یہ لفظ مخصوص کیا کاٹھی ہیں۔ دلوں میں اترتے نہیں بس کاغذ کا لے ہوتے ہیں تو میں نے سوچا کہ ان بے برکت لفظوں کے بیچے میں کیوں اپنی جان ہلکان کر رہا ہوں۔ دفع کرو اس کچرے کو۔ تو میں نے ہر پہاڑ کراپنے کا تھیلا الٹ دیا۔ سب لفظوں کو نہر میں غرق کر دیا؛ نہڑا بیوگیا۔ "بس یار چلو یاں سے۔"
"یار کام ریڈ اب یہاں آئے میں تو فراخ ہوڑا دقت سمجھیں۔"

"نہیں کام ریڈ۔ یاں اب نہیں بیٹھا جاسکتا۔ سالوں نے وہ پنج بھی غائب کر دی جس پر دادا بیٹھا کرتے تھے؟"

یہ جا وہ جا۔

میں اکیلا دیر تک ادھرا دھر جتنا کہا رہا۔ ادبہ کھاڑی خیالوں نے رات تک میرا بیٹھا نہیں چھوڑا۔ رات کو میں نے خواب دیکھا کہ جیسے وہ ہر بھر اگھا پڑی ہے دی میں ہوں، وہی — بیچ کی میں آنکھ کھل گئی۔ پھر میں صبح تک نہ سو سکا خواب۔ میری آنکھوں میں صبع کے بعد تک چھوٹا رہا۔

۱۴

”اڑے ہال اس کا سلی قون آیا تھا۔“

”کس کا؟“ میں چونک پڑا۔ فوراً دھیان اسی کی طرف گیا۔ اسی کا ہو گا۔ کتنی امید بھری نظروں سے میں نے زبیدہ کو دیکھا۔

”پراپرنی ڈیلر کا؟“

”پراپرنی ڈیلر کا؟... اچھا؟“ توقعات کا سیلا ب آن کی آن میں بیٹھ گیا۔ آنکھوں کی چمک غائب۔ آواز میں مرد فی ”کیا کہتا تھا؟“
”پہنچ رہا تھا کہ کیا سوچا ہے؟“
”دیکیا سوچا ہے؟ کس بارے میں؟“

زبیدہ نے مجھے غور سے دیکھا۔ شاید اسے میرا یہ بے تعلقی کا ہو پسند نہیں آیا تھا۔
مگر یہ دانستہ تو نہیں تھا۔ میں ان دونوں اور ہمی خیالوں میں تھا۔ فوری طور پر دھیان میں بات آئی ہی نہیں۔ زبیدہ نے ناخوشگوار سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر اُس نے بھی وہی بے تعلقی کا ہجھ اپنالیا۔ تھشک ہجھ میں محتمل حواب دیا۔ آشیانے کے بارے میں؟“

آشیانے کے بارے میں؟ میں پہلے سپٹا یا۔ پھر سوچ میں پڑ گیا۔ میں اصل میں بھرپور پکڑا گیا تھا۔ میرے تو دھیان ہی سے وہ سارا تھہ رفع دفع ہو چکا تھا۔ جس روز پراپرنی ڈیلر آشیانے کا گاہک لے کر آیا تھا اسی روز تو بوجان کی طبیعت بگرمی

تھی۔ ایسے لئے کے دینے پڑے کہ ان کی بیماری کے سوا کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔ بچھر شیریں آن ہی تھی۔ ہم دونوں بو جان کے سر پانے میں چراغِ حوالی کی طرف جانکے۔ آشیانہ اپنے مسائل و معاملات کے ساتھ دھیان سے ادھب ہو گیا اور اب ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ بو جان گزر چکی تھیں اور شیریں جا چکی تھی۔ چراغِ حوالی میرے حافظہ سے بسر نہ لگی تھی۔ میں کتنا پریشان تھا۔

بو جان نے گزرتے گزرتے ہمارے حافظہ کو لو دیدی تھی۔ چراغِ حوالی ایک دم سے ان کے آخری دمول کے ساتھ ہمارے تصور میں کتنی منور ہو گئی تھی اور جب انہوں نے آخری ہیکلی میں تو یہ امانت سمجھیں پوری طرح مستقل ہو چکی تھی۔ ہم نے ان کی یاد کے ساتھ میں بیٹھ کر کس خوبصورتی سے ان درودِ دیوار کو اپنے زیعِ نذرہ کیا اور اس زیع سے اپنے آپ کو برآمد کیا۔ ہم ایسے خوش ہوئے کہ جیسے برسوں کی کھونی ہوئی ہماری چیزیں مل گئی ہیں۔ مگر بچھر ایسا ہوا کہ شیریں چلی گئی۔ تو شیریں جا چکی تھی اور میں اکیلا اس امانت کو سنبھال کر نہیں رکھ سکتا تھا۔

اب میری سمجھو میں آرٹا تھا کہ کیوں میرے اجداد ایک عمر پر بسخ کر تذکرہ لکھنے پڑھ جایا کرتے تھے۔ یا تو بو جان کی سی فضائے یاد ہو۔ جہاں دیکھے ان دیکھے سب زمانے سدا بہار تھے کہ بو جان تو اپنی ذات میں زمانوں کا سلسلہ تھیں کہ کتنے زمانے کہاں کہاں سے آکر کہاں ملتے تھے اور خوش اسلوبی سے جُدا ہو جاتے تھے یا بچھر آدمی تذکرہ لکھے۔ نہیں تو یادیں بس رجایں گی یا بچھر جائیں گی اور آپ میں رل مل جائیں گی۔ تو مجھے بھی، میں نے سوچا، تذکرہ لکھنا چاہیے۔ مگر یہ خیال اتنا مفھوم کہ خیز نظر آیا کہ میں نے اسے فوراً ہی رد کر دیا۔ تذکرہ لکھنے کے لئے آدمی کو روایت میں دچالیسا ہونا چاہیے نہیں تو اول پیال ہی لکھے گا۔

”دکل وہ بچھر فون کرے گا؟“ زبیدہ تھوڑا چپ رہنے کے بعد بچھر بول پڑی۔

”اچھا؟“

”ہاں میں نے تو اس سے کوئی بات کی نہیں۔ کہہ دیا ہے کہ کل اخلاق صاحب
محشر پہنچوں گے۔ وہ ہی بتائیں گے؟“
یہ بات بظاہر میں نے بے اعتنائی سے سنی۔ لیکن دل میں ایک تشویش پیدا
ہو گئی کہ یہ تو بھروسہ مصیبت شروع ہو گئی۔ پھر وہی وقت بے وقت کے پھرے۔
کبھی دروازے کی گھنسٹی بج رہی ہے کبھی فون بول رہا ہے۔ مجھے وہ دن یاد آگئے۔ ہر وقت
یہ لگتا تھا کہ میرا تعاقب کیا جا رہا ہے۔

”پہلے سے سوچ لو کہ کیا بات کرنی ہے؟“

”ہاں سوچ لیں گے۔ اولاً اس سے پہلے کہ زبیدہ دوسری بات کرے میں نے
تو س کے ریزے طستری میں کجا کئے اور باہر برآمدے میں نکل گیا۔

تو س کے ریزے پار سنگھار کے ساتھ میں بھرے اور برآمدے میں کرسی گھٹیٹ
کر جیٹھے گیا۔ سمجھی سجا ترت پھرت اکٹھی ہو گئی۔ گوریاں تو جیسے انتظار میں سمجھی تھیں۔
فوراً ہی آن پہنچیں۔ بلیلوں کا جوڑا تھوڑا بعد میں آیا۔

انہیں کے پیچے دو گرد سلین بھی آگئیں۔ ایک کوَا بھی
پیچ میں آن دھمکا۔ گلہری اوپر کی شاخ سے چلی اور کوڈتی پھاندی آن موجود ہوئی۔
ایک گہری نسلی پدی بھی ہار سنگھار کی شاخ پر بیٹھی چوں چوں کرتی لظر آدھی تھی۔ مجھے اس
آن ایک عجیب ساختیاں آیا کہ شام پڑیا بھی یہاں آگئی ہوتی تو یہ سمجھا مکمل تھی۔ شام پڑیا
بس میرے دھیان کو بر لگ گئے۔

”اخلاق، او اخلاق۔ شام پڑیا؟“

”کہاں ہے؟“

”وہ بیٹھنی ہے۔“

”ہو لے بول۔ من لے گی تو اڑ جائے گی۔“

”ہو لے ہی تو بول رہی ہوں۔ اس باولی کو تو پتہ ہی نہیں ہے کہ ہم یاں پہنچیں۔“
آہستہ سے ایک قدم۔ پھر دوسرا قدم۔ شیریں مجھے ہدایات دے رہی ہے۔ میں
شیریں کو ہو لے بولنے کی تاکید کر رہا ہوں۔ ہم بالکل منڈپ کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔
بس اسی آن شام اچڑیا اپنی دُم ہلاتی ہے اور پھرست اڑ جاتی ہے۔

”شیریں کی پنجی، تو نے اُسے اڑایا ہے۔“

”ارے واه میں کیوں اڑتا تھا۔ میں نے تو تجھے بتایا تھا۔ تجھے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ
وہ بیٹھنی ہے۔“

”تو کانا مچھو سی کئے چلی جا رہی تھی۔“ بس اس کے کان میں بھنک پڑ گئی۔

”بادلے خال، شام اچڑیا کے کان کہاں ہوتے ہیں۔ جب اس کے کان نہیں ہیں تو
تو نے گی کیسے؟“

اور اسی کے ساتھ ایک اور تصویرِ حیان میں ابھر آئی۔ گرمیوں میں منہ انہیں
میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ سامنے منڈپ پر شام اچڑیا بجلت میں اتری ہے۔ دسمبی میٹھی
آواز میں چمکتی ہے، دم کو تیز تیز گردش دیتی ہے اور اڑ جاتی ہے جیسے بس یہ بتانے
آئی ہو کہ صبح ہو گئی ہے۔

میں نے سوچا کہ میں اصل میں شام اچڑیا سے شروع ہوتا ہوں۔ سو اگر میں واپسی
تذکرہ لکھنے لگوں تو میں شام اچڑیا سے اس کی ابتداء کروں گا۔ پھر وہی خیال کر اگر میں
تذکرہ لکھوں۔ میں نے اس خیال کو کتنا رد کیا۔ مگر وہ تو میرے اندر سما تا ہی
چلا گیا۔

ابتداء کرتا ہوں اس پیدا کرنے والے کے نام سے جس نے شام اچڑیا کو پیدا کیا۔

مگر شام اپنے پیدائیسے ہوئی۔ ہمارے پندت گنگا دت مہجور کہا کرتے تھے کہ پر جا پتی اور اوشا نے مل کر سب انسان حیوان کو جنم دیا۔ اوشا نے پر جا پتی کی لالسا سے بچنے کیلئے سور و پ بد لے۔ مگر وہ جس مخلوق کا روپ بھرتی پر جا پتی تھی اسی مخلوق کے نر کا روپ لے لیتے اور اس روپ میں اس سے صحبت کرتے۔ اس کے نتھے میں وہ مخلوق جنم لیتی۔ پندت گنگا دت کا یہ بیان اگر صحیح ہے تو پھر مجھے لگتا ہے کہ اوشا نے سب سے پہلے شام اپنے کو پیدا کیا اور شام اپنے کے ساتھ رنگ رنگ کی مخلوق پیدا کی۔ مگر زمکن کا فرق کیوں اجل پنکھے دیتے بکلا کو، کوئی کس پڑھ کاری۔ خیر یہ اس کی اپنی مصلحتیں ہیں۔ بہر حال تعریف اس پاک فات کی جس نے شام اپنے کو پیدا کیا اور دنیا بنائی اس رنگ سے کہ اوپر آسمان پاٹ دیا جس کی چال سُرٹھی ہے اور یہ نیچے زمین بھاٹی۔ زمین پر دریا یہاں ہے، گنگا ندی، جناب ندی، نہر فرات، پھر سندھ، سترہ زار، یونہ زار، کوہ سار گران کے بیچ مقتل کیے نمودار ہو گئے۔ کور و کشیت، کربلا، سری رنگا پشم۔

نیز آدمی کو ٹھکانے لگانا کوئی مسئلہ نہیں مسئلہ یہ چلا آتا ہے کہ لاش کو کیسے ٹھکانے لگایا جائے۔ قabil نے اسی تردید میں پوری زمین کو کھوند دالا۔ لاش کے بوجھ سے اس کے کانزے چھ دکھنے لگے تھے۔ مسئلہ تب سے جوں کا توں چلا آ رہا ہے۔ کانزے تب سے دکھ رہے۔ دکھنے ہی ہیں کہ مولہ کہیں مقتل کہیں۔ مدن کہیں۔ آدمی آنکھ کہاں کھوئے ہے سوتا کہاں جا کر ہے۔ میرے مورث اعلیٰ خلد آشیان احمد باشد اصفہان کی مٹی تھے قزوین کی خاک میں جا کر آسود ہوئے۔ ان کے فرزند حکیم علی شیریخان قزوین میں پہنچ بڑھے۔ مگر ان کا خالی قصر ریحان قزوین میں رہ گیا۔ خود جہاں آباد کی خاک تلے جا کر آرام کیا۔ قضا کہاں سے کہاں لے گئی۔ مکینوں کو میرے اجداد میں کس نے کہاں آنکھ کھوئی۔ کہاں جا کر آنکھ بند کی۔ ماں میرے دادا یعنی میاں جان نے سخت عبر و استقلال کا منظا ہرہ کر کے اپنی تقدیر کو اجداد کی تقدیر سے الگ کر لیا۔ اپنی جگہ پتھر کی طرح جمعے

رہے۔ جہاں آنکھ کھوئی تھی وہیں آنکھ بند کی۔ یوں وہ مسی کے افسوس سے پُر گئے۔ مگر اس کے بد لے میں دوسرے افسوس ان کے نو شتے میں لکھے گئے۔ دکھا اور افسوس سے تو بہرحال آدمی کو مفر نہیں ہے اور اپنے خاندان کی ریت میں نے یہ دیکھی کہ ہر پنیر ڈی کے ساتھ کوئی بڑا افسوس والستہ ہو گیا۔ میرے مورث اعلیٰ احمد باللہ جب تک قزوین میں رہے بیت الابیض کو یاد کرتے رہے اور اصفہان کی مشی کے لئے افسوس کرتے رہے۔ حکیم علی شیرازیجان کے سرے نے جہاں آباد کے کتنے نینوں کو سکھ دیا کتنی اندھی آنکھوں کو روشن کیا مگر وہ مستقل گفت افسوس ملتے تھے اور کہتے تھے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے قزوین کی کتنی آنکھوں تھیں اندھیرا اتنا اور ہم انہیں روشن نہ کر سکے۔ میرے لکڑدادا، حکیم گلزار باغ علی نے چرانخ حولی کی صورت میں ایک نیا محل کھڑا کر دیا۔ مگر گلستان محل کے لئے رونا نہ گیا۔

میں کن اگلے پچھلے قصتوں میں پڑ گیا۔ اگلوں کے افسوس اگلوں کے ساتھ گئے۔ اب میں ہوں اور میرے اپنے افسوس ہیں۔ ہر زمانے کے اپنے افسوس ہوتے ہیں اور اپنی مسرتیں راحیں۔ اگلے زمانے کے ستم ایجادوں نے کھوپڑیوں کے میمنار کھڑے کئے۔ یار و اغیار کی آنکھیں نکلوائیں اور اس میں راحت پائی۔ اس زمانے نے اپنی ضردوں کے حساب سے ستم ایجاد کئے ہیں۔ وہ میرے اجداد کا زمانہ تھا۔ یہ میرا زمانہ ہے۔ مجھے چاہیے کہ اپنی ذات سے اور اپنے زمانے سے غرض رکھوں۔ وہی ٹھوڑا پتا ڈل جو میاں جانے اپنایا کہ حمد و نعمت کے بعد اپنا اور اپنے زمانے کے آشوب کا تذکرہ شروع کر دیا۔ تذکرے کا یہی اسلوب ہے۔ اسی میں سہولت بھی ہے۔ میں اور میرے زمانے کا آشوب مگر میں کہاں سے شروع ہوتا ہوں اور میرا زمانہ کب سے شروع ہوتا ہے۔ نہیں میں تو شما پنیر یا سے شروع ہوتا ہوں۔ مگر میرا زمانہ۔ وہ کہاں سے کب سے شروع ہوتا ہے۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے جو بھی زمانہ ملا خراب ملا یا زمانہ سدا سے خراب چلا آرہا

ہے۔ ویران دنوں کی بات ہے جب میں چراغِ حوالی میں تھا اور جب روزِ صبح سوریے منہ اندھیرے اوس تادھندر کے میں پہنچی مندہ ہے پہ آکر درشن دیتی، میٹھا گیت گاتی اور اوچبل ہو جاتی۔ مجھے شیریں سے شکایت ہے میں وقت پہ کوئی گردبڑ کر دیتی تھی یا گردبڑا جاتی تھی۔ میں کبھی شام اپنے کو اس کے گرم دھر کتے یا پوئے کے ساتھ اپنی مٹھیوں میں محسوس نہیں کر سکا۔ شام اپنے کو اپنے میرے لئے دور کا درشن رہی۔ تو محرومی کوئی آج کی نہیں ہے۔ پھر بھی وہ زمانہ اچھا تھا۔ شام، اوسا، شیریں۔ ایسا لگتا تھا کہ سارا زمانہ گھل مل کر چل رہا ہے۔ کہیں کوئی تفریق ہی نظر نہ آتی تھی۔ میں اوس شیریں دن دن پھر ہر سے بھرے گئے پیروں کی دھوپ چھاؤں میں پھرتے پھرتے رہتے۔ گرمیوں میں ابیوں سے لدے پیر ہمیں رجھاتے۔ جاروں میں ان پیروں سے بے تعلق ہو کر اپنی کے پیروں کے ساتھ ابھتے سلختے رہتے۔ ہر رات کھٹاس سے شروع ہوتی اور میٹھی ہوتی چلی جاتی۔ امیاں کتنی کھٹی ہوتیں۔ ساون کی بوندوں کے ساتھ ان میں رس بھرتا چلا جاتا اور میٹھا ہوتا چلا جاتا۔ جاروں میں اپنی کے پیر کے نیچے نہنجی نہنجی گلابی کلیاں اتنی بکھری ہوتی جیسے گلابی بستہ بچھا ہوا ہے۔ یہ کلیاں دانت اور زبان کے بیچ جا کر ملکی سی کھٹاس کے ساتھ ہمیں ایک نئے ذائقہ سے آشنا کرتیں۔ پھر کھٹی کھٹی گٹاریں جن کا ہر اگودا کھٹی ہوتا چلا جاتا اور اپنے میں ایک مہماں پیدا کر لیتا۔

سب ذائقے زائل ہو گئے۔ موسم ہی بدل گیا۔ شب و روز اور سے اور ہو گئے۔

میاں جان کی آنری مجبڑی چاچکی تھی۔ سواب پکھری لگنا موقوف تھا۔ نہ مدعا علیہ نہ مدغی، نہ ملزمون کی پکار نہ انصاف طلبی کا شور۔ چراغِ حوالی کی دیوار ہی ویران نظر آئی تھی۔ میاں جان کا رعب دا بخت تھا۔ اب وہ دائی بوڑھے پھونس دکھائی پڑتے تھے۔ دنیا جہاں کے قصتوں بکھر دل سے بے تعلق اپنے گوشے میں بلیٹھے جلنے۔ کیا کچھ لکھتے رہتے تھے۔ والد صاحب نہ آکر کبھی شہر کا احوال سنایا تو ایک بے تعلقی کے سے انداز

میں سنا۔ اکا د کا بات کی اور پھر اپنے اور ماق پر جھک گئے۔ آگے رکھی کالی سیاہی کی دو اسٹیل کے قلم کو بار بار دبوتا اور لکھنے چلے جانا۔

عزم و اب اللہ ہی اللہ ہے۔ عاصی پر معاصی مشاق علی گور کنارے بیٹھا ہے اور پیک اجل کا انتظار کھینچتا ہے۔ وقت آخز بانے نے کسی آنکھ پھیری ہے کہ ہم اپنے ہی شہر میں اجنبی مٹھرے ڈیلوڑھی سے اس فڑ سے قدم نہیں نکالتا کہ کسی نے کھڑے ہو کر سلام نہ کیا تو فقیر کی کیا عزت رہ جائے گی۔ اپنی عزت سنپھالے گوشے میں بیٹھا ہوں باغ میں بھی جانا موقوف ہے۔ سونہیں معلوم کہ عزم اشجار کا کیا حال ہے اور اشمار کی کیا کیفیت ہے۔

اب یہ شہر آفت زدہ شہر ہے۔ دیکھتے دیکھتے کتنے گھر خالی کتنے کو چڑھان ہو گئے۔ بلوے فزاد کی خبر میں قریب د دور سے دمبدوم چلی آرہی ہیں۔ خبر میں کم افواہ میں زیادہ افواہ گرم ہے کہ یہاں بھی اب کچھ ہونے والا ہے۔ جودم گندتا ہے غنیمت ہے۔ کس دم کیا گذر جائے کچھ خبر نہیں۔ کل ہی کی بات ہے برخوردار مصدق علی خبر لے کر آئے کہ آج رات چراغِ حولی پر حملہ ہو گا۔ پھر برخودار نے اپنی بندوق بھری اور رات ٹھیل ٹھیل کر لبڑکی۔ ادھر اپنی رات بھی آنکھوں میں کٹ گئی۔

صدق علی کے دماغ میں عجب سماں ہے کہ چراغِ حولی کے کوڑے کئے جائیں اور پاکستان کی سمت کوچ کیا جائے۔ میں تحمل سے بیٹھے کا خطبہ سنا کیا۔ جب پہاڑہ صبر برلن ہو گیا تو کہا کہ فرزندِ ہمام دادُ لٹ جائے کوئی مصالحتہ نہیں۔ مگر جائیداد نیلام کی جائے اس میں تھیں سخن ہے۔ یہ حیر فقیر اسے آئیں غیرت کے خلاف جانتا ہے سوچا رے جیتے جی تو یہ نہیں ہو گا۔ ہماری آنکھ بند ہو جانے کے بعد تم مالکِ دنخوار ہو۔ باقی پاکستان جانے نہ جانے کے باب میں تمہارا باب پ کچھ نہیں کہتا۔ تم بے شک اہل خاندان کو لے کرنے والے دھن سدھا رہو مگر اس افادۂ خاک کو اپنی مٹی میں پڑا اپنے دو۔

قدم ہمارے اس زمین نے پھر دی ہوئے ہیں۔ جہاں کی مئی ہے وہیں سارہ ہو تو اچھا ہے۔ جس دیوار میں آنکھ کھولی ہے۔ اسی دیوار میں آنکھ بند کریں گے۔

فرزندِ دلبند ہمارا جواب سن کر کبیدہ خاطر ہے۔ خاموشی سے اٹھے اور اپنی بھری بندوق کے ساتھ جویلی کی پہرہ داری کرنے لگے۔ ادھر یہ فیر رپسے خیالوں میں عطا ہے۔ اجداد کو دھیان میں لا یا کہ ان کا کیا شعار تھا اور فرزند نے کیا طور اپنا یا بے۔ ہمارے خاندان پر ایسا وقت کب کب نہیں آیا۔ اس خاندان کی تو تقدیر ہی یہ چلی آتی ہے کہ چند بیٹریاں امن چین کے ساتھ گزاریں، اس کے بعد اکھڑے اور در بدر خاک بسر ہوئے۔ پھر کسی دور کے نگر میں جا کر دشیرے ڈالے اور بہ آئین شائستہ اس منی سے نیا ہ کیا۔ مگر کیا مجال کہ آن میں کم بھی فرق آنے دیا ہو۔ جب زمین تیگ ہوتی سب مخالف چھوڑا اور دامن جھاڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ آئی دولت کو سنگھوانے میں مغل اُنقة نہیں جانتا۔ جاتی دولت کے لئے کف افسوس نہیں ملا۔ آباجانی فرمایا کہ تے تھے کہ جب ہمارا خاندان گلتان محل سے نکلا تھا تو تن کا ساتھ نہیں دیا۔ جیسے بیٹھے ہے تے بس دیے ہی اُنھوں کھڑے ہوئے۔ شہر سے نکل کر صبح کے ہیون میں دادی حضرت کو پان کی طلب ہوتی۔ متساف ہوئیں کہ پاندان کیوں ساتھ نہ لے لیا۔ منہ میں کتر نہیں جائے گی تو سفر کیے کئے گا۔ دادا جانی نے یہ سن قورا جمن میاں کو دور ڈایا کہ جاؤ اور پاندان لے کر آؤ۔ جمن میاں نے بھی کمال دکھایا۔ تیر کے موافق گئے۔ خاکیوں سے بچتے بچاتے محل میں پہنچے اور پاندان بغل میں داب کے خرگوش کی مثال ز قندیں بھرتے واپس آئے۔ دادی حضرت نے گلتان محل کی خیریت پوچھی۔ جمن میاں محنڈا سانس بھر کے بوئے کہ بی صاحب، دیور ڈھی سونی پڑی تھی۔ کمرے دالان بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ پان صحن میں بطنیں سور کر رہی تھیں۔ یہ سن دادی حضرت نے ما تھا پیٹا۔ ما تھمل کے یوں کہ مجھ کاں کھاتی کو اتنی سدھ بھی نہ رہی کہ ناند میں پانی بھرا آتی۔ دکھیا بطنیں پیاسی ہوں گی۔

خیریہ نقرہ اپنے جیتنے جی چراغِ حوالی کو گلستان محل نہیں بننے دے گا۔ بُر خوردار معدالتی علی کو میری طرف سے اجازت ہے کہ اپنی سہولت دیکھ کر جس روز چاہیں اہل خاندان سمیت پاکستان کی راہ میں۔ اس درماندہ کو چھوڑ جائیں کہ چراغِ حوالی میں رات کو چراغ جلانے کے لئے کوئی تور ہے۔ ویسے چراغِ حوالی کی تقدیر میں خانہ بے چراغ بننا اب لکھا گیا ہے۔ میں آنحضرتے دن جیوں گا۔ بتی سب حل چکی ہے۔ چراغ اب بجا کر اب بجا۔ بُر خوردار فی الوقت اس حیثیں بعض میں ہیں کہ بوڑھے باپ کو چھوڑ کر چلے جائیں یا اس کے گذر نے کا انتظار کریں۔ اہل خاندان کی غیرت کو گوارا نہیں کہ اس بوڑھے کو وہ پہنچے اکیلی حوالی میں دشمنوں کے زرع چھوڑ کر چلے جائیں۔ اس باب میں مجبور آنہماںی کے بعد ہشتر مہاراج کا عمل اہل نظر کے لئے ایک شال کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بزرگ نئم کو کوئے کراپنے سفر آخر پہ نکلا۔ مگر اس طور کے ساختہ کہ جو پہنچے رہ گیا اور ڈھنے گیا اس کی طرف مرکرہ دیکھا۔ بھائی برادر تھکتے گئے ڈھنے گئے۔ بُر خشتر مہاراج مٹھیکے بغیر آگے بڑھنے گئے۔ یہاں بھی وقت کا قافلہ تیز قدم ہے۔ نا تو ان مشائق علی تھک کر پہنچے رہ گیا ہے۔ ڈھنے گیا ہے۔ مگر اہل خاندان بعد ہشتر کی بعیرت سے محروم ہیں۔ اگر معاملہ قائم سے کام لیں تو ان کا سفر بھی کھوٹا نہ ہوا اور میں بھی انجمن سے نجات پاؤں۔

سواس وقت محب احوال ہے۔ اہل خاندان نے مجھ پر کڑا ہوا ہے۔ میں نے زمین کو پکڑا ہوا ہے۔ اس شخص سے گھوٹلا حصی کیوں کر ہو۔ اسی صورت ہو سکتی ہے کہ پہ جان جلدی جان آفرین کے سپرد ہو۔ یہ درماندہ راہ تو چلنے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔ پرستہ نہیں فرشتہ اجل کو آنے میں کیا تأمل ہے۔ میں نے اپنے بزرگ مولوی مشاہق علی کا نسخہ بھی استعمال کر کے دیکھ لیا۔ یعنی اب کے ۲۳ شعبان المعظم کی مبارک شب پچھلے پھر بیع پھر میں کھڑے ہو کر دعا کیں پڑھی۔ اللہم انی اَسْأَلُكُ بِرَحْمَتِكَ الَّتِي وَسَعَتُ كُلَّ شَيْءٍ... اور پھر پدر کامل کی چاندنی میں اپنی پرچھائیں کا جائزہ لیا کہ

گردن پر سر نظر آتا ہے یا انظر نہیں آتا۔ اس بے بصر کی نظر نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا۔ دیر تک اپنی پرچھائیں کوتکا کیا پر فیصلہ نہ کر سکا کہ گردن پر سر نظر آتا ہے یا انظر نہیں آتا۔ اب میں پیدا کرنے والے ہی سے یہ پوچھتا ہوں اور ساتھ میں گڑگڑا کر دعا کرتا ہوں کہ رب العزت میرے فرزند کو شرمندگی سے بچا لے اور میری بیکی کی شرم رکھ لے فرشتہ جل کو شبابی سے بچج۔ صاحبوجاتا ہمارا تھبھر گیا ہے۔ آج گئے یا کل گئے۔ مگر اسی آج اور کل میں دن گذرتے چار ہے ہیں اور اس کے ساتھ دنگ فلک دگر گول اور زمانہ زیلوں ہوتا چلا چار ہے۔ یہ گنہگار خالق حقیقی سے ایک ہی رحم کا طالب ہے کہ جان جلدی جان گزنا کی نذر ہو۔ یا ارحام الرحمین، رحم، رحم، رحم

تب میں نے سوچا کہ آشیانے کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ بوجان کی موت نے زبیدہ کو عارضی طور پر خاموش کیا تھا۔ مگر اس کے ذہن کی سوتی تو وہیں اٹھی ہوئی تھی۔ وہ کتنے دن خاموش رہ سکتی تھی۔ میں سادہ دل اس کی وقتی خاموشی سے یہ سمجھ دیا تھا کہ وہ قصہ رفع و فع ہو گیا اور میرے ذہن سے یہ بات ایسے اُتر گئی۔ جیسے کبھی چھڑی ہی نہیں تھی۔

”وہ آج آیا تھا۔ جواب مانگتا تھا“

”کون آیا تھا؟“

”پر اپنی ڈیلر اور کون؟“

”پر اپنی ڈیلر۔ اچھا۔ اس نے پھر بھیرے لگانے شروع کر دیئے۔“ میں ڈر سا گیا۔ وقتاً مجھے وہ دن یاد آگئے۔ جب وہ میرے پیچے پھر رہا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا۔ جیسے میرا پچھا کیا جا رہا ہے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بھتی یاد روانے کی گھنٹی میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگتا۔ بس یہی گمان ہوتا کہ ہونہ ہو دہی ہے اور اس جیسے اس نے مجھے آیا ہے۔

”خیر آج کے دن تو میں نے ہی اُسے آنے کے لئے کہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آج تم گھر پر ہو گے۔ چھپی کا دن ہے۔ مگر تم صبح ہی گھرے نکل گئے۔ تم گئے ہو اور وہ آیا ہے“

میں نے دل ہی دل میں کتنا اطمینان محسوس کیا کہ میں صحیح وقت پر گھرے نکل گیا۔

”پوچھتا تھا کہ کیا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ قیصلہ صاحب کریں گے۔ کسی وقت فون کر کے ان سے وقت لے لینا اور آکے بات کر لینا۔ کہتا تھا کہ گاہک ابھی ہاٹھر میں ہے۔ جلدی فیصلہ کر لیں“

یہ شخص، میں نے سوچا، گلے پر چھری رکھ کے جواب مانگتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ فی الوقت اسے ٹال دیا جائے۔ ممکن ہے تا خیرے سے گاہک بدلت ہو جائے اور کوئی اور گھر دیکھے۔ میں نے پر اپنی ڈیلر کو ملنے کی کمیٰ ترکیبیں سوچیں۔ لیکن ہر بار وہی ایک اندر شہ کے زیدہ اس ترکیب کو چلنے بھی دے گی۔ گڑ بڑ تو، میں نے سوچا، اصل میں گھر کے اندر ہے۔ چھری میرے گلے پر زیدہ نے رکھی ہوتی ہے اور چھری جیسے اب گلے کے بالکل قریب آگئی اور اچانک میرے دل میں ایک شک جا گا کہ کہیں خود زیدہ نے تو پر اپنی ڈیلر سے رابطہ پیدا نہیں کیا تھا۔

”کہتا تھا کہ گاہک موٹی اسامی ہے اور ضرورت مند ہے۔ مکان کی اچھی قیمت لگ جائے گی“

”پرستہ نہیں کون آدمی ہے۔ یہ جو محظیٰ آسامیاں نظر آتی ہیں۔ بالعموم فراد لوگ ہوتے ہیں۔“ میں نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

”میں نے پوچھا تھا۔ وہی آدمی ہے جسے لاکراس نے گھر دکھایا تھا۔“
”وہ آدمی“ میں چونکا اور یہ ساختہ منہ سے نکلا۔ ”وہ سبز قدم۔ مجھے کبھی کبھی

پوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ شخص بوجان کی موت کا ذمہ دار ہے ॥
 زبیدہ چپ ری تو ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد بولی بھی تو دوسرے ہی لہجہ میں دیکھنے نہیں
 بوجان کو کیا ہو گیا۔ اچھی بھلی تھیں۔ ایک ساتھ گریں اور ایسی گریں کہ پھر انھیں نہیں۔
 تین دن میں چٹ پٹ ہو گئیں۔ دہم کی بات تو ہے۔ مگر کیا پتہ ہے کہ اس بخت مارے
 لگھر ہی پر کوئی اثر ہو۔ مجھے تو یہی شک گزرتا ہے۔ خیراً کہ کسی باہروالے کی نحودت تھی تواب
 جب، میں اس گھر میں رہنا بنتا ہی نہیں ہے تو ہماری بلاسے کہ آنے والے کے نیک قدم
 میں یا بزر قدم میں ॥

”زبیدہ میں ایک بات بتا دوں۔“ اب میری زبان کھل گئی تھی۔ ”اگر میں نے یہ مکان
 زیپا تو ہمارے خاندان میں مکان بیچنے کی یہ سلسلی مثال ہو گی۔ ہمارے والد صاحب نے
 پھراغ حوالی کو فروخت نہیں کیا۔ میاں جان جو منع کر گئے تھے۔ بس تالا دال کے نکل کر
 ہوئے اور میاں آکر بھی ہمنے اس کی بنیاد پر کوئی الامتناع نہیں کرانی ॥“
 ”یہ کوئی عقلمندی کی بات تھوڑا ہی تھی۔ لوگوں نے جھوٹے سے ہٹکیم داخل کر کے
 کتنی بڑی بڑی جامداویں بنالیں۔ اب وہ رہیں بنے بستھے میں ॥“

”مجھے معلوم ہے ॥“

”خیر پرانی باتوں کو کریں نے میں کیا کھا ہے؟“ زبیدہ نے بات کو لمبا کھینچا دیکھ
 کر خود اسے مختصر کر دیا۔ ”اب کی بات کرو۔ بخت مارے پر اپنی ڈیلر کا تھا ضے پر
 تھا ضا آرہا ہے۔ کہتا ہے کہ جلدی قیصلہ کرو نہیں تو گاہک ہاتھ سے نکل جائے گا۔“
 ”قیصلہ میں نے کر لیا ہے ॥“

”کیا؟“

”آشیانہ نہیں پکے گا۔“ میں نے قطعی لہجہ میں کہا اور فوراً ہی اٹھ کر برآمدے
 میں آگیا۔

میں مطمئن تھا کہ بالآخر میں نے اپنے فیصلہ کا اعلان کر دیا ہے اور اب اس کیلئے جواز بھی تو پیدا ہو گئے تھے۔ اب اشیاء خالی ایٹھ پھر سے بنا گھردنا تو نہیں رہا تھا۔ اس کی ڈیورٹھی سے ایک بزرگ کا جنازہ نکل چکا تھا اور پھر شیریں سے تجدید ملاقات کی یادیں بھی اس کے درود لیوار سے والبستہ ہو گئی تھیں۔ ایک چڑیا ہار سنگھار کے نیچے سے اُر کر آئی اور عین میرے سامنے میز پر بیٹھ کر چیز چیز کی اور واپس چلی گئی۔ کیا وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ اس وقت بھی میں اس کی تواضع کے لئے پھرداں دلکا لے کر آیا ہوں۔ یا خالی شکایت کرنے آئی تھی کہ خالی ہاتھ کیونکئے ہو۔ ادھر ہمار سنگھار پر چڑیوں کی بڑتی اُتری ہوئی تھی۔ کتنا شور مچا رہی تھیں۔ اس جواز کی طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا کمرشل ایمیڈیس نے سوچا، اس علاقہ میں پھیلتا چلا جا رہا ہے تو مجھے کیا۔ میرے گھر میں تو ہمار سنگھار بھی مہکتا ہے اور پڑیاں بھی جیکتی ہیں۔ اگر اس علاقہ میں کمرشل ایمیڈیس پھیل رہا ہے تو پھر تو گھر کا قائم رہنا اور بھی ضروری ہے۔ چڑیوں کو کہیں تو پناہ ملنی چاہئے۔ اچانک مجھے لگا کہ چڑیوں کی چبکار میں ایک اخترب کی کیفیت اور خون کی لہر ہے اور اسی آن میں نے دیکھا کہ ہمار سنگھار تک ایک بُلی منڈلا رہی ہے۔ دروازے کی گھنٹی بھی۔ میرے کان کھڑے ہوئے تو آگیا وہ موزی میں بالکل یہ سمجھا کہ پر اپنی ڈیلر آیا ہے۔ مگر اب میں اس سے خوفزدہ نہیں تھا۔ اب میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کے لئے تیار تھا۔ جب زیبیدہ کے سامنے میں نے کھل کر بات کر دی تو پر اپنی ڈیلر کیا چیز ہے۔ میں لیکر کر گیٹ پر گیا۔ گیٹ کھولا۔ اُر سے کام ریڈہ تم ہو۔ تم تو اس روز کے بعد غائب ہی ہو گئے۔ آج صورت دکھائی ہے۔ کام ریڈنے میری بات کا جواب دینا مطلقا ضروری نہیں سمجھا۔ برآمدے میں آگر تھیلا گلے سے اُندر کر میز پر پٹا اور کرسی پر پس رگیا۔ میں نے تعجب سے تھیلے کو دیکھا جو کتابوں رسالوں، اخباروں سے محسوس بھرا تھا۔ کام ریڈہ کیا۔ تم تو تھیلے کو نہر میں خالی کر

آئے تھے۔ یہ تو پھر بھر انظر آ رہا ہے؟

دیوار کیا کرتا۔ سالی زندگی بے معنی نظر آنے لگی تھی۔ کامر ڈاڈ می کو کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے۔ سالے تمہاری طرح میں بے مقصد زندگی نہیں گزار سکتا۔

”ٹھیک کہا تم نے کامر ڈاڈ۔ لدود جانور کی بیٹھتے گھاس کا گھر اٹھا لیا جائے تو وہ بیکل ہو جاتا ہے۔ اے یوں لگتا ہے۔ جیسے وہ بے مقصد زندگی گزار رہا ہے۔ کامر ڈاڈ نے میری بات کو نظر انداز کیا اور پوچھا۔

”پھر گھونسلے کے بارے میں کیا سوچا؟“

اور میں نے یوں جواب دیا جیسے کوئی مشکل مرحلہ کامیابی سے سرکریا ہے۔ کامر ڈاڈ میں نے بیگم سے بالآخر صاف صاف کہہ دیا کہ ”آشیانہ، ہم نہیں بھیس گے۔“ کوئی فرق نہیں پڑتا، تب پویار کھو۔ کامر ڈاڈ نے سرد مہری سے کہا۔

تین تحریران کہ کامر ڈاڈ نے آشیانہ کو بھینپ کے خیال کی کس شرود مرے مخالفت کی تھی اور اب وہ میرے فیصلہ پر کتنی سرد مہری دکھا رہا ہے۔

”میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ کچھ نہیں بچے گا۔ سب جل جاوے گا۔ مردا دریا حرمازادوں نے“

”کیا بکار ہے ہو کامر ڈاڈ۔ ہوش میں تو ہو۔“

”با لکل ہوش میں ہوں۔“

”تمہیں کچھ یاد ہے کہ تم نے ”آشیانہ“ بھینپ کی کتنی مخالفت کی تھی اور کتنے مجھے طعنے دیئے تھے؟“

”یاد ہے۔ مگر اب سوچتا ہوں کہ شاید بھائی ٹھیک ہی کہتی تھی۔“

”کیا ٹھیک کہتی تھی؟“ مجھے کامر ڈاڈ پر اب غفرانے لگا تھا۔

”ہی کہ آخراں نے کچھ تو دیکھا ہو گا۔ بھائی جھوٹ بولنے والی خالوں تو نہیں ہے۔“

”اُس نے تو تین مردے دیکھے تھے۔ کفناں پہنے ہوئے تین لمبے بانس جیسے آدمی۔ تم لفڑن کر دے گے اس بیان پر؟“

”یار اس نے تو تین آدمیوں کو کفناں پہنے دیکھا تھا۔ مجھے تو اس شہر کا ہر آدمی کفنا پہنے نظر آتا ہے۔“

”ارکا مریڈ، تم واقعی کھلک گئے ہو۔ میں اپنی بیوی کو روتا تھا کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ تم اس سے آگے نکل گئے؟“

”استاد تم نے تو آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ میں تو دیکھ رہا ہوں کہ کیا ہونے لگا ہے؟“

”کیا ہونے لگا ہے؟“

”گڑ بڑ۔ لمبی گڑ بڑ نظر آتی ہے۔ پہتہ ہے آج کیا ہوا؟“

”دیکھا ہوا؟“

ایک سو ایکہ نشان کی صورت میں گھر سے نکلا اور حیران ہوا یا مشہر العجائیں اتنی خلقت۔ اتنا آدم تھا اس شہر میں۔ سب ہی گھروں سے نکل پڑے ہیں۔ مگر کیوں۔ پوچھا کس سے جائے۔ ہر چیزہ ایک سو ایکہ نشان ہے۔ پر اشافی سے بہرا سو ایکہ نشان۔ جیسے ان پر کوئی بڑی مصیبت آن پڑی ہو۔ اپنے آپ سے پوچھتا ہوں۔ قصہ کیا ہے۔ کہیں بھروسہ ہی کچھ تو نہیں ہونے لگا ہے۔ شاید۔ پھر تو مجھے واپس گھر جانا چاہئے۔ ہماری عقیقی دیوار سے جیل کا دروازہ اور بچانسی کا تختہ دونوں صاف نظر آتے ہیں۔ مجھے یوں بھی گھر پہنچنا چاہئے کہ زبیدہ گھر میں اکیلی ہے۔ اس وقت تو بوجان موجود تھیں اور اس وقت تو زبیدہ نے بھی اسے تماشہ ہی جانا تھا۔ لیکن اب تو ویسے ہی اس کے اندر دہشت سمائی مہتی ہے اور بوجان بھی نہیں ہیں کہ دعا پڑھ کر جا رسمتوں میں منہ کر کے چار بچوں کیس ماریں اور شیاطین کو دفع کر دیں۔

”بہت زبردست دھماکہ تھا“

”دھماکہ۔ اچھا؟ کہاں کپے؟“

”پورا شہر مل گیا۔ کمال ہے آپ کو پڑھنہیں چلا۔ نیو پلازا کا تو ایسا نقشہ ہے جیسے بیماری ہوئی ہو۔“

”نیو پلازا۔ وہ تو بہت بخوبی عمارت تھی۔ بالکل یہ پروف نظر آئی تھی۔“

”بخوبی عمارتوں ہی کو تونشا نہ بنایا جاتا ہے۔ کچھ گھروں میں تباہ ہونے کے لئے ہوتا کیا ہے۔ اس عمارت کے تباہ ہونے سے کتنا کچھ تباہ ہو گیا۔ پورے مارکیٹ پر جھاڑو پھر گئی۔“

خیر نیو پلازا ہمارے گھر سے بہت فاصلے پر تھا۔ مگر بسا طیوں والا بازار بھی ہمارے گھر سے دور ہی تھا۔ وہ رات چراغِ حوالی میں ہماری آخری رات تھی۔ وہ پوری رات بوجان نے جانمانہ پر بیٹھ کر اور والد صاحب نے اپنی بھری بندوق کے سامنے چھت پر بیٹھ کر گزاری۔ بوجان گڑ گڑا کر دامن پھیلا کر دعا کرتی رہیں کہ یہ آخری رات خیریت سے گزر جائے کہ صبح کو تو پیشل میں بیٹھ کر رخصت ہو ہی جاتا ہے۔ ہماری گلی میں بالکل سنا ٹا تھا۔ لیکن دور کے محلوں سے شور و غل کی نعروں کی آوازیں دات بھرا آتی رہیں۔ وہ بسا طیوں والے بازار کی سمت تھی جس طرف سے شور و غل کی آوازیں زیادہ آرہی تھیں۔ اسی سمت میں آسمان بھی بہت سرخ ہو گیا تھا اور والد صاحب نے آسمان کی سرخی سے اندازہ لگایا کہ بسا طیوں والے بازار میں آگ لگی ہے اور جب فائر بریگیڈ کی آواز سنائی دی تو گویا ان کے شک کی توثیق ہو گئی۔ شہر میں ہر طرف سے شور و غل کی آوازیں آرہی تھیں۔ جابھی آسمان سرخ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ پورے شہر میں بس ایک چراغِ حوالی بچھی رہ گئی ہے اور بس ایک گلی خاموش ہے۔ اونگ، ہرنگ، سرینگ، اوونگ، بلونگ، بجزنگ، مم کلٹ، بسکٹ مم متود تھی۔

پورنی مم جنتا چورنی۔ دور نکل آتے کے بعد میں نے مرکر دیکھا۔ مگلی اسی طرح خاموش تھی۔ ہال گلتان محل کے اندر سے بیٹھوں کی سرائیمہ اواز میں سنائی دے رہی تھیں۔ اس سنائے میں بیٹھوں کی پریشان پکاد اور اس آکن بجھے دھیان آیا کہ ناند میں پانی نہیں بھرا گیا تھا۔ بیٹھنیں پیاسی ہیں۔ ایک اکیلی بیٹھنگلی میں بھٹک رہی تھی۔ گلتان محل کا پھاٹک تو مقفل تھا۔ یہ بیٹھنگلی کیسے باہر نکل آئی۔ مگر اس کا باہر نکل آنابے سود شایستہ ہوا۔ مگلی میں بھی کہیں پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔ قافلہ سے بچھڑی ہوئی پیاسی بیٹھنگلی کرنے والیں قافلہ میں جا سکتی تھیں نہ دور نکل سکتی تھی۔ اندر سے پیاسی بیٹھوں کی پکا آتی اور وہ اگے جاتے جاتے لھٹکتی اور منقار اسماں کی طرف بلند کر کے دردناک اواز میں جواب دیتا۔ کتنی دور تک کتنی دیر تک وہ پکار مرتتعاقب کرتی رہی، میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ قائم قائم قائم قائم قائم قائم۔ تب گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے پچھے پڑ کر دیکھا۔ ایک سوار باحال پریشان گھوڑے کو سر پٹ دوڑانا چلا آ رہا تھا۔ قریب اگر باگیں چھینیں۔ عزیز پیاسا ہوں۔ پانی کی طلب رکھتا ہوں؟ میں نے جواب میں اپنی پانی کی چھاگل کھوئی۔ کوزہ بھر کر اس تشنہ لب کو پیش کیا۔ سوار نے اتر کر گھوڑے کو درخت کے تنے سے باندھا۔ بیٹھ کر پانی پیا، خدا کا شکر ادا کیا۔

تب میں نے استفسار کیا کہ اے مرد مسافر، بیان کر کہ تو کس سمت سے آتا ہے اور کس سمت میں جاتا ہے۔

اس نے جواب میں آہ سرد بھری اور یوں گویا ہوا کہ اے عزیز، میں شہر تیرہ بخت اصفہان نصف جہان کی سمت سے آتا ہوں اور ادھر جاتا ہوں جدھر میراث مجھے لے جائے۔

میں نے تامل کیا۔ پھر دُستے ڈستے استفسار کیا کہ اے اصفہان نصف جہان

کی سمت سے آئے والے کچھ اصفہان نصف جہان کا احوال بیان کر۔
 یہ سن اس مرد اجنبی نے بھرآہ سرد بھری اور یوں گویا ہوا کہ ”اے اصفہان
 نصف جہان کا حال پوچھنے والے، میں اس باب میں عرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جب میں اس
 دیوار سے نکلا ہوں تو ابھی کھوپڑیوں کا مینار اور حورا تھا کہ اصفہان کی کچھ گردنوں پر ابھی سر
 باقی تھے اور ابھی سب گھروں میں خاموشی نے گھر نہیں کیا تھا کہ ہنوز کتنی حوصلیوں سے
 عورتوں کے بین اور بچوں کے بلکن کی آواز میں آرہی تھیں۔
 میں نے یہ سنا اور خبیط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ تامل کیا، پھر کتے دُکتے
 سوال کیا کہ ”اے اصفہان نصف جہان سے آئے والے کیا تیرا گز رجیت الائیض کی طرف
 سے بھی ہوا؟“

”وہاں ہوا۔ میں جب ادھر سے گزر ہوں تو وہ ایوانِ بلند و بالاشعلوں کی لپٹ
 میں بختا اور اندر سے صرف گھوروں کے ہتھیارے کی مضطرب آوازیں آرہی تھیں۔
 جیسے رسہ تڑا کر بھاگ نکلنے کے لئے ترڈ پہے ہوں۔“

تب میں نے گریہ کیا اور میں نے بکاکی، اللہمَّ إني أَسْأَلُكَ خَيْرَ سوال
 صب بے سود۔ گریہ دعا بکا کا فائدہ معلوم۔ میرے تین بڑے افسوس میں۔ پہلا افسوس
 گلستانِ محل کی پیاسی بیخون کے لئے کھداش چلتے وقت میں ان کی ناند میں پانی بھرا آتا۔
 دوسرا افسوس شاما چڑیا کے لئے جسے میں نے سدا مندرجہ پر چھکتے دیکھا، اے پکر ڈھنہیں
 سکا۔ تیسرا افسوس... خیر تیسرے افسوس کا اب کیا ذکر۔ اب وہ بستی نہ وہ دیانتہ
 وہ لوگ جانے اُن بالا قد گھوروں پر کیا گذری۔ وہاں تو اب یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ
 کھوپڑیوں کا مینار کہاں کھڑا کیا گیا تھا۔ قصرِ بیان کی فصیلیں کتنی خستہ ہو چکی تھیں۔
 کتنی کا ہی ان پر جم چکی تھی۔ کوئی ہے، کوئی ہے، کوئی ہے۔ میں پکارا کیا۔ کوئی جواب نہیں
 آیا۔ پیاسی بیخون پانی کی تلاش میں جانے کس طرف نکل گئیں۔ بس مندرجہ پر ایک کوَا

گُم سُم بیکھا تھا۔ اس کے ایک بازو کے صارے پر سفید ہو چکے تھے۔ اس نے کتنی اجنبی نظر وہ سمجھے دیکھا اور کتنی خاموشی سے اڑا گیا۔ تب میں نے افسوس کیا۔ میرا تیرا بڑا افسوس۔ میرا سب سے بڑا افسوس یہی ہے۔ اے جہاں اباد، اے گلستانِ محل، اب تیری اُجاءِ منڈروں پر بلیخنے والے کو لے بھی مجھے نہیں پہنچانتے۔ سو میں نے جانا کہ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ مگر خیر میں تو شاما سے شروع ہوتا ہوں۔ شاما اوشا سے۔ شیر میں کی بھی، اس نے اگر عین وقت پر گزرنا کی ہوتی تو شاما میری مشتعلی میں تھی۔ وہ ایک ساتھی کو پلک جھپکے آئی اور گذر گئی۔ میں اس چوک کو بھی نہیں بھیول سکا۔ ایک بڑا پچتاوا میری قسمت میں لکھا گیا۔ عمر اس حسرت میں گذری کہ وہ ساعت کاش پھر آئے۔

اس وقت میں یہی سمجھا تھا کہ وہ ساعت پھر آگئی ہے اور اب یہ ساعت میری مشتعلی میں ہے۔ زندگی میں آنے والی ساعت اسی طرح جل دیتی ہے۔ پستہ چلدا کہ ساعت ایک مرتبہ چٹکی سے نکل جائے تو دوبارہ درشن بھی دے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پچتاوے میں الہا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اے شہرِ خوبی، اتے دن گذر نے پر یہ بھید رنگھلا کر تو کون ہے، کہاں سے آئی ہے، نات کو جب وصل کی گھر یاں قریب آتی ہیں تو کس پر دے میں چلی جاتی ہے وہ ناز نہیں یہ سن، آگ بھی جھوکا ہوتی اور بولی کہ اے نادان کیا تنتے قول نہیں دیا تھا کہ تو کچھ نہیں پوچھے گا۔ بولا، قول دیا تھا۔ مگر اب ضبط کا یارا نہیں، پوچھے بننا چاہدہ نہیں۔ نادان یہ مرد پوچھ۔ پچتائے گا۔ پوچھوں گا۔ دیکھ مرد پوچھ۔ پچتائے گا۔ پوچھوں گا۔ تب وہ ماہِ روز میں میں لوٹی پوٹی اور کبوتری بن گئی پھر پھر لی اور اگئی۔ تب جیلانی یہ بیشافی بخت میں اس کے لکھی گئی۔ در بدر خاک بسر پھرتا تھا۔ اور پوچتا تھا کہ وہ شہرِ خوبی کس دلیں میں لبتی ہے۔ ایک مرد پیر نے اسے دیکھا اور افسوس سے کہا کہ کہننت تو نے جانتے کی کوشش کیوں کی تھی۔ کیا شربت دیدار تیرے لئے کافی نہیں تھا۔ اب وہ وہاں ہے جہاں پہنچا تیرے مقدور میں نہیں ہے۔ کوہ قاف

سے آگے کوہ قاف ہے۔ اس سے آگے پھر کوہ قاف ہے۔ وہاں وہ قلعہ بے در میں رہتی ہے۔ جہاں نہ آدم زاد پہنچ سکتا ہے۔ نہ پرندہ پر مار سکتا ہے۔ ہم کچھ نہیں جان پاتے۔ جانتے کی کوشش میں خراب ہوتے رہتے ہیں۔ خیران دونوں تو ہم دونوں ہی بخوبی کی جنت میں تھے۔ کسی بات کی خبر رہی نہیں تھی۔ جب اس کے میدان سے دوپہر دھلک کر نیچے گرا تھا تو مجھے اس ایک استعیاب ہوا تھا۔ وہ استعیاب ابھی تک برقرار ہے۔

استعیاب، استعیاب، استعیاب — از کجا می آیدا ایں آوازِ دوست — کہاں سے کیسے میں نے اسے دیکھا نہیں تھا۔ جب دیکھا تو میں نے کہا کہ یہ تو وہ نہیں ہے۔ جب جانا کہ وہی ہے تو بچرہ صورتِ دکھانی دی نہ آواز آئی۔ آواز آخر کہاں سے آتی تھی، ممندر کے ادھر سے یا پہاڑوں کے پیچے سے یا پامال سے وہ فقط آواز تھی۔ آواز میں اتنا سحر ہوتا ہے۔ میری زندگی میں خالی ایک آواز ہے، دور سے آتی ہوئی۔ ایک نرم شیریں آواز کہ دھمی ہوتے ہو تے کان کے قریب آتے آتے سرگوشی بن جاتی تھی۔ بلند آہنگِ رنجینِ مکالموں میں کیا کھا ہے۔ ایک سرگوشی بہت ہوتی ہے۔ بشرطیکہ ہاں بشرطیکہ..... کتنی دور سے ایک خشک چوب سے گزر کر وہ شیریں آواز آئی اور ایک سرگوشی بن گئی۔ اس سرگوشی میں کیا کچھ تھا۔ پورا ایک شہر آزاد۔ ایک حرفِ شیریں سے کائنات میں کتنا آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ گم ہو جائے تو بچرہ پوری کائنات ایک بہنگم شور ہے۔ زق زق بیق بیق پچھے رولا گولا غل غیارہ جمی محل بھوسا۔ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ خبر شہر میں جملکی کی آگ کی طرح پھیلی۔ جس نے سنا اس طرف دوڑ پڑا۔ لگتا تھا کہ پورا شہر وہاں ٹوٹ پڑا ہے۔ تباہی بھی تماشے کا ذائقہ رکھتی ہے۔ اتنے بڑے پہیاں نے پورا تباہی کا تماشہ دیکھنے کو کب نکلتا ہے۔ کھوپریوں کے مینارِ رفعت روز آؤ کھڑے نہیں ہوتے۔ ملبہ سے لا شیں بہادر کی حماری تھیں۔ کتنے جموں میں ابھی جان باقی تھی۔ سانس چل رہا تھا۔ کراہنے کی آوانیں سنائی دے رہی تھیں۔

آدمی بھی کتنی سخت جان مخلوق ہے۔ حیرت اور دہشت سے آنکھیں دیکھنے والوں کی پیٹی ہوئی تھیں۔ قیاس کے گھوڑے دوراً ہے جا رہے تھے۔ جتنا منہ اتنی باتیں۔ گھر میں داخل ہوا تو گویا سور کے بہان سے نکل کر خاموشی کے منطقہ میں داخل ہو گیا۔ حیران ہوا کہ باہر اتنا سور اندر اتنی خاموشی۔ کبھی یوں بھی تو ہوتا ہے کہ سارا ہنگامہ اندر ہوتا ہے۔ باہر نہیں۔ داخل ہوتے ہی میری نظر میں آج پہلے پچھوارے والی دیوار پر گئیں۔ نادائرہ اسی طرف ہو لیا۔ یوں ہی دیوار سے دوسری طرف جانکرنے لگا۔ آج پہلی مرتبہ میں نے اپنی اس دیوار سے پہلی طرف جہان کا تھا۔ کتنا تعجب ہوا۔ جیل کی لمبی پڑا سردار فسیل ہیاں سے صاف نظر آدھی تھی اور کتنی قریب محسوس ہوتی تھی۔ جیسے بس یہ رہی ذرا بال تھے بڑھاؤ اور چھولو۔ ویسے وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ دل میں کہا۔ زبیدہ ہیاں کیا دیکھ لیتی ہے۔

زبیدہ نے برا آمد سے نکل کر مجھے تعجب سے دیکھا۔ "ادھر کیا کر رہے ہو؟"
"پچھے نہیں۔" جیسے میں کوئی غلط یا فضول سی حرکت کرتے ہوئے پکڑا گیا ہوں،
خوارا ہی ادھر سے پلٹ پڑا۔

دونوں وقت مل رہے تھے۔ مولوی غلام رسول کے بتائے ہوئے وظیفہ کے مقابلہ بوجان کی تقلید میں زبیدہ نے چراغ جلا کیا اور دیوار کے پہلی طرف دیکھنے غیر مندرجہ پر رکھا اور چلی آئی۔

"لہو ایزہ۔ بچھو تو نہیں جائے گا۔" مجھے یوں ہی ایک تشویش سی ہوئی۔ حالانکہ میں بوجان کے وقت سے یہ وظیفہ دیکھتا چلا آرہا تھا اور مجھے کبھی اس کے جلنے بچنے کے باسے میں تردود نہیں ہوا تھا۔

میرے کہنے پر زبیدہ نے بہت تشویش سے چراغ کی کاپسی ہوئی لوگو دیکھا۔ پھر جیسے اپنے آپ کو دلا سر دے رہی ہو کہنے لگی۔ اس روز تو ہوا زیادہ تیر متحی۔ مگر

نہیں بجا تھا۔“

اس روز ہے میں اس روز ہوا واقعی نیادہ تیز تھی۔ چراغ کی لوگتی کانپ رہی تھی۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اتنی دھمکی ہو جاتی کہ بس اب بھی کہ اب بھی مگر جھونکا گذرنے کے بعد پھر تیز ہو جاتی۔ یہ اس روز کی بات ہے۔ جس روز بھانسی لگی ہے۔ اس روز بھی یہی صورت تھی۔ بہت شور تھا اور بہت سناٹا تھا۔ جہاں آباد ایک بڑے شور کی زد میں تھا۔ گلستان محل میں بھی نیک سب موجود تھے۔ سوائے بزرگوار مولوی میشاق علی کے۔ مگر گلستان محل بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ہاں نیچے نیچے میں کسی بیٹھ کی ہر اسال پکار سنائی دے جاتی تھی۔ جب بزرگوار مولوی میشاق علی گھر سے نکلے ہیں تو یہ بیٹھیں ان کے پیچے پیچے قائم کر کر ہوتی ڈیورڈھی نیک گئی تھیں۔ بعد میں دیر تک چلاتی رہیں۔ جیسے جانے والے کو پکارتی ہوں۔ مگر اب خاموش تھیں۔ بس اچانک کوئی بیٹھ اپنی گردن اٹھاتی اور ایک دُری سی قائم کر کے چپ ہو جاتی۔ اب دونوں وقت مل رہے ہے تھے اور بزرگوار مولوی میشاق علی کا مصلی خالی پڑا تھا۔ خالی مصلی کو دیکھ کر میری لکڑداری کی آنکھ بھرائی۔ بہت روئیں۔ کتنی دیر تک رہتی رہیں۔ اسی میں ان کی آنکھ لگ گئی۔ صبح کو انہوں نے بتایا کہ ۷۳ بی پچھلے پھر کو میری آنکھ کھل گئی۔ سامنے جو نظر کئی تو کیا دیکھوں ہوں کہ بھائی میشاق علی مصلی پیٹھے نسبع پھر رہے ہیں۔ سفید براق کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کیا تباول چہرے پر کیسا نور پرس دلہ تھا۔ تو اب صبح ہونہ ہی تھی اور میں تذبذب میں تھا کہ چراغ معمول کے مطابق شہر کے چراغوں کے ساتھ بجا ہے یا رات کے کسی پھر میں تیز ہوا کا کوئی جھونکا اسے بھاگیا۔

”زبیدہ“

”ہوں“

”وہ پر اپنی ڈیلر پسپر ملا تھا؟“

”اچھا؟“

”ہاں - وہاں جائے حادثہ پر ایک خلقت لوٹی ہوئی تھی۔ وہاں وہ بھی نظر آگیا۔ میں نے اس سے آنکھ بچانے کی بہت کوشش کی۔ مگر - خیر - عجب چیز ہے۔ جب ملتا ہے مجھے CONFUSE کر دیتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

”مگر تم تو فیصلہ نہ پکے ہوئے زبیدہ نے طنز مبصرے لہجہ میں کہا۔

”ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کامریڈ سے جب میں نے ذکر کیا تو اس نے کچھ اور ہی کہا۔ کامریڈ خود CONFUSED آدمی ہے۔ مجھے بھی CONFUSED کر دیتا ہے۔“

”بخت مارا کامریڈ۔ مجھے تو وہ زہروں برا لگتا ہے۔ اصل میں تو اسی کے لئے

پہ تم بیکے بتتے۔ اب وہ کیا کہتا ہے؟“

کامریڈ نے کیا کہا تھا۔ میں نے زبیدہ کو کچھ نہیں بتایا اور پریشان ہو جاتی۔ مگر میں نے سوچا کہ کامریڈ سے ایک مرتبہ کھل کر اس مسئلہ پر بات کر لی جائے۔ اس وقت تو اس نے رواروی میں ایک بات کہہ دیا تھی کیا وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ یہ شخص اس کی قبولیت تھی یا واقعی حالات۔ خیر۔ کامریڈ سے چل کر بات کرنی چاہئے۔ اس وقت تو اسے اپنے ٹھکانے ہی پر ہونا چاہئے۔ میں بس فوراً ہی نکل کھڑا ہوا۔ نقشہ باہر اور ہی دیکھا۔ خلقت کو سرسری سرہ دیکھا۔ سروں کا سمندر امند ہوا تھا۔ چاندنی چوک کی سمت میں بہتا تھا۔ میں حیران کہ یہ ما جرا کیا ہے، ہر فرد کیوں چاندنی چوک کی طرف دور ڈال جاتا ہے۔ اسے صاحبو۔ قفل دہن کو کھولو۔ منہ سے کچھ تو بولو۔ زبان کیوں سی۔ کھی ہے۔ حق پر تمہارے کس نے چھری رکھی ہے۔ معلوم تو ہو کہ اس نامبار کوچہ میں اب کونسا گل کھلا ہے۔ کونسا آسمان ٹوٹا ہے اور میں رویا کہ جہاں آیا تو تماشوں کا شہربن گیا۔ میرے پڑ دادا نے کہا کہ دنیا میں سب سے بڑھ کر

ظالم اور جاہل بادت مسلمہ نے جتنے ہیں۔ اس بزرگ نے ایسا کہا، پھر گریہ کیا، پھر گردگرد اکر دعا کی کہ اے غفوہ الرحیم تو اپنے جیسیت کے صدقے میں اس اُمرت کے گناہوں کو بخشن دے۔ شامتِ اعمال ماصورت نادر گرفت۔ ایک کوکھ سے آخر کتنے نادر شاہ پیدا ہوں گے۔ کامریڈ۔ کامریڈ۔ اے یار کامریڈ۔ دروازہ تو کھول۔ میں نے کتنا پکارا، کتنا کندھی کھٹکھٹائی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ پار کر میں نے کنوٹ جھڑ جھڑا لے۔ دروازہ دھاڑ سے کھل گیا۔ جھلسنگا چارپائی کے برابر بڑے سٹول پر اخباروں رسالوں کتابوں سے بھرا تھیں کھاتھا، مگر کامریڈ موجود نہیں تھا۔ میں حیران کہ کامریڈ کیا ہیں۔ میں اس کے سامنے ملکا نوں پر دیکھتا ہوا آرہا تھا۔ وہاں کہیں نہیں تھا۔ میں نہ لے کیا کہ اسے گھر پر ہونا چاہئے۔ مگر وہ یہاں پر بھی نہیں تھا۔ پھر کہاں گیا۔ میں دسویں میں پڑ گیا۔ دن بھی تو خراب تھے۔ ابھی تک پتہ نہیں چلا تھا کہ نیوپلائز کا حادثہ کس کی کارستانی تھی۔ کتنی گرفتاریاں ہو چکی تھیں۔ کہیں کامریڈ بھی۔ مگر میں نے فوراً ہی اس وہم کو رد کر دیا۔ ہاں ہو سکتا ہے کہ روپوش ہو گیا ہو۔ ایک دفعہ پہلے بھی ہو گیا تھا۔ مجھے تشویش بھی تھی اور میں جز بزر بھی تھا کہ آج جب میں واقعی سنجیدگی سے اس سے بات کرنا اور اس سے مشورہ لینا چاہتا تھا تو وہ غائب تھا میں مایوس ہو کر واپس ہونے لگا۔ میرے نکلنے سے پہلے ایک بذریغ بی میرے برابر سے نکلی اور تیزی سے میراہ ستر کاٹے ہوئے نظروں سے او جھبل ہو گئی۔

گرینٹ ہاؤس کی بلند و بالائی عمارت کے سامنے کیا قیامت بھی ہوئی تھی۔ لوگ بذواں کے عالم میں اندر سے نکل نکل کر باہر آ رہے تھے۔ بھاگ لہے تھے۔

”ہوا کیا؟“

”بم۔“
”کہاں ہے؟“

”پتہ نہیں۔ کسی نے فون کیا تھا؟“

نیو پلازا کے بعد سے کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا۔ مگر کسی وقت بھی کسی بھی دفتر میں کوئی نامعلوم فون موصول ہوتا۔ فوراً ہی بھگدڑ مجھتی۔ دم کے دم میں عمارت میں اتو بو لے لگتا۔

پر اپنی ڈیکر۔ یہ شخص یہاں کیا کر رہا ہے۔ میں نے اس بھگدڑ میں اسے بڑھ کر میں در بخل اطمینان سے گزرتے ہوئے دیکھا اور میں حیران ہوا کہ نیو پلازا میں جب واردات ہوئی تھی تو وہاں بھی اسی اطمینان سے گھوم پھر رہا تھا اور یہاں بھی اسی اطمینان سے چل پھر رہا ہے۔ میں حیران ہوا اور پھر پریشان ہوا کہ پھر مجھے آن دبو پے گا اور وہی پُرانا سوال دپڑائے گا کہ آشیانے کے بارے میں کیا سوچا ہے اور میں اور زیادہ تدبیب میں پڑھاؤں گا۔ ابھی تو مجھے کامریڈ سے مشورہ کرنا ہے۔ ابھی میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی چاہیے۔ میں وہاں سے تیزی سے نکل لیا۔ لیکن مجھے لگتا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے اور لیک جیک میرے پہنچے آ رہا ہے۔ میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی اور تیز مگر تھوڑی ہی دیر میں مجھے احساس ہوا کہ بہت سے لوگ میرے آگے میرے پہنچے مجھ سے بھی تیز حل سے ہے میں۔ ایسے بھی ہیں۔ جو بھاگ رہے۔ ان کے سانس بھولے ہوئے ہیں جو بھاگ رہے ہیں۔ ان کے سانس بھولے ہوئے ہیں۔ پھر وہ پر خوف کی تحریر لکھی ہوئی ہے۔ تب میں نے جانا کہ میرے ارڈگر دخوف کا ایک سمندر امنڈا ہوا ہے اور میں؟ مجھے اس خوف کے سمندر میں اپنے اوس ان برقرار رکھنے چاہیں۔ اسی آن بدنگ بلی میرے برابر سے تیزی سے گزری اور بھگدڑ میں کھو گئی۔ ارے یہ یہاں بھی آگئی۔ میں سخت متوضش ہوا۔ بدنگ بلی ہو یا بدنگ، سختی میں بدنگ مخلوقوں سے ڈرنے لگا تھا اور مجھے ایک دم سے خیال آیا کہ کہیں یہ وہ بلی تو نہیں ہے اور میں اپنے تیس خوف کا ایک سمندر بن گیا۔ تب میں نے وہیان کیا کہ میں اس بھگدڑ میں چھپس کر

کہاں کہاں مجھلکا بچر رہا ہوں۔ کب سے گھرنے نکلا ہوا ہوں۔ یہ غر وقت ہے اور زمانہ خراب ہے۔۔۔ اور چار دل طرف مجھگدر پڑی ہوئی ہے۔ میں ہوں کہ تنکے کی طرح رو میں بیہد رہا ہوں۔ مجھگدر میں آدمی بچپن جاتے تو اس کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔۔۔ نے بھاگنے کی گونہ اقامت کی جائے ہے۔۔۔ بس ایک ہی دائرے میں چکر کامٹتے رہو۔

جیسے مجھنوں میں تنکا۔ بچراں سے مدد مجھسڑ ہو جائے گی۔ وہی ایک سوال کہ گلستان محل کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ کس اطمینان سے سوال کرتا ہے اور کتنا مجھے بے اطمینان

کر دیتا ہے۔ اس مجھگدر میں ایک اسے دیکھا کہ اطمینان سے بچر رہا ہے۔ اور وہ بدرنگ بٹی وہ اس آشوب میں یہاں کیا کر رہی ہے۔ اموی دربار میں کیا کر رہی تھی۔۔۔

بھم جعل بھوسا۔ ایسے میں یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ کون کون ہے اور کون کیا کر رہا ہے۔

صورتیں پہچانی نہیں جاتیں یا یہ ہمارے عہد کا بھم جعل بھوسا ہے۔ میرے دادا کی سوچ واضح تھی اور قطعی چراغِ حوصلی نہیں بکے گی۔ بیشک بر باد ہو جائے۔ میں نے رشک کیا۔ اے کاش! میں مشاق علی ہوتا۔ تب میں نے مبا سفر کیا۔ چراغِ حوصلی اپنی روشن مندریوں نمیں برجیوں کے ساتھ اور گلستان محل اور قصرِ بیان اور سیت الابیض۔

پہتہ تو چلے کہ کون کہاں تھا اور میں غیر۔ اب ہم اپنے آپ سے شروع ہوتے یہاں اور اپنے آپ پر ختم ہو جاتے ہیں۔ بچر بھی اپنے آپ پر واضح نہیں ہو یاتے۔ مجھگدر، ذق ذق، لق لق تب میں نے دھیان کیا کہ میں کہاں سے چلا تھا کہاں نکل آیا۔ یہ غر وقت ہے اور زمانہ خراب ہے۔ دونوں وقت میں ہے تھے۔ جھپٹی میں صورتیں پہچانی نہیں جا رہی تھیں یا صورتیں بدل گئی تھیں۔ الی وے صورتیں کیا ہوں۔ یہ صورتیں کسی ہیں۔ صورتوں کو تکتا تھا اور حیران ہوتا تھا۔ پیشانی پر لنظر گئی۔ دیکھا کہ وہاں دار ہے۔ حیرانی سوا ہوئی۔ دوسری پیشانی، تیسری پیشانی۔ جو پیشانی دیکھی داعدار دیکھی۔ تب دل مبتلا تشویش ہوا۔ وسوں نے نرغہ کیا۔ سو میں پوری بستی

میں گھوم گیا۔ پیشانیوں کو دیکھتا چلا گیا۔ سب پیشانیاں داغدار ہو چکی تھیں۔ یہ دیکھے دل داغ ہوا۔ الہ بے حساب ہوا۔ پھر میں دسوسرہ میں پڑ گیا کہ کیا وہ آگیا ہے۔ مگر کوہ صفا۔ خیر کیا خبر ہے کہ وہ..... ہاں کیا خبر ہے۔ تب فقیر نے افسوس کیا۔ مگر میں افسوس کے ہنگام خیال آیا کہ نادان یہاں کیوں خراب ہوتا ہے۔ شتابی سے اس قریئے سے نکل چل۔ سو فقیر نے ہاں سے ڈیڑا اٹھایا اور نکل چلا۔

اس قریئے سے کس شتابی سے نکلا تھا۔ پر نکلتے نکلتے ایک دسوسرہ دل میں پڑ گیا کہ کیا میری پیشانی بھی جی میں سے نکل گیا۔ پھر اپنے تیس سنبھالا، دل کو دلا کر دیا کہ تو ان میں سے تھا ہی نہیں۔ دل کو قدر رے اطمینان ہوا۔ مگر پھر وہی دسوسرہ دل میں گزرا، برج مرچ کھینچتا، رنج سفر اٹھاتا کہاں کہاں پھرتا پھرا۔ سراغ اس خانہ برباد کو اس در کا نہ ملا۔ دل مبتلا ہے تشویش ہوا کہ وہ مسکن کہاں گم ہو گیا۔ وہ دد و بام وہ اوپنچی ڈیورڈھی، وہ منڈریں۔ دور کی آوازوں پر کان لگائے کہ شاید کسی سخت سے کسی پیاسی بلنگ کی آواز آجائے، یا کسی گھوڑے کے ہنپتائے کی، یا شیما چڑیا کے چھپائے کی اور یوں سخت کا اندازہ ہو جائے کوئی آواز نہ آئی۔ تب حیرانی سوا ہوتی۔ اور تشویش فزوں ہوتی کر کیا اس منڈری پر بھی اب کوئی پرندہ نہیں اُترتا۔ مگر آخر کیوں۔ کیا ڈیورڈھیوں کے ساتھ شاد آباد منڈریں بھی دیران بے آباد ہو جاتی ہیں۔ کیا ہو جاتا ہے کہ میکنیوں کے نکل جانے پر منڈریوں پر برا جنے چکنے والے پرندے بھی وہاں سے کوچ کر جاتے ہیں۔ پھر کوئی مردار پیل ہی وہاں آکر بیٹھے تو بیٹھے۔ مگر اس کے بیٹھنے سے تو دیرانی سوا ہوتی ہے۔ سو ہے سنتو پھر اس بیراگ نے ایک لمبی یا تراکی بنگر سے نکلا۔ بنوں میں بیٹھنے لگا۔ سب شور پھیپھے رہ گئے۔ نز جن بن اور مناٹا۔ رین اندر حیری، دور کنارہ، پورب گیا۔ پچھم گیا۔ پھر اتر، پھر دکھن چاروں کھونٹ کھونڈ ڈالے۔ اندر ہیکار ہی اندر ہیکار اور جل کی گرجتی دھار۔

ہے پر بھو، اجلا کہاں ہے۔ کنارہ کس اور ہے۔ یہی ایک چنان۔ یہی ایک دص۔ پر اجلا اور کنارہ جیسے الوب ہو گئے ہوں۔ دھرتی جل منڈل بنی ہوئی تھی جس اس تحان کو جا کے دیکھا داں پر جل نعل دکھائی دیا۔ پا ٹھٹھالا، دھرم شالا، کوشالا محل دو محلاء، سب ڈوب چکے ہتے۔ جنگل پر بت سب پانی میں سما گئے ہتے۔

جو چستو پنجی پچھر و سب الوب ہو گئے۔ پھر اور پر نچے دیکھا اور بھوچک رہ گیا کہ انہر کہاں گیا، دھرتی کس پامال میں سما گئی۔ برہماند کھاند کا گھلونا تحاکہ جل میں گلتا چلا جا رہا تھا۔ جی ڈوبنے لگا کہ یہ تو سب کچھ ڈوبا جا رہا ہے۔ یہی ہوتا ہے۔ پانی جب چڑھتا ہے تو سب کچھ بہا کرے جاتا ہے۔ تو کچھ بچے گا بھی یا نہیں۔

زراش کے اندر حیکار میں بھٹکتا پھرتا تھا کہ ایک ایک آشکی کو نیل بھوئی۔ دھیان میں ایک ہرا پھر اگھنا پیرا پھر اجس کی چھاؤں میں ٹھنڈی مہکتی چھاؤں میں۔ ہاں بالکل، اس کی ٹھنڈی مہکتی چھاؤں، ہی میں تو... ہاں بالکل انہیں پانیوں میں تھا۔ اسی ہی حل دھارا تھی۔ صارا کچھ ڈوب گیا تھا۔ پورا برہماند۔ پروہ ایک بکش پانیوں کے زیع کھڑا تھا۔ اس کا کھوج لیا جائے کہ کہاں کس اور اپہرا تا ہے۔ مار گندے رشی سے پوچھا جائے۔ پھر ایک لمبی کٹھنائیوں بھری یا نزا۔ پھر نرجن بن اور ایک بڑا سماں۔ نہ سادھو سنت، نہ رشی منی نہ پیر فیض۔ سعاد حیان۔ کھیان لکھئے سب ویان۔ کالے کوسوں کا سفر۔ بے فرنگ بے منزل۔ در بدر خاک لبر سنگ دل نہیں، بے اماں آسمان یا مظہر العیاش، صفا کی پہاڑی تو واقعی دو نیم ہو چکی ہے۔ کوئی پیشانی داعدار ہونے سے پچھی بھی کہ نہیں ماورہ چہرے۔ کیا سب ہی... اور یہ مروں کا سیداب۔ مگر چھتوں تلے اماں نہیں تو آسمان تلے کہاں اماں ملے گی۔ بھگدڑ، جنخ پکار، زق زق بق بق دانتا مکمل۔ جیسے کوئی بڑی آگ تباہ کر دی ہو۔ تو کیا حاملہ اُشنیوں کے جمل گرنے کا وقت آگیا ہے۔ پہاڑ سی رات اور بھرتا

سکندر کرف در دہن۔ لمبی کالی یا ترا کمی کہ کالی ہوتی چلی بخار ہی ہے اور وہ برکش کہاں
الوپ ہو گیا۔ یا ترا کتنی لمبی کھنخے گی۔ کالے پانیوں میں شتابدیاں ببلوں کے سماں بن
گئیں۔ کب تک ان کالے پانیوں میں چلیں گے۔ کب تک ان کالے پانیوں میں چلیں
گے۔ کب تک۔ اس لمبی کالی رات کا کوتی انت ہے کہ نہیں۔ اجالا اور کناہ کہیں جے
کہ نہیں! اور درخت؟؟... اَللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ - اَللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ - اَللَّهُمَّ
إِنِّي أَسْأَلُكَ